اسلام سائنس اور مسلمان

ابو علی عبدالوکیل

اسلام، سائنس اور مسلمان

علم وعرفان پبلشرز

34۔اردو بازار، لاہور فون: 7352332

مشتاق بک کارنر

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

کتاب گھر

کمیٹی چوک، راولپنڈی فون: 5552929

احمد بک کارپوریشن

کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی

رحمٰن بک ہاؤس

اُردو بازار، کراچی

خزینہ علم وادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 7314169

کتاب سرائے

الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی

کمیٹی چوک، راولپنڈی فون: 5531610

فضلی سنز

اردو بازار، کراچی

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

اسلام، سائنس اور مسلمان

تحقیق و ترتیب
ابو علی عبدالوکیل

علم و عرفان پبلشرز
34-اردو بازار، لاہور فون: 7352332

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب .... اسلام، سائنس اور مسلمان

تحقیق ترتیب .... ابو علی عبدالوکیل

ناشر .... گل فراز احمد

علم و عرفان پبلشرز، لاہور

مطبع .... جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور

سرورق .... محمد خرم عمر

کمپوزنگ .... سہیل ناظم/محمد حفیظ

سن اشاعت .... نومبر 2009ء

قیمت .... -/250 روپے

بہترین کتاب چھپوانے کے لیے رابطہ کریں۔ فون: 0300-9450911

استدعا

پروردگار عالم کے فضل، کرم اور مہربانی سے [illegible] اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری [illegible] کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی [illegible] ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔

(ناشر)

فہرست

''زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری''

ابو علی عبد الوکیل

دنیا کے مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کی افضل ترین مخلوق انسان ہے، لیکن وہ کیا چیز ہے جو انسان کو دیگر تخلیقات سے ممیز و منفرد بناتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، دیگر تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ کائنات میں انسان کے علاوہ جانور، پرندے، آبی مخلوقات، حشرات الارض اور کیڑے مکوڑے، پہاڑ، درخت، پانی، پتھر، آگ، ہوا، سورج، ستارے، یہی چیزیں ہوتی ہیں اب اگر ان کا جائزہ لیں تو کوئی صرف رنگ، کوئی حرکت، کوئی آواز، کوئی محض خوشبو کے لیے ہے۔ سوائے انسان کے کوئی مخلوق ایسی نہیں، جو وقت کے ساتھ کائنات میں اپنی ترقی اور کامیابی کی مثالیں قائم کر سکے۔

پہاڑ ہزاروں سالوں سے اپنی جگہ میخوں کی طرح منجمد، شہد کی مکھی اپنی تمام تر ہنر مندی کے باوجود صرف شہد ہی بنا سکتی ہے۔ کوئی دوسری ورائٹی تخلیق کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ یہ شرف صرف حضرت انسان ہی کو حاصل ہے کہ کائنات میں اپنی موجودگی کے پیغامات ارسال کرے، آبی مخلوق کی طرح سمندر کی تہہ تک رسائی حاصل کرے، انسان بغیر پروں کے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتا ہے، اپنے خیالات کاغذ پر رقم کر کے اپنی سوچ آنے والی نسلوں تک منتقل کر سکتا ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کائنات کی سب سے ذہین مخلوق انسان ہے۔ لیکن وہ کیا چیز ہے جس نے انسان کے ذہن کو اس قدر وسعت بخشی؟ وہ واحد خصوصیت انسان کے ذہن کا لامحدود ہونا اور الہامی مذاہب کا نزول ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالق کائنات نے اپنے راز اپنے پیغام رساں فرشتوں کے ذریعے اپنے مخصوص بندوں پر اس طرح کھول دیئے ہیں کہ انسان کی سوچ کی راہیں روشن ہو گئیں۔ تمام مذاہب کی بنیاد ایک تھی لیکن مخلوق کے لیے سچ سمجھنا آسان کام نہیں وہ جب اپنے [illegible] داپنی ہی تعمیر کردہ اشیاء پر نظر ڈالتی ہے تو سیدھے راستے سے بھٹک جاتی ہے، اسی لیے ہر پیغمبر [illegible] مردئیے [illegible] ور اس پر نازل ہونے والے کلام میں لوگوں نے اپنے الفاظ اور خیالات ٹھونسے

کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ آج سے چودہ سو سال پہلے خالق کائنات نے اپنا آخری پیغام نازل کیا اور اس پیغام کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لے لی، اللہ کی آخری کتاب "قرآن مجید" اپنی اصل حالت میں چودہ صدیوں سے محفوظ ہے اور رہتی دنیا تک اسی حالت میں رہے گی۔

کبھی ہم نے سوچا ہے کہ عصر حاضر میں سب سے زیادہ تیز رفتار دین کون سا ہے؟ کس مذہب کے پیروکاروں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ دیگر مذاہب سراسیمگی کا شکار ہو رہے ہیں؟ وہ کیا بات تھی کہ جس نے آج بیسویں صدی میں کنہیا لال گابا جیسے کامیاب سیاست دان اور بیرسٹر، مارماڈیوک پکتھال جیسے فلسفی، کائیس کلے جیسے باکسنگ کے عظیم کھلاڑی، لیوپولڈ ویس جیسے ماہر نفسیات، کیٹ سٹیونس جیسے گلوکار اور ماروریس بکائی جیسے سرجن کو اسلام کی طرف مائل کیا ہے؟ ان سب لوگوں نے ہمارے سامنے ایسے وقت اسلام قبول کیا، جب مادی دنیا کی ہر آسائش ان کے قدموں کے نیچے تھی اور اسلام قبول کرنا ان کے منصب اور مقام کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔

دین فطرت میں اگر کچھ اثر جذب نہیں
اس کی آغوش میں کیوں آئے ہزاروں پکتھال

ترکی میں غیر اسلامی قوتوں نے اسلام کے اس شاندار مرکز کو سیکولر بنانے اور اسلامی خلافت کی شناخت مٹانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، اسلام سے دور رکھنے کے لیے ترکی میں اذان، زبان، نماز، قرآن ہر چیز غیر عربی کر دی گئی، ستر برس میں تین نسلیں گزر گئیں، اسلام دشمنوں کا خیال تھا کہ مغرب میں اب بھی اللہ اکبر کی آواز نہ ابھر سکے گی لیکن سچ تو یہ ہے جو اللہ نے فرمایا۔

اور تدبیر کی ان کافروں نے اور تدبیر کی اللہ نے اور اللہ نے سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے (آل عمران)

فرانس اور جرمنی میں اسلام جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس نے اسلام دشمنوں کے لیے لمحہ فکر پیدا کر دیا ہے وسط ایشیا کی چھ مسلمان ریاستیں جنہیں روس ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کی آڑ میں نگل گیا تھا، اس کو ازخود اگلنا پڑیں، کیا یہ سب عصر حاضر میں اسلام کے معجزے نہیں، آج دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کے اعداد و شمار یہ واویلا کر رہے ہیں کہ اگر اسی رفتار سے اسلام وہاں پھیلتا رہا تو ۲۰۲۵ء تک اسلام کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ کر اسلام کو امریکہ کے دوسرے بڑے مذہب کے مقام لے آئے گی۔

مارگریٹ کینیڈی جرمنی کی ایک ماہر تعمیرات ہیں اور انہوں نے موجودہ دور کے مادی وسائل کا جائزہ لینے کے لیے بینکاری پر ایک کتاب تصنیف کی، ان کی کتاب کا نام (Intrest Free Banking) یعنی بلا سود بنکاری ہے۔ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک

کی بینکاری میں سود کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، لیکن جرمنی کی ایک خاتون ماہر تعمیرات اپنے مطالعہ اور سوچ کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچی کہ اگر اقتصادیات کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں غریب، غریب تر نہ ہو اور امیر، امیر نہ ہو تو اس کے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ وہ بینکاری میں سے سود کو نکال دے۔ مارگریٹ کینیڈی اس نتیجہ پر کس طرح پہنچی؟

بات کچھ یوں ہے کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی اقتصادی اعتبار سے کساد بازاری کا بدترین دور تھا۔ دو عالمی جنگوں کے درمیان یہ ایسا وقت تھا کہ جب جنگ نہ ہوتے ہوئے بھی جنگ کے سائے ہر طرف منڈلا رہے تھے، لوگوں نے صنعتکاری ترک کر دی تھی اور بنکوں میں رقوم جمع کروا کر سود پر گزارہ کر رہے تھے لیکن ہر شخص تو امیر نہیں ہوتا جب صنعتکاری نہ ہوگی تو لوگوں کو ملازمتیں کہاں سے ملیں گی؟ چنانچہ تمام یورپ بے روزگاری کی لپیٹ میں تھا۔ اس صورت حال کا تدارک کرنے کے لیے آسٹریلیا کے ایک گاؤں فوگل میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسے کرنسی نوٹ جاری کیے جائیں جو مہینے کی پہلی تاریخ کو جس کے ہاتھ میں ہوں وہ ان پر ایک فیصد کے حساب سے ٹکٹ چسپاں کرے گا یعنی اگر کسی کے پاس مہینے کی پہلی تاریخ کو سو روپے کا نوٹ ہے تو وہ اس پر ایک روپے کا ٹکٹ لگائے گا ورنہ نوٹ قبول نہیں کیا جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے کوئی بڑی رقم کسی کے پاس آتی وہ اسے آگے منتقل کرتا۔ آخر صورت حال یہ ہوئی کہ لوگوں نے اپنے بقایا جات ادا کیے، صنعتکاری شروع کی، ایڈوانس میں ٹیکس ادا کیے اور اس طرح آسٹریا کے گاؤں میں بیروزگاری حقیقتاً ختم ہوگئی۔

مارگریٹ کینیڈی کا خیال ہے کہ دنیا میں قیمتیں اسی شرح سے بڑھتی ہیں جس شرح سے بنک آپ کی بچت پر سود ادا کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے۔ بنک اس کو دس فیصد سود دیتا ہے یعنی ایک سال اس کی رقم ایک لاکھ دس ہزار ہو جاتی ہے تو وہ اسی صورت میں صنعتکاری میں حصہ لے گا کہ اسے دس فیصد سے زیادہ منافع ملے۔ مارگریٹ کا خیال ہے کہ اگر بنک اسے سود دینے کے بجائے اس کی رقم کی حفاظت کرنے کے سبب پانچ فیصد رقم سالانہ کاٹ لے تو وہ اپنی رقم بنک میں رکھنے کے بجائے صنعتکاری میں استعمال کرے گا۔ جب وہ صنعت لگائے گا تو اس سے روزگار پھیلے گا۔ اگر آپ کپڑے کی ایک فیکٹری لگائیں تو اس میں ملازمتیں شروع ہوں گی پھر ان لوگوں کو روزگار ملے گا...... جو کپڑا بیچیں گے، کپاس کی فصل اور کسانوں کو فائدہ ہوگا، ضمنی کاروبار چائے کی دکانیں اور مزدوروں کے لیے کینٹین اور ٹرکوں کے لیے ورکشاپس کام کرنا شروع کر دیں گی اور اس طرح خوشحالی کتنے لوگوں کے گھروں پہ دستک دے گی آپ کہیں گے کہ یہ تو مارگریٹ کینیڈی کی سوچ ہے اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے تو جان لیجیے کہ جس مقام پر ماہرین اقتصادیات آج پہنچے ہیں، اسلام چودہ سو سال پہلے کہتا ہے۔

''اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔'' (البقرہ ۲۔۲۷۵)

اگر چہ تجارت بھی رقم سے کی جاتی ہے لیکن تجارت کے لیے انسان کی محنت اور کئی افراد کا روزگار شامل ہوتا ہے جبکہ سود کے لیے صرف رقم درکار ہوتی ہے چنانچہ مارگریٹ کینیڈی کے خیال میں بنکوں کو بچت پر سالانہ سود دینے کے بجائے پانچ فیصد کٹوتی کرنی چاہیے۔ اسلام اس بارے میں کہتا ہے کہ سالانہ بچت پر ڈھائی فیصد زکوۃ غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔

لیو پولڈ ویس ۱۹۲۰ء کی دہائی میں جرمنی کے شہر برلن میں فلسفہ کا استاد تھا۔ برلن یونیورسٹی تک پہنچنے کے لیے وہ روزانہ ریل پر سوار ہو کر منزل مقصود تک پہنچتا۔ ریل کے سفر میں کوئی شخص اخبار پڑھ رہا ہوتا، کوئی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوتا، کوئی ویسے ہی اونگھ رہا ہوتا۔ لیکن پروفیسر لیو پولڈ ویس فلسفہ کا استاد تھا وہ کتاب یا اخبار کے بجائے لوگوں کے چہرے دیکھتا اور یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ مسافروں کے دلوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ایک روز اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ ٹرین پر سوار ملازمت پر جانے والے افراد خوشی اور سکون کے کسی جذبے سے خالی ہیں۔ اسے اس انکشاف پر حیرت بھی ہوئی۔ کیونکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں بے روزگاری، زوروں پر تھی اور بہت کم لوگ ایسی ملازمتیں حاصل کر سکتے تھے جس کے لیے وہ ٹرین پر سوار ہو کر اپنی منزل مقصود تک پہنچتے۔ پھر لیو پڈ نے اپنی سوچ کو مزید پھیلایا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ ہنستے بھی ہیں، مذاق بھی کرتے ہیں لیکن حقیقی خوشی کا کوئی تاثر ان کے چہرے سے نہیں ٹپکتا، حقیقی خوشی صرف بچوں کے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیو پڈ کو اپنے انکشاف پر خود بھی حیرت ہوئی۔ اس نے برلن یونیورسٹی کے اپنے ساتھیوں سے اپنی اس سوچ کا ذکر کیا کہ وہ لوگ جنہیں اچھی ملازمت حاصل ہو، معاشرے میں اعلیٰ مقام میسر ہو، وہ خوش کیوں نہیں، انہیں اور کیا درکار ہے؟

لیو پڈ کو اس سوال کا جواب کہیں سے نہیں ملا۔ ایک دن اس نے گھر پہنچ کر ایک کتاب کو جو قرآن پاک کا نسخہ تھا، کھولا تو جو صفحہ اس کے سامنے آیا اس پر سورہ التکاثر تحریر تھی۔

''غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔'' (التکاثر ۱۰۲: ۱۔۲)

یہ دو جملے پڑھتے ہی لیو پڈ کو اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ لیو پڈ جو یہ سوچتا تھا کہ وہ لوگ جن کے پاس ہر چیز موجود ہے اچھا روزگار، اچھا گھر، اچھا خاندان، وہ خوش کیوں نہیں۔ قرآن نے اسے بتایا کہ وہ خوش اس لیے نہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اس پر بہتات کی حرص یعنی مزید حاصل کرنے کی ہوس انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، یہاں تک کہ وہ اپنی [illegible] کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ کتاب عربوں پر کیسے نازل ہو سکتی تھی کیونکہ عرب میں تو بہتات کے مسائل اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور عرب کے غریب بدو تو بڑی مشکل سے اپنی گزر اوقات کر رہے تھے۔ قرآن کا مصنف تو بیسویں صدی کا کوئی یورپی شخص ہونا چاہیے تھا کیونکہ سورہ التکاثر نے بہتات کی حرص کے حوالے سے جس قسم کے مسائل کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ صرف بیسویں صدی میں یورپ میں رونما ہوئے تھے۔ جب لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ آسائشیں موجود تھیں اور مزید کی ہوس انہیں بے چین کیے رکھتی تھی۔ یوں سورہ التکاثر کی ان دو آیتوں نے ولیس پر وہ اثرات رونما کیے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ پورے قرآن پاک کو پڑھا، اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ احادیث کے مجموعے کا ترجمہ کیا، بہت سی کتب تصنیف کیں اور عالم اسلام میں علامہ محمد اسد کے نام سے معروف ہوا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دین اور سائنسی قوانین میں تضاد ہے دراصل یہ بیان عیسائیت کے پیروکاروں کا ہے تاکہ وہ انجیل کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کریں۔

چنانچہ اکثر عیسائی سائنس دانوں نے سولہویں اور سترھویں صدی تک جس نوعیت کی کلیسا کی دشمنی مول لے کر سائنس کے قوانین مرتب کیے، ان کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، گلیلیو تو اس مخاصمت میں مرتے مرتے بچا۔

جبکہ اس کے مقابلے میں قرآن کو ترجمہ کے ساتھ الفاتحہ سے الناس تک اس تواتر کے ساتھ پڑھو ٹھہر ٹھہر کر اور غور و فکر کے ساتھ، کوئی لفظ کوئی جملہ، کوئی حوالہ یہاں تک کہ کوئی شائبہ بھی ایسا نہیں ملتا، جو موجودہ دور کی سائنسی دریافتوں سے ٹکراتا ہو۔ چودہ برس پہلے جب سورہ بنی اسرائیل کی اولین آیت اتری تو کفار نے جب یہ سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جانے اور واپس آنے کا دعویٰ کیا ہے تو ان کے کلیجے شق ہو گئے۔ انہوں نے وہ تمام لوگ اکٹھے کیے جو مسجد اقصیٰ تک سفر کر چکے تھے اور انہوں نے رسول ﷺ برحق سے مسجد اقصیٰ کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ رسول ﷺ نے اس طرح ان کے سوالوں کے جواب دیئے گویا مسجد اقصیٰ اس وقت بھی ان کی نظروں کے سامنے ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہضم کرنا ان کی فہم سے بہت دور تھا کہ کوئی شخص راتوں رات ایسا سفر کر سکتا ہے۔ جو ان کی سرخ اونٹنیاں بھی تین ماہ سے کم عرصہ میں نہ کر پاتی تھیں۔ آج آئن سٹائن نے وقت اور SPACE کا وہ فارمولا دریافت کر دیا ہے کہ ایک دس سالہ بچہ بھی اس صورتحال کی وضاحت کر سکتا ہے۔ پیغمبر اسلام کا سفر معراج ایک بہت بڑی سائنسی حقیقت ہے۔

موریس بقائی فرانس کے صف اول کے سرجن اور سائنسدان تھے ان کی مہارت کا یہ

عالم تھا کہ انہیں حکومت مصر نے فرعونوں کے مردہ جسموں کے مطالعہ اور دیکھ بھال کے لیے مصر آنے کی دعوت دی۔ فرعونوں کے مردہ جسم دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان میں سے ایک فرعون کا جسم ایسا ہے جو پانی میں ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔ اس سے ڈاکٹر موریس بقائی اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ فرعون (Memepath) ہوگا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔

فرعون کا جسم تقریباً چار ہزار برس تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا اور یہ انکشاف چند عشرے قبل ہوا کہ Memepath کا مردہ جسم کون سا ہے اس سے پہلے یہ حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس دریافت کا اسلام کی حقانیت سے کیا تعلق تو اس کے لیے ہمیں سورہ یونس میں موسیٰ علیہ السلام کے فلسطین کی جانب خروج اور فرعون کا ان کا پیچھا کرنے کی روایت پڑھنا ہوگی جس کے مطابق موسیٰ علیہ السلام سمندر پار کرنے لگے تو سمندر کے دو حصے ہو گئے تھے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان حصوں کے درمیان سے گزر گئے جب فرعون وہاں سے گزرنے لگا تو سمندر کا پانی دوبارہ مل گیا اور وہ ڈوب گیا اور ایسا ڈوبا کہ اس کا جسم ۱۸۹۸ء تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا اور چند عشرے قبل تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ فرعون جو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا پیچھا کر رہا تھا اس کا جسم کون سا ہے اور وہ واقعی محفوظ ہے یا وقت کے ہاتھوں ضائع ہو چکا ہے۔ لیکن سورہ یونس میں ارشاد ہے:

> ”آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے جسم کو تا کہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی اور بے شک بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے۔“
> (یونس:۹۲)

یعنی چودہ سو برس قبل قرآن پاک فرعون کے ڈوبنے کا ذکر کرتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ ہم ضائع کرتے ہیں یا غرق کرتے ہیں تیرے جسم کو بلکہ یہ کہا کہ بچائے دیتے ہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا تھا کہ اگر فرعون کا جسم بچانے کا وعدہ کیا تھا تو وہ کہاں ہے۔ انجیل میں بھی فرعون کے ڈوبنے کا ذکر ہے مگر اس کے جسم کی حفاظت کا حوالہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی فرعون کے جسم کا کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔ تیرہ صدیوں تک مسلمانوں نے فرعون کے جسم کو جانے بغیر سورہ یونس کی اس آیت پر ایمان رکھا۔ یہاں تک کہ عصر حاضر میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی حقانیت تمام دنیا پر آشکار ہوئی۔ بات صرف غور و فکر کرنے کی ہے۔ اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دین میں غور و فکر کرو۔“

یہی وہ سائنسی حقائق ہیں جن کو دیکھ کر غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں مگر افسوس کہ آج ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جو نہ صرف قرآن و حدیث سے دور ہیں بلکہ دین اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بھی کوسوں دور ہیں صورتحال یہ ہے کہ

اگر آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ کو ایسے بہت سے مسلمان نظر آئیں گے جو لمبی لمبی ڈگریاں تو لے چکے ہیں لیکن اسلام ابجد سے بھی ناواقف ہیں اور ان کے مسلمان ہونے کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جس میں مسلمانوں والی کوئی بات نہیں ان لوگوں کے نزدیک نماز پڑھنی نہ آتی ہو کوئی بات نہیں، غسل کرنا نہ آتا ہو کوئی بات نہیں اگر کسی عزیز کا انتقال ہو جائے تو اسے غسل دینے سے قاصر ہیں اور کبھی تو نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اجرت پر غسل دینے والا ملنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عزیز یا والدین کی وفات کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت نہیں کر سکتے درحقیقت یہ لوگ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کے معنی و مفہوم سے نہ آشنا ہیں لیکن کوئی بات نہیں انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کوئی احساس نہیں انہی حالات کے پیش نظر علامہ اقبال نے یہ شعر کہا:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

آج غیر مسلم قرآنی حقائق سے آشنائی کے نتیجے میں مسلمان ہو رہے ہیں مگر مسلمان اپنے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں ڈارون کی تھیوری پڑھا کر قرآن کا انکاری بنا رہے ہیں۔ نیوٹن اور اوہم کے قوانین پڑھائے جاتے ہیں۔ ہمیں آئن سٹائن، نیوٹن، شیکسپیئر، اور ایڈیسن کی زندگیوں کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔

ہماری اسلامی و قومی تہذیب کو مغربی تہذیب سے کمتر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے اور مغرب کی ہر چیز کو، ہر ادا کو، طرز زندگی کو بہترین ثابت کر کے ہماری نوجوان نسل کو احساس کمتری کا شکار کیا جا رہا ہے اور یہ سب ہمارے نام نہاد اکابرین اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے کر رہے ہیں لیکن تمام جہانوں کا بادشاہ اپنے کلام میں اس امر کی تردید فرماتا ہے فرمان الٰہی ہے:

"آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کے تابع نہ ہو جائیں"

ہماری نوجوان نسل مسواک پہ ٹوتھ پیسٹ کو ترجیح دیتی ہے، آج کا نوجوان تھری پیس پہننا پسند کرتا ہے۔ ہمارے بچے کو حافظ قرآن و حدیث بنانے کی بجائے "بے بی بے بی یس ماما"

یاد کرایا جاتا ہے ہمارا نوجوان آدھی زندگی انگریزی سیکھنے اور آدھی زندگی شیکسپیئر اور انتھونی ہوپ پڑھ کر اپنا تلفظ ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری موجودہ نسل ایک ان دیکھے راستہ پر ایک ان دیکھی منزل کی طرف دوڑی چلی جارہی ہے اور امت کا درد رکھنے والے بھی ساری خرابیوں کی وجہ میکالے کے نظام تعلیم کو بتا کر اپنے فرض سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اگر میکالے نے ہمیں ایک خراب نظام تعلیم دیا تو ہم نے کونسا اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی ہمارے پاس ایک مکمل نظام حیات قرآن وحدیث کی صورت میں موجود ہے جس سے ہمیں زندگی کے ہر شعبہ میں مدد ملتی ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو پڑھنا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور اسی کمزوری کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور رسول اللہ (قیامت کے روز) فرمائیں گے الٰہی یقیناً میری امت نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا" (سورۃ الفرقان)

اس قرآن پر عمل نہ کرنا اس پر غور و فکر کرنا اس کے احکامات پر عمل نہ کرنا اس کو چھوڑ کر کسی اور کتاب کو ترجیح دینا ہجران ہے یعنی قرآن کا ترک کر دینا یا اس کو چھوڑ دینا ہے جس کے خلاف روز قیامت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں استغاثہ دائر فرمائیں گے کہ میری یہ امت ہے جس نے تیرے قرآن کو چھوڑ دیا تھا اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسلام جیسے نظام حیات کے ہوتے ہوئے ہم مغربی نظام سے بھیک مانگ رہے ہیں خود اللہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"اللہ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو بلندی عطا فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسروں کو ذلت و پستی میں دھکیل دیتا ہے۔"

(صحیح مسلم)

ہماری اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

یعنی قرآن میں وہ نظام حیات ہے جس کے ذریعے اللہ قوموں کو ذلت اور بلندیاں عطا کرتا ہے اور جب قوم قرآن سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے تو ذلت وخواری انکا مقدر بن جاتی ہے پھر زمانے کی کوئی طاقت انہیں ذلیل ورسوا ہونے سے نہیں بچا سکتی آج کا موجودہ دور اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آج مسلمانوں کے پاس تمام تر معدنیات، تیل کے بڑے بڑے ذخائر ہیں لیکن اس کے باوجود ذلیل ورسوا ہیں اس کی صرف وصرف ایک ہی وجہ ہے کہ ہم نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور فرقہ بندیوں میں پڑ گئے ہیں قرآنی دعوت تحقیق کو چھوڑ کر اور کفار کے ساتھ

جہاد کی بجائے آپس میں قتل عام کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ اور کسی دانا کا قول ہے کہ جو اپنوں سے لڑتے ہیں وہ غیروں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے ہماری اس کمزوری کی وجہ سے پوری دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اور ذلت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(اے اہل ایمان) جس حد تک ممکن ہو کافروں (کے مقابلہ) کے لیے
زیادہ سے زیادہ قوت (تیار اور) مہیا رکھو۔ (سورہ الانفال)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان یعنی مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اے ایمان والو کافروں کے مقابلے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت تیار رکھو لیکن اس آیت پر عمل کافر کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ قوت جمع کر رہے ہیں اور آپ دیکھیں کہ دنیا میں پانچ بڑی طاقتیں ہیں پانچوں ہی غیر مسلم۔ دراصل دنیا میں قومیں صرف طاقت کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں اسرائیل کی مثال آپ کے سامنے ہے وہاں ہر شخص کو فوجی ٹریننگ دی جاتی ہے اور وہ بے گناہ فلسطینیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا ہے۔ اور دنیا بھر کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمان ایک چھوٹے سے ملک اسرائیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہیں تیری آنکھوں نے قدرت کے اشارات

اب ہم ان لوگوں پر ایک نظر دوڑائیں جو اسلامی علوم سے واقفیت رکھتے ہیں ہمارے وطن عزیز پاکستان میں مدرسوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو پاکستان کے اسلامی ملک ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس پر فخر ہے لیکن انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان مدرسوں میں ایک مخصوص نصاب پڑھا کر یا رٹا کر فارغ کر دیا جاتا ہے اور اسے ہی مکمل علم سمجھ لیا جاتا ہے اور قرآن و حدیث کے علم کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث کا علم سیکھنا ہمارے لیے فخر و اعزاز کی بات ہے لیکن قرآن و حدیث کے علم کو محدود کر دینا درست نہیں ہمیں دیگر سائنسی علوم بھی سیکھنے چاہئیں جو کہ اسلام کے مطابق درست ہیں نہ کہ اسلام کے منافی ہیں۔ سائنس کے تجربات و مشاہدات غلط ہو سکتے ہیں اسلامی اصول نہیں اگر سائنسی تجربات اسلام کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ ہمارا فرض ہے کہ نئے تجربات کر کے دنیا پر ثابت کر دیں کہ اسلام ایک دین فطرت ہے۔

مثال کے طور پر ڈارون کی تھیوری کے مطابق انسان پہلے بندر تھا پھر کئی مراحل طے کر کے یہ موجودہ انسان کی شکل وجود میں آئی ہے۔ لیکن نئے سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان پہلے دن سے ہی اسی شکل میں تھا اس کے علاوہ بھی ایسے بہت سے تجربات ہیں جس کے بعد

سائنس دان یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اسلام ایک فطرتی مذہب ہے۔

آج ہمیں ایسے مدارس کی ضرورت ہے۔ جہاں کے فارغ التحصیل طالب علم نہ صرف عالم دین ہوں بلکہ ایک عظیم سائنسدان بھی ہوں جو اپنے تجربات سے ثابت کر دیں کہ اسلام ایک دین فطرت ہے اور ایک اٹل حقیقت بھی۔

آج جب حالات ایک عظیم انقلاب کا اشارہ دے رہے ہیں اور ہمیں قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھام کر کفار کا زندگی کے ہر محاذ پر مقابلہ کرنا ہے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے بنی نوع انسان کی راہنمائی کرنی ہے جس کا حکم ہمیں خالق کائنات کی طرف سے ملتا ہے ''تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں (کی اصلاح) کے لئے میدان میں لایا گیا ہے'' (القرآن)

زیر نظر کتاب ''اسلام، سائنس اور مسلمان، جہاں اسلام کی حقانیت کو واضح اور جدید ذہن کے شبہات کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوگی ان شاء اللہ۔ وہیں مسلمان اپنے ماضی کے آئینے میں جھانک کر اسلاف کے سائنسی کارناموں سے واقف ہوسکیں گے اور اس سے ایک ولولہ تازہ پاتے ہوئے اپنے حال و مستقبل کی بہتر منصوبہ بندی کر سکیں گے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مسلمانوں کی ذلت وخواری کی اصل وجہ قرآن وحدیث سے دوری ہے جو تمام علوم وفنون کا منبع و ماخذ ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن و حدیث پر عمل کرتے ہوئے سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں بھی آگے بڑھایا جائے اور اسلام کا پھر یہ ابر سولہرا دیا جائے۔ اللہ عمل کی توفیق دے (آمین)

ابوعلی عبدالوکیل
یکم فروری 2005ء
جمال دین بھک، بہاول نگر
فون 042-7314529

مذہب اور سائنس

ایم اے رحمٰن

موجودہ زمانے کو سائنس کا زمانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس صدی میں سائنس کے جو حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں ان سے حضرت انسان کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہیں۔ سائنس کی یہ ترقی ذہین اور زرخیز دماغوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ لوگ علم و دانش میں اپنی مثال آپ تھے لیکن شاید انہیں یہ علم نہیں تھا کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کی جانے والی یہ کوششیں ایک دن انسانیت کے لیے وبالِ جان بھی بن جائیں گی۔ یہ حقیقت کتنی تکلیف دہ ہے کہ سائنس انسانیت کے لیے موجب رحمت بننے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ہلاکت کا سامان بھی لے کر آئی ہے۔
نیوکلیر Nuclear سائنس کی بے پناہ ترقی انسانیت کے لیے ایک مہلک خطرہ بن چکی ہے ایٹمی توانائی (Atomic Energy) تعمیری کاموں کی بجائے زیادہ تر تخریبی سرگرمیوں میں استعمال ہورہی ہے۔ سائنسدان تجربہ گاہوں میں بیٹھے جہاں انسانی دکھوں کا مداوا تلاش کررہے ہیں وہاں وہ اسے اذیتناک موت سے دوچار کرنے کے سامان بھی تیار کررہے ہیں۔ سائنسدانوں نے زندگی کو جتنا حسین، سبک اور خوشگوار بنانے کی کوشش کی ہے وہ اتنی ہی پژمردہ اور مضمحل ہوتی چلی گئی ہے۔ جسم کے خدوخال یقیناً تیکھے اور دلکش نظر آنے لگے ہیں لیکن روح زخموں کی تاب نہ لاکر بلبلا اٹھی ہے۔ فاصلے سمٹتے اور دل دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ انسانی شخصیت کا شیرازہ بکھرتا چلا جارہا ہے۔ عقل کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر انسان خود سراغِ گم گشتہ بن گیا ہے۔
سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ہمارا مادہ پرستانہ نظریہ حیات ہے۔ مادہ پرستی نے انسان کو دولت تو بخش دی لیکن دولت کی یہ فراوانی روح کو آسودگی نہیں دے سکی۔ وہ مادیت کی دلدل میں پھنس کر روح کی آسودگی کو ترس رہا ہے اور اگر روح آسودہ نہ ہو تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی الجھنوں نے دماغ کو شل کرکے رکھ دیا ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اپنے ذہنوں میں فکری انتشار اور ذہنی پریشانیوں کے

اژدہے لیے ہوئے ہیں۔ ان اژدھوں کی پھنکاریں کاروبارِ حیات کو درہم برہم کیے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانی ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔

اگر ہم حقائق کی نظر سے دیکھیں تو ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانی روح جس خلفشار اور کرب میں مبتلا ہے اس کا مداوا سوائے مذہب کے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ مادیت پرستی خودغرضی کو جنم دیتی ہے اور یہی خودغرضی انسان کی موجودہ ذہنی کشمکش کا باعث ہے۔ فرانس کا ملحد فلسفی رینان (Renon) اپنی ایک کتاب "The history of religions" میں خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ مادیت ایک فریب اور دھوکہ کے سوا کچھ نہیں لہٰذا ہمیں لامحالہ مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مذہب ہی ایک ایسی فعال قوت ہے جو انسانیت کی ترقی اور فلاح کی علمبردار ہے۔ قرآن کریم میں ایسی بیشتر اقوام کا ذکر ملتا ہے جو تہذیب و تمدن میں اپنی مثال آپ تھیں لیکن جب بھی انہوں نے اپنی عقل کو لامحدود اور اپنی بصیرت کو بڑا جان کر مذہب کی مسلمہ اہمیت سے انکار کیا تو وہ فکر و نظر کی تاریکیوں میں بھٹک کر رہ گئیں۔ اگر ہم گزشتہ اقوام کے عروج و زوال کے فکری اسباب پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ہر تہذیب اور معاشرے کو اپنی ابتداء سے انتہا تک تین مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ابتدائی زمانہ، کمالِ عروج کا زمانہ اور اس کے بعد زوال، اپنے ابتدائی عروج کے زمانہ میں وہ تہذیب اس نظریے کی حامل رہی کہ یہ کائنات ایک ارادے اور ایک شعور کا کرشمہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک حکمت اور منصوبہ کام کر رہا ہے۔ یہ اپنے خالق اور اپنے الٰہ کے اقتدار میں جکڑی ہوئی ہے اور ارتقاء کا عمل ایک منظم طریق سے ہو رہا ہے۔ زندگی ایک شرارہ ہے جو اس کائنات کے رب اور الٰہ کی طرف سے جب مادے کو ودیعت کیا جاتا ہے تو اس میں ایسی صلاحیتیں ابھر آتی ہیں جو مادے کے اپنے خواص نہیں ہیں۔ انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان (Social Animal) نہیں ہے بلکہ اسے اخلاقی حس اور خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت عطا کر کے اسے اس کے خالق نے اپنی خلافت و نیابت کے لیے مامور کر دیا ہے۔ اب اس کا مقصدِ وجود رب کائنات اور رب الناس کی رضا کے مطابق زندگی کی تعمیر کرنا ہے اور یہ اس کے لیے پوری طرح ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔

اس نظریے کی رو سے وہ قوم مادے کی تسخیر اور اس کو انسانی صورتوں کے لیے استعمال کرنے کے طریقے دریافت کرتی ہے۔ وہ زندگی کی پوری وسعتوں سے آگاہ ہو کر ارتقائے حیات کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ قوم مذہب کو ایک عقیدے کی شکل دے دیتی ہے لیکن شاہراہ ارتقاء پر ایک موڑ ایسا آتا ہے، جب نہ صرف مذہب کو عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا

جاتا ہے بلکہ عقلی طور پر اس کی حقانیت بھی پہچانی جاتی ہے اور اس کے آخری سرچشمہ اور مصدر کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مذہب کی اس ترتیب وتشکیل میں کائنات کے نظم وضبط میں منطقی طور پر خدا کو ایک مخصوص درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ دور اس قوم کے کمال عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس دور میں ایمان وایقان کی بنیادوں پر تہذیب کی عمارت اور زیادہ پختہ اور مستحکم ہو جاتی ہے۔

کائنات کے نظم وضبط میں جب عقلی طور پر خدا کو ایک مخصوص درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو انسان اس کی حقیقت پانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے لیکن اس کے لیے بھی وہ عقلیت کا راستہ اختیار کرتا ہے حالانکہ حقیقت کو پانے کے لیے عقلیت کا راستہ کامیاب راستہ نہیں، مذہب ہی کا راستہ اس کے لیے موزوں ہے۔ عقلیت کا استعمال سائنس یا علم کے لیے کسی بہت بڑے خطرے کا باعث نہیں ہوتا۔ سائنس کا محل عقلیت کے فریب کی بنیاد پر بھی کھڑا رہ سکتا ہے مگر مذہب میں ایسا نہیں ہوسکتا لہٰذا یہیں سے اس قوم کا فکری اور ذہنی بگاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا زاویہ نگاہ بدلنے لگتا ہے۔ انسان اپنی عقل کو غیر محدود اور اپنے علم کو یقینی اور قطعی تصور کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں ابتدائی تصورات سے گریز کا رجحان شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنا ایک علیحدہ طرزِ زندگی (Code of life) تصنیف کر لیتی ہے۔ اس قوم کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ یہ نظریہ جڑ پکڑنے لگتا ہے کہ یہ کائنات اپنے پیچھے کوئی ارادہ، کوئی شعور، کوئی منصوبہ اور کوئی اقتدار نہیں رکھتی۔ یہ کائنات مادے کا ایک ظہور ہے اور اس میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک حادثے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یہاں زندگی بھی مادے کے ایک تقاضے کی حیثیت سے خود بخود نمودار ہوگئی ہے۔ اس زندگی نے جس طرح اور بہت سے پیکر اختیار کیے ہیں ایک پیکر وہ بھی اختیار کر لیا ہے جس کا نام انسان پایا۔ انسان کا مقصد زندگی اپنی خواہشات کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ایمان وایقان کی جگہ مجرد عقلیت پسندی اور الحاد کے اس نظریے پر کھڑی ہونے والی تہذیب دنیا کے لیے فساد کا باعث بن جاتی ہے اور قوم اخلاقی انحطاط کے راستے پر گامزن ہو جاتی ہے۔

آج کا موجودہ انسان بھی اپنے ملحد نظریات کی وجہ سے ایک مہلک ابتلا میں پھنسا ہوا ہے۔ موجودہ یورپ کا عام فرد عقلیت کے فریب میں گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے زندگی کی روحانیت سے واقف نہیں۔ اس کے خیالات کی دنیا میں ایک شدید کشمکش برپا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے نظریۂ ارتقاء نے اسلام کی دنیا میں جہاں رومی کے اس تخیل کو پیدا کیا کہ انسان کے لیے حیاتیاتی اور نفسیاتی لحاظ سے ایک بہت وسیع اور ہمیشہ بڑھنے والا مستقبل ہے جسے حاصل کرنے کے

لیے اسے جدوجہد کرنی چاہیے وہیں اسی نظریۂ ارتقاء نے یورپ میں یہ تخیل پیدا کیا کہ انسان کے لیے اس کی موجودہ حالت ہی سب کچھ ہے گویا ایک ہی نظریے نے اسلام کے مفکر کو مستقبل کے یقین اور اطمینان سے نواز کر رجائیت پسند بنا دیا اور یورپ کے مفکرین کو اس یقین سے محروم کر کے ان میں قنوطیت پیدا کی۔ چنانچہ یورپ کے مفکر نے جب زندگی کو مادے تک محدود سمجھ لیا اور اسی میں اٹک کر رہ گیا تو وہ خودغرضی، ہوس زر اور مادی فوائد جیسی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو گیا جنہوں نے اس کے دل میں زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے نفرت اور خود زندگی سے بیزاری پیدا کر دی۔

چونکہ ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کی گہرائیوں سے واقف نہیں تھا لہٰذا یورپ کے سائنسی فلسفے نے جس کی بنیاد سراسر مادہ پر مبنی ہے اور جس میں مذہب کے خلاف شدید نفرت موجود ہے، اسے خاص طور پر متاثر کیا لہٰذا اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ مذہب سے انسان کے قومی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل پوری طرح حل نہیں ہو سکتے اور یہ کہ مذہب ایک فرسودہ چیز ہے جو سائنسی اور انسانی ارتقاء کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے چنانچہ اس تصور کے طبعی نتیجے میں مادہ پرستوں کی طرف سے مذہب کے حامیوں کو بے عقلی، جمود، رجعت پسندی اور تنگ نظری کے طعنے پوری بے تکلفی اور تسلسل کے ساتھ عنایت کیے جاتے ہیں لیکن اگر مرعوبیت سے دامن بچا کر غور کیا جائے تو یہ تصور بجائے خود بے دانشی اور عقل دشمنی کا شاہکار ہے اس کے پیچھے کوئی ٹھوس اور سائنٹیفک استدلال نہیں بلکہ اس کا سارا زور و شور آدمی کی ان نفسانی خواہشات اور جسمانی داعیات کے ابال سے عبارت ہے جس پر کسی بھی قسم کی پابندی اور قید و بند اور ذمہ داری کا کوئی بوجھ آج کا وہ انسان (جسے انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے) پسند نہیں کرتا جسے مادہ پرستانہ افکار نے تمام اخلاقی و انسانی قدروں سے کاٹ دیا ہو۔ وہ گوناگوں عوامل کے تحت جس ظاہر پرستی کا غلام بن جاتا ہے وہی اسے اس بات پر اکساتی ہے کہ مذہب کو تردید و تحقیر کا نشانہ بنائے اور مذہب کے علمبرداروں کو عقل و تدبر سے محروم قرار دے کیونکہ مذہب اسے وہ لانہایت اور لامحدود آزادی عطا نہیں کرتا جس کے سایۂ عاطفت میں اس کے بھڑکے ہوئے جذبات، مچلتی ہوئی خواہشات اور بے کراں حرص و ہوس کو کھل کر کھیلنے کے مواقع میسر آ سکیں۔ بقول سید کرامت حسین جعفری "چاہے پرانے ادوار کا مطالعہ کیا جائے چاہے دورِ حاضر کا، جن معاشروں میں جب کبھی خدا کا اعتماد ختم ہو گیا ان میں نفسیاتی اور اخلاقی دونوں طرح کی خرابیاں زیادہ پھیلی ہیں۔ دوسری طرف آپ گہرائی میں جائیں تو یہ بھی دیکھیں گے کہ ہر وہ فرد جس پر غلط خواہشات کا دباؤ زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ لازماً انہیں پورا کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے راستے سے ضمیر کی رکاوٹ ہٹانے کے لیے خدا کا انکار کر دیتا ہے یا اس

کے تصور میں تحریف کر دیتا ہے۔ آپ اپنی زندگی میں ایسے جتنے لوگوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں ان سب کا تصور ذہن میں تازہ کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور معاشروں کا ہے۔ وہ جب اخلاقی لحاظ سے غلط راستوں کو پسند کر لیتی ہیں تو پھر ضمیر کی کشمکش سے نجات پا کر کھلی پیش قدمی کرنے کے لیے تصور خدا سے نجات حاصل کرتی ہیں۔ تمام ملحد اقوام اخلاقی بحران سے دوچار ہو کر رہتی ہیں۔ وہ یا تو کھلم کھلا الحاد کی علمبردار ہوتی ہیں یا خدا کا ایسا تصور اختیار کرتی ہیں جو ان کی من مانی زندگی میں خلل انداز ہونے والا نہ ہو۔"

اس ساری بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سائنس کی ملحدانہ ترقی انسانیت کے لیے فساد کا باعث بن جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مذہب اور سائنس کو پہلو بہ پہلو چلایا جائے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا ایسا مذہب ہے جو سائنس کے ہم پہلو ہو کر چل سکے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی تو اس قابل نہیں کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے۔ اگر کوئی مذہب ٹھہر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہی ہے۔ جیسا کہ پیچھے ذکر ہو چکا ہے کہ سائنسی نظریہ ارتقاء نے اسلام کے مفکر کو مستقبل کے دین اور اطمینان کے دولت سے مالا مال کر کے جہاں اسے رجائیت پسند بنایا وہیں یورپ کے مفکر کو اس دولت سے محروم کر کے قنوطیت پسند بنایا۔ لہٰذا ہم بلا جھجک یہ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی ایسی خوبی رکھتا ہے کہ یہ سائنس کے دوش بدوش چل کر کاروان انسانیت کو جادۂ ارتقاء پر آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے سائنس نے کائنات کے ایک بڑے حصے کو مسخر کر دیا ہے لیکن انسان اس تسخیر کائنات سے کیا کام لیتا ہے؟ اس کا تعین فکری ضابطے اور اخلاقی رویے کریں گے اور یہ ضابطے اور رویے سب سے بہتر صورت میں اسلام کے پاس ہیں۔

کائنات کی ساری ماڈرن تھیوریاں (Modern Theories) ایک نہایت ہی چھوٹے اور نہ دکھائی دینے والے ذرے پر مبنی ہیں جسے الیکٹرون (Electron) کہتے ہیں۔ الیکٹران کیا ہے؟ کوئی سائنسدان کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ چنانچہ ایک ذرہ بھر مفروضے پر تکیہ کر کے جس کی ہیئت نامعلوم ہے۔ سائنسدان کل کائنات کا سفر کر رہے ہیں۔ سائنس کی بنیاد عقل پر ہونے کے باوجود اگر سائنسدان ایسا کر سکتے ہیں تو کیا انسان ایک مفروضہ اپنی روح کے آرام، اپنی سائیکی (Psyche) کی بقا اور اپنے شعور کی جلا کے لیے نہیں کر سکتا جس کا آرام کلی طور پر انسان کی اپنی ذات ہی کو ہو؟ اور وہ مفروضہ کیا ہے؟ یہی کہ "خدا ہے" اگر انسان آج سے اس مفروضے پر زندگی بسر کرنا شروع کر دے تو اس کے لیے اس سے زیادہ اور کسی مفروضے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ عقل کا اندھا ہے۔ خدا کے وجود

سے انکار عقل کی بدولت نہیں ہو سکتا۔ ہم خدا کے وجود سے انکار اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم نے کائنات کا ایک ایک کونہ چھان لیا ہو اور ہمیں کہیں بھی خدا نظر نہ آیا ہو۔ اب دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ اور جو کرتا ہے عقل اس کے دعوے کو تسلیم نہیں کرے گی۔ بیسویں صدی کے سائنسدان جس قدر حقیقتوں کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں اسی قدر خدا کے وجود پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب الحاد ایک سائنسی حقیقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہر برٹ ہودر کہتا ہے۔

"جوں جوں سائنس میں ترقی ہوئی، ایک خاص گروہ زور پکڑتا گیا۔ اس فرقے میں دیرینہ فلسفی شامل ہیں جو کہتے ہیں خدا جیسی موہوم ہستی کا ادراک محال ہے۔ یہ لوگ ہر وقت بحث مباحثے میں مصروف رہتے ہیں کہ مذہب اور سائنس دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان کا سخت مقابلہ ہے جس میں فتح سائنس کی ہوگی۔ میں یہ ہرگز نہیں مانتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ مذہب نہ صرف فتح یاب ہو گا بلکہ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ فتح یاب ہو۔ دیکھا جائے تو تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ سائنس میں جو انکشافات ہوئے ہیں۔ ان سے ثابت ہو چکا ہے کہ فضا کے ستاروں سے لے کر ایٹم تک ساری کائنات چند اٹل قوانین کے زیر تسلط ہے اور ایک زبردست قوت موجود ہے جس نے یہ قانون بنائے ہیں۔ انسان کو جانوروں سے بلند کر کے اشرف المخلوقات کا رتبہ بخشا گیا۔ اس فرق کو نمایاں کرنے کے لیے انسان کو وہ اعلیٰ جوہر عطا ہوا ہے جس سے ضمیر، روحانیت اور تصورات پیدا ہوئے۔ ان ملکوتی جذبوں کے ہوتے ہوئے بھلا اس قادر مطلق کے وجود سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ جس کا لمس ہر جگہ محسوس ہو رہا ہے۔ جس کی کارکردگی کائنات کی ہر چیز سے عیاں ہے۔

یہ دہریے انسانی ترقی و بہبود کو مادیت سے ناپنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے اگر ٹھوس مادیت ہی سب کچھ ہے تو انسان کے دل میں ایمان اور روحانیت کے جذبے کس طرح آئے؟ بلند اخلاقی، صاف دلی اور نیک نیتی کی خواہش کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سب خوبیاں جن پر تعمیر و اصطلاح کی اساس رکھی گئی ہے۔ خود کہاں سے آگئیں۔

زندہ اور ترقی پذیر قومیں خدا پر اعتماد رکھتی ہیں۔ اس کی ہستی سے منکر ہونا اور ایمان کی کمی انحطاط پذیر قوموں کی نشانیاں ہیں۔"

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح سائنس ترقی کرتے ہوئے منزل بہ منزل مادی فطرت کی نقاب کشائی کرتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح مذہب بھی عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر سکتا ہے لیکن یہ عروج و ارتقاء سائنس کے عروج و ارتقاء سے یقیناً مختلف ہو

گا۔ سائنس جس حقیقت کی تلاش میں ہے اس حقیقت کو مذہب نے پا لیا ہے۔ اسلام نے علی الاعلان یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا کی ہستی ایک ہے اور وحدانیت کی جس طرح تشریح و توجیہہ ہے وہ ایسی جامع اور اکمل ہے کہ فلسفہ اور سائنس اس کا ابطال نہیں کر سکتے۔ ان دیکھے خدائے واحد کی ہستی جس کو اسلام پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد بنی نوع انسان کو طبیعی پابندیوں اور حیاتی کائنات سے آزادی بخشنا ہے۔ خدا کو تمام معیاروں کا غیر مرئی ماخذ قرار دینا حیات انسانی کو ارتقائی اور متحرک بنانا ہے۔ انسان اس وقت تک موجودات کا معیار کمال، اشرف المخلوقات نہیں ہو سکتا جب تک وہ موجودات کی حلقہ بگوشی سے چھٹکارا نہ پائے اور ان دیکھے نصب العین کی بلندیوں کی طرف عروج نہ کرے۔

مذہب اور سائنس کا ربط

محمد معاویہ حیدری

کسی بھی قوم اور معاشرے کے قیام و بقا کا راز مذہبی اقدار کے تحفظ، سماجی علوم کی تحصیل اور اخلاقی رویوں کی شائستگی میں پنہاں ہوتا ہے۔ معاشرے کی بقا کے لیے یہ چیزیں نہ صرف ضروری ہیں بلکہ معاشرے کی ہمہ جہت کاوشوں کا عین سبب بھی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کے دوام میں جن اجزاء کی کوشش کارفرما ہوتی ہے وہ اجزاء انہی جزئیات سے ترتیب پاتے ہیں گویا کہ ایک لحاظ سے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قوموں کا عروج و زوال اور معاشرتی انحطاط و تشخص انہی دو چیزوں پر منحصر ہے کوئی بھی قوم جب تک اپنے مذہبی اقدار کے لیے تن من دھن کی بازی لٹانے کے لیے تیار رہتی ہے کبھی نیستی کا شکار نہیں ہوتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ عروج و فراز کی انہی قوموں کا مقدر بنا کرتا ہے جو عین فطرتی ہوں جن کی ساکھ خالق حقیقی کی رضا جوئی سے وابستہ ہو مگر دنیوی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مذاہب باطلہ کے پیروکار بھی اپنا تشخص قائم رکھنے کے لیے انہی اصولوں کو اپناتے ہیں، جس کی بنا پر قوانین قدرت ان کی رہنمائی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اسی طرح جو معاشرہ سماجی علوم میں پختگی کے ساتھ ساتھ نظریات سے بھی وابستگی رکھتا ہے دوامی حیات کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ یہاں پر بھی حق و باطل کا امتیاز ضرور ہے، مگر دنیوی لحاظ سے یہ ایک حقیقی رنگوں سے مرصع تصویر کی عکاسی ہے۔ سماجیات اور مذہب دو ایسی شاخیں ہیں جو قوم و معاشرے کے شجر سایہ دار کو تادم زیست ہرا بھرا رکھتی ہیں۔ کوئی بھی جدید فلسفہ اور بے نام حقیقت کا طوفانی ریلا اسے نہیں اکھاڑ سکتا، بادخزاں کے مرغولے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ان دو چیزوں کے مقابلے میں عصر حاضر سائنس اور ٹیکنالوجی کو لا رہا ہے وقت حاضر کے نام نہاد دانشوروں نے مذہب اور سماجیات سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو یکسر علیحدہ کر دکھایا ہے جو کہ حقیقت میں لازم و ملزوم ہیں۔ نہ تو مذہب سائنس سے جدا ہے اور نہ ہی سماجی علوم ٹیکنالوجی سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں،

اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو وہ ہے ذہنی اور فکری وضع قطع کا۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ اور قوم خالق حقیقی کی طرف راغب رہے۔ اپنا ملی نظام شریعت کے وضع کردہ قوانین کے تحت مربوط کریں۔ سماجی علوم کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اخلاقیات کا فلسفہ اُجاگر ہو، باہمی اُلفت و مودت کا رشتہ استوار ہو اور حیا وعفت کا تشخص بحال رہے۔ اگر ایک نظر سے دیکھا جائے تو مذہب اور سماج کا تقاضا ایک ہے مگر دنیا کے دانشوروں نے ہی یک رنگی تقاضے کو محض دقیانوسی اور پرانی کہاوت کہہ کر جھٹلا دینے میں کوئی تامل نہیں کیا اور جدید وماڈریٹ خیالات کو نئے زاویہ سے ترتیب دے کر معاشرہ اور قوم کی اجتماعی رگوں میں سمو دیا ہے جو کہ سرکشی اور بغاوت کا ابتدائیہ تو ہو سکتا ہے مقصود منزل ہرگز نہیں۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ عصر حاضر میں سائنس وٹیکنالوجی، معاشرہ اور قوم کے عروج کا سیاق وسباق بن چکے ہیں۔ انسانی دریافتیں اور تیز ترین وقت کی گردشیں خواستگار بھی اسی بات کی ہیں کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اُمور تشکیل دیئے جانے چاہئیں اور جس پر عمل ہو رہا ہے کہ منٹوں سیکنڈوں میں پوری دنیا مٹھی میں قید ہو جاتی ہے۔ جہازوں کی اُڑان اور راکٹوں کی گھن گرج نے انسان کو واقعی کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، لیکن کیا ان آسائشوں کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی رخ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے؟ ٹیلی فون، فیکس اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہزاروں لاکھوں میل دور موجود دوست احباب سے بات کرنا اب سیکنڈوں کا کھیل ہے مگر کیا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ رشتہ داروں اور قریبی عزیزوں سے میل ملاپ ہی چھوڑ دیں؟ ہرگز نہیں...... مذہب سائنس کی راہ میں ہرگز رکاوٹ نہیں ہے، مذہب تو سائنس وٹیکنالوجی کو خوش آمدید کہتا ہے مگر اس صورت حال میں مذہب کا ایک تقاضا ضرور ہے اور وہ تقاضا یہ ہے کہ انسان ان ترقیوں میں کھو کر خالق حقیقی کو فراموش نہ کر دے، جدیدیت کو دیکھ کر عبادت نہ ترک کر دے، ہواؤں میں اُڑ کر انسانی چال نہ بھولے، چاند پر قدم جما کر انداز تفاخر اختیار نہ کرے، فنون کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بن کر محرومیوں اور افلاس سے دوچار زندگیوں کو فراموش نہ کرے۔ یہی مذہب کا تقاضا اور دین کی آواز ہے۔ اسی طرح سماجی علوم بھی ایک تقاضا رکھتے ہیں، وہ یہ کہ انسان معاشرے کے بگاڑ کو درست کرنے کے لیے اس میں اخلاقیات کا شجر سایہ دار لگائے۔ فلسفہ زندگی کو سمجھتے ہوئے شعور وآگہی عام کرے، قوموں کے قلوب واذہان کو باہمی محبت کا سبق دیتے ہوئے ''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز'' کا حقیقی مصداق بنائے۔ مگر یہ دونوں تقاضے عصر حاضر میں ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

یہ دونوں تقاضے مذہب اور سماجی علوم خوب پورے کر رہے ہیں لیکن اس کے برعکس

سائنس اور ٹیکنالوجی آرام و آرائش تو مہیا کر رہے ہیں مگر انسانیت کے طغرائے امتیاز سے دوری سے بھی انہی کی مرہون منت ہے، ترقی کی یہ دوڑ کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے جس کی بناء پر زندگی کی سائنس مہنگے اور موت کے سائے کوڑیوں کے مول بکنے لگے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں زندگیاں صاف پانی کی بوندوں کو ترس رہی ہیں، لاکھوں لوگ فٹ پاتھوں، ریلوے اسٹیشنوں، بس اسٹاپوں اور پارکوں میں کھلے آسمان تلے راتیں گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ سب اسی سائنس اور ٹیکنالوجی کا کرتا دھرتا ہے کیونکہ ان دو چیزوں نے آسائشیں تو بے حد مہیا کیں مگر انسان کو اکیلا کر دیا ہے اسے ایک روبوٹ بنا دیا ہے جو چل تو سکتا ہے، کام کاج کر سکتا ہے مگر احساس انسانیت سے محروم ہے۔

موجودہ معاشرے کا بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات بہت ہی واشگاف انداز میں ملتی ہے کہ پوری سوسائٹی مادیت پرست بن چکی ہے۔ رواداری، حسن سلوک، اخلاقی رویے باہمی الفت اور حیات انسانی کی قدر و منزلت معاشرہ سے بتدریج مٹتی چلی جا رہی ہے۔ جس کی بناء پر انسان نما حیوان کے خونی پنجے کمزور اور نہتے انسانوں پر ہمہ وقت حملہ کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ طاقت ور اور مضبوط اجسام کے مالک انسان موجودہ دور میں ان فٹ ہو چکے ہیں، پلاسٹک کے کھلونے کی طرح ہر وقت اسے بلانے اور چابی دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن پر ہم توجہ کرتے چلے جائیں تو سائنس و ٹیکنالوجی کی کاوشیں ہی نظر آئیں گی، مذہب اور سماجی علوم انہی سائنسی وضع کردہ پالیسوں کے مخالف ہیں، سائنسی قوت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی مقصد تخلیق کو بھول بھلیوں میں گم کر دیا جائے۔ جب ہم ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں تو تاریخ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ سابقہ ادوار میں بھی ایسی قومیں گزری ہیں جن پر ترقی کا بھوت سوار تھا، انہوں نے بھی اپنے اپنے عہد میں وہ کام کیا جس سے ترقی کی کوئی راہ نکلتی یا پھر نکلنے کی اُمید ہو سکتی تھی مگر وہ سب قومیں آہستہ آہستہ پردۂ ماضی کے پیچھے گم ہوتی چلی گئیں مگر ایک بات جس کی وضاحت کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس دور کے انسانوں میں انسانی قدریں بحال تھیں اور فکری نشو و نما کے لیے وہ قومیں قابل تقلید تھیں مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا فکری سانچے تبدیل ہوتے چلے گئے جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے۔

اگر ہم ماضی کی ڈور سے جڑی ہوئی اس تمام صورت حال کے اسباب و عوامل تلاش کرنا شروع کر دیں تو ہمارے سفر کا اختتام ایک ہی نکتہ پر ہوگا اور وہ نکتہ یہ ہے کہ آسائشوں کے حصول، سائنسی ترقی اور جدیدیت کے اس دور میں پڑ کر ہم نے مذہب اور سماجی علوم کو بالائے طاق رکھ دیا ہے جس کی بناء پر ہمیں یہ سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ آج ہم مخملیں بچھونوں پر سوتے ہیں مگر آنکھوں میں نیند نہیں ہے، ایئر کنڈیشنڈ میں محو استراحت ہوتے ہیں مگر پیشانیوں پر غم اور فکر کی لکیریں چھائی

رہتی ہیں، دولت میں کھیلتے ہیں مگر ہونٹ تبسم کی مسکان کو ترسے ہوئے ہیں، ہواؤں میں محو سفر ہوتے ہیں مگر احساس کمتری کا جالا ہمہ وقت ہمارے خدوخال پر چھایا رہتا ہے۔ بہتر سے بہتر لباس پہنتے ہیں، مگر دلی سکون اور اطمینان ڈھونڈنے سے نہیں ملتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مذہب کو سائنس کے ساتھ جوڑ کر نہیں رکھا حالانکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا راستہ ہمیں دیا ہی اسی مذہب نے ہے اور ہم نے اس مذہب کو بھی سائنس سے جدا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے آپ میں مگن ہے۔ بہتر سے بہتر کی تلاش میں ''موجود'' کو بھی گم کرتا چلا جا رہا ہے، مادی مشین کی طرح ہاتھ پیر چلا رہا ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں۔

افسوس تو اس مقام پر ہوتا ہے کہ مذہب کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے خود ہمارے اپنے ہی کا ہراول دستہ ہیں، دین اسلام کو سراسر دقیانوسی ثابت کرنے کے لیے خود اہلیان اسلام ہی کی کوششیں دخیل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم ہم مسلمان تو مذہبی اقدار کو فراموش نہ کریں، مادیت پرستانہ ماحول میں پڑ کر اپنا ملی تشخص تو نہ بھولیں، سائنسی دور کو اپنانا درست ہے مگر اس قدر بھی نہیں کہ مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لے اگر ہم نے اپنے معاشرتی اور قومی وقار کو بقا اور دوام کا لباس فاخرہ عطاء کرنا ہے تو مذہب اور سائنس کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ یہی کامیابی کی دلیل ہے۔

مذہب اور سائنس کا باہمی تعلق

سید عزیز الرحمٰن

انسانی زندگی کے کچھ خواص ہیں، اور ان خواص کے اعتبار سے کچھ لوازم بھی۔ انسانی زندگی کا مادی وجود جہاں اس سے بہت سی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح اس کا ایک روحانی وجود بھی ہے، جو اس سے 'مذہب' مانگتا ہے۔ انسان مادی اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس کا روحانی وجود اسے سکون قلب کی طلب پیدا کر کے، اسے اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ مادیت کی دوڑ میں انسان جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے، اتنی ہی اس کی روحانی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے، یہ پیاس مذہب کے وجود کی سب سے بڑی، سب سے وقیع، سب سے وزنی اور عالمگیر دلیل ہے!

سائنس دور جدید کے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ یہ بات بھی درست ہوگی کہ سائنس سے سائنسی ایجادات مراد لی جائیں، لیکن سائنس بذات خود ایک طرز فکر کا نام ہے، جو گذشتہ زمانے میں بدقسمتی سے، چند خارجی وجود کے سبب، اور ابتدائی سطح پر ملنے والی کامیابیوں سے حاصل ہونے والی خوشی کے زعم میں مذہب اور خدا کے وجود سے ٹکرا گئی تھی، لیکن اب ہر سطح پر اس کا احساس پیدا ہو چلا ہے کہ سائنس کا میدان اور ہے اور مذہب کے فرائض اور۔ سائنس کا مذہبی اُمور میں کوئی دخل نہیں ہے، البتہ مذہب کا سائنسی معلومات میں دخل ضرور ہے، جو کہ برس ہا برس کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دخل تعمیری اور مثبت نوعیت کا ہے، منفی اور تخریبی نہیں۔ لہٰذا دونوں میں ٹکراؤ اور تضاد کی کیفیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا جب دونوں کے مفادات مشترک ہوتے ہیں، اور جب دونوں کا میدان عمل ایک ہوتا۔ منطق کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کے مابین، عموم وخصوص مطلق، کی نسبت ہے، زیر نظر مضمون میں اسی حوالے سے اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں گفتگو کی گئی ہے، اور

مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ کیا مذہب سائنس کا مخالف ہے؟ یا اہل مذہب اور اہل سائنس میں حقیقتاً کسی ٹکراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے؟

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلقات کی اہمیت ر پس منظر:

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلق کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سوال کے دونوں ہی جز انسانی زندگی اور خصوصاً عصر حاضر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں، ایسی اہمیت جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دونوں ہی چیزیں، مذہب اور سائنس آج کے ہر انسان کے لیے ناگزیر ہیں، اور اگر کوئی اس حقیقت سے واقف نہیں یا کسی سبب سے اس بدیہی حقیقت کو قبول کرنے سے صرف نظر کرتا ہے، تو وہ خود اپنی زندگی کو نامکمل بنانے اور ناقص رکھنے کی سعی نامشکور کرتا ہے، خواہ اسے خود اس کا علم تک نہ ہو!

- سائنس اور مذہب کا یہ ٹکراؤ اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے، اور یہی وہ دور ہے جب جدید سائنس کا ظہور ہوا اور دنیا نے اسے کسی علم بلکہ مکتب فکر کے طور پر پہچانا۔ سائنسی دریافتوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے بڑی کشش تھی، پھر اس کا دارومدار مکمل طور پر مشاہدے اور تجربے پر تھا۔ یہ چیزیں انسانی شعور اور عقل کو براہ راست متاثر کرتی ہیں اور انسان ظاہر میں نظر آنے والی چیزوں کا اثر زیادہ تیزی سے اور شدت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی ہے عربی محاورے کل جدید لذیذ کے مطابق ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے۔ سائنس مذہب کے مقابلے میں ایک نئی چیز تھی، ان اسباب وعوامل کی بنا پر لوگوں کا اس کے اثرات تیزی سے قبول کرنا ایک فطری عمل تھا، مگر خرابی یہاں سے شروع ہوئی کہ سائنسی دریافتوں سے جو ماحول بنا، اس میں لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کی کوئی ضرورت نہیں رہی، اور مذہب ایک فرسودہ روایت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خدا کو ماننا اس لیے ضروری تھا کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی، اب جدید سائنس نے یہ عقدہ حل کر دیا ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں واقع ہونے والا ہر امر ایک سبب کی وجہ سے ہے، اور وہ سبب معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمیں بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سب کچھ قانون فطری Law of Nature کے لگے بندھے اُصولوں کے تحت وقوع پذیر ہو رہا ہے۔

دوسری جانب یوں ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں، جو وحی الٰہی پر مبنی تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ تغیر اور تحریف نے جگہ پکڑ لی اور یونانی فلسفے نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا،

اور رفتہ رفتہ فلسفیانہ مباحث مذہب کا جز بن کر تقدس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فلسفہ بہت سے زمینی حقائق اور معروضی حالات کے خلاف تھا، اور اس میں خیالی اور تصوراتی مفروضوں کی بہتات تھی۔ جب سائنس کی مشاہدے اور تجربات پر مشتمل دریافتیں اور انکشافات سامنے آنا شروع ہوئے تو مذہب کا حصہ بن جانے والے ان مفروضوں میں دراڑیں پڑنے لگیں، جس سے اہل مذہب (کلیسا) نے اپنے وجود کو خطرہ میں سمجھا، اور یوں اہل سائنس اور اہل مذہب (عیسائیت) کے مابین ایک کشمکش کا آغاز ہو گیا، جس کے نتیجے میں پوپ کے خاص حکم کے تحت احتساب عدالت قائم ہوئی، جس میں تقریباً تین لاکھ افراد کو حاضری دینا پڑی۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں، اور تقریباً ۳۰ ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزایافتگان میں گلیلیو اور برونو جیسے افراد بھی شامل تھے، یہ مذہب اور سائنس کی علیحدگی اور ان کے مابین چپقلش کا نقطہ عروج تھا، اور یہیں سے وہ جنگ شروع ہوئی، جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ بن گئی۔

جن باتوں نے مذہب (عیسائیت) اور سائنس کے مابین ان سنگین اختلافات کو جنم دیا، ان میں سے بات کو سمجھنے کے لیے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ارسطو نے مرکزیت زمین کا نقطہ نظر پیش کیا تھا، یہ خالصتاً یونانی فکر تھی جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر چونکہ یہ نظریہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مسیحی مذہب کا حصہ بن چکا تھا، اس لیے جب کوپرنیکس (۱۴۷۴ء تا ۱۵۴۳ء) نے مرکزیت آفتاب کا تصور پیش کیا تو عیسائی پیشواؤں کے ہاں کھلبلی سی مچ گئی، اور انہوں نے کوپرنیکس کی زبان بندی کر دی۔ کیونکہ یورپ میں اس وقت مسیحی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا، جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اس 'جنگ' اور محاذ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ مشاہداتی علم (سائنس) اور مذہب دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور ایک کی ترقی دوسرے کے لیے موت کا درجہ رکھتی ہے، حالانکہ یہ خیال واضح طور پر سراسر غلط تھا، اور اسلام کے نقطہ نظر کے صریح خلاف بھی، وہ تو یہ کہتا ہے کہ:

"بلاشبہ اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔"

مگر ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم (سائنس) لوگوں کو خدا اور مذہب سے دور کرنے والا بن گیا۔ سائنس اور مذہب کا یورپ میں ہونے والا یہ تصادم کوئی دو صدی تک جاری رہا، حتیٰ کہ ۱۸۵۹ء میں ڈارون نے اپنی کتاب Oringin of species شائع کی۔ چرچ کی جانب سے اس کی بھرپور مخالفت کی گئی، مگر اب چرچ کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی، اس لیے رفتہ رفتہ صلح کے امکانات پیدا ہونے لگے، اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا، جو دراصل سیکولرازم

(Secularism) کی صورت میں تھا، اب مذہب اور سائنس کے درمیان حدود کار متعین کر دی گئیں اور دونوں کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔

یوں کلیسا اور اہل سائنس کے مابین جاری جنگ کا خاتمہ ہو گیا، درحقیقت مذہب اور سائنس دونوں نے وہ راستہ اختیار کیا، جو فطرت کے سراسر خلاف تھا، اس لیے رفتہ رفتہ حالات سدھرنے کی بجائے مائل بہ انحطاط ہوتے چلے گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ مذہب اور خدا ہر اعتبار سے (بزعم خود، بزعم غلط) ان کی زندگیوں سے نکل گیا۔ لیکن یہ ایک غیر فطری رویہ تھا، نتیجتاً خدا پھر بھی موجود رہا، اور مذہب کی ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ آخر کمرے میں اپنے آپ کو بند کر کے، اور روشنی کی گزرگاہوں کو ختم کر کے، دن کے وقت میں انسان اپنے آپ کو رات ہو جانے کا تو غلط اطمینان دلا سکتا ہے، مگر سورج کی موجودگی کو تو ختم نہیں کر سکتا۔ یہ تھا سائنس اور مذہب کے اختلافات کا اصل پس منظر، اور جب ہم سائنس، مذہب تعلقات کی بات کرتے ہیں، تو اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

انکار مذہب کا سبب:

اب تک کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے وجود کا انکار قطعاً سائنس کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ مذہب اور مذہبی تعلیمات سے روگردانی اور ان سے لاعلمی کا نتیجہ ہے، لیکن آج کے دور میں انکار مذہب کا ایک اہم سبب اور بھی ہے، اور اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ سبب مغرب کے ہاں پھیلتا اور بڑھتا ہوا تصور آزادی ہے، جس کو ہم 'مادر پدر آزادی' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ آزادی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اب اس مقام انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ اب ان کو ہر اس معقول چیز سے بھی خوف آنے لگا ہے، جو ان کی اس خود ساختہ آزادی کو ذرا بھی قدغن لگاتی ہو۔ خدا اور مذہب کے انکار کے پیچھے بھی یہی تصور کارفرما ہے، یہی وہ بنیادی خوف ہے، جو انہیں انکار مذہب کے لایعنی فعل پر اُکسا رہا ہے۔ ایک امریکی ماہر طبیعیات جارج ہاربرٹ (George Hebert Blovnt) ان چند لوگوں میں سے ہیں، جنہیں اس امر کا اعتراف ہے، وہ کہتے ہیں:

> ''مذہب (خدا پرستی) کو ماننے کی معقولیت، اور خدا سے انکار کی غیر معقولیت بذات خود ایک آدمی کے لیے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خوف چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ اہل علم جو ذہنی آزادی کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، ان کے لیے اس آزادی میں کمی یا محدودیت کا کوئی

بھی تصور بڑا تشویشناک ہے۔''

کیونکہ اللہ کا پیغام کسی نہ کسی نبی ہی کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے، اور اس نبی کا پیغام تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی بات کو خدا کی بات تسلیم کیا جائے، اس لیے جب وہ کوئی بات کہے تو تمام لوگوں کیلئے اس کو تسلیم کرنا ضروری ہوگا، اور یہ بات ان لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتی، جو عقل کو بلکہ صرف اپنی ہی عقل کو سب کچھ تصور کر کے اس کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

سائنس اور مذہب، اختلاف عمل:

جب تک اس امر کی وضاحت نہ ہو جائے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان کس نوع کا اختلاف ہے؟ اس وقت تک ہمارا یہ دعویٰ صحیح صورت میں سامنے نہیں آ سکتا کہ سائنس اور مذہب کے مابین دراصل میدانوں کا فرق ہے۔ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں، اس لیے ان دونوں کی خدمت کو گڈمڈ نہیں کیا جا سکتا، اور جو خرابی بھی پیدا ہوئی ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم نے دونوں کے دائرہ کو باہم گڈمڈ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات واضح ہو جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ سائنس کو مانتے ہوئے، اس پر عمل کرتے ہوئے اور اس سے متمتع ہوتے ہوئے بھی مذہب کو خصوصاً مذہب اسلام کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور اس کے مطالبات پورے کیئے جا سکتے ہیں، دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے......!!

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ اختلاف اس وقت پیدا ہوا، جب اہل سائنس نے یہ جان لیا کہ دنیا کا نظام قانون فطرت پر چل رہا ہے، اور کائنات میں پیش آنے والے واقعات ایک متعین قانون فطرت کے مطابق رونما ہو رہے ہیں، اس لیے ان کی توجیہ کرنے کے لیے کسی نامعلوم اور غیر موجود خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرورت اس وقت تھی، جب تک ان واقعات کی توجیہہ ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ذرا سا غور وفکر کرنے والے پر بھی اس استدلال کی غیر معروضیت اور سطحیت واضح ہو سکتی ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ اس کائنات کے نظام کو برقرار اور مثبت طریقوں پر قائم رکھنے والی ایک اتھارٹی ناگزیر ہے، اور اس ذات کی ناگزیریت اب بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے، کیونکہ اب تک کی تگ و دو سے سائنس نے جو کچھ معلوم کیا ہے، وہ قانون فطرت کی صورت میں صرف اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ مگر مذہب جس سوال کا جواب دے رہا ہے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس طرح طے شدہ پروگرام اور پورے نظم وضبط کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ وقت اور مدت پر پیش آ رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے؟

مذہب ان واقعات کے اصل اسباب و محرکات پر گفتگو کرتا ہے، لہٰذا سائنس کی

دریافتوں کے باوجود مذہب کی ضرورت موجود و برقرار ہے، بلکہ اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب سائنسی توجیہات پر غور وفکر کرنے والا شخص ڈور کا اصل سرا نہیں پاتا، اور یوں اسے اپنی زندگی میں خلا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک امریکی ماہر حیات سی سیل بوائس ہمن (Cecilboyce Hamann) اس بارے میں کہتا ہے:

”غذا ہضم ہونے اور اس کے جز و بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدے میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اسکی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگی؟ آخر وہ کون سی طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزا کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں، غذا انسانی جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدے کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعے عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔“

درحقیقت سائنسی تگ و دو نے ہمیں واقعے کی صحیح تصویر تو دکھا دی ہے، مگر یہ واقعہ درست طور پر کیونکر پیش آتا ہے؟ اس تک سائنس رسائی حاصل نہیں کر سکتی، قوانین فطرت کیسے وجود پذیر ہوئے؟ ان کو درست نہج پر کس نے استوار کیا؟ اور پوری کائنات کا یہ ڈھانچہ جس سے یہ کائنات متمتع ہو رہی ہے، کس طرح اس قدر صحت و توازن کے ساتھ قائم ہے کہ اس کو دیکھ کر سائنسی قوانین اخذ وترتیب دیئے جارہے ہیں؟ ان سوالات کا جواب سائنس نہیں دے سکتی، اور اس لیے نہیں دے سکتی کہ یہ اس کے دائرہ اختیار میں ہی نہیں آتے، اس کے لیے مذہب کی جانب رجوع کرنا ہوگا، اور یہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کی تشنگی بجھا سکتا ہے۔

سائنس اور مذہب، مفاہمت کا طریقہ کار:

سائنس اور مذہب کے مابین مفاہمت کا درست اور قابل عمل طریقہ کار یہی ہے کہ اس ضمن میں پھیلی ہوئی غلط آرا، غلط خیالات و تصورات اور فضا کو پراگندہ کرنے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، خصوصاً اسلام کے حوالے سے یہ بات واضح کر دی جائے کہ سائنسی ایجادات اور اسلامی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور اگر کسی مقام پر ایسا نظر بھی آتا ہے،

تو وہ عارضی ہے، اور اسلامی تعلیمات کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ ہو سکنے کا نتیجہ ہے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کا نقص ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ "سائنس علت و معلول کی ہر کڑی میں غایت (Purpose) کو ضرور شامل کرے، اگر اس نے سلسلہ واقعات کی ہر کڑی میں غایت کو تسلیم کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا، اس کے ضابطہ اخلاق کو تسلیم کر لیا۔ یوم حساب کو تسلیم کر لیا، اور سائنس کی سرکشی نے خدا کے وجود کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ شرط کوئی نئی نہیں، نہ پہلی بار پیش کی گئی ہے، نہ سائنس اس سے نا آشنا ہے، بلکہ اس شرط کے ذریعے سائنس کو اس کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرایا جا رہا ہے اور اسے اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے جس پر وہ اس سے پہلے خود قائم تھی برٹرینڈ رسل کہتا ہے اور اسے اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے جس پر وہ اس سے پہلے خود قائم تھی۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے:

> "سائنس کے دائرہ کار میں یہ بات پہلے بھی شامل رہی ہے، لا مذہبیت اختیار کرنے سے پہلے تک سائنس واقعات کے ہر سلسلے کو مذہب کی طرح علت، معلول اور غایت پر منحصر سمجھا کرتی تھی۔"

پھر اہم بات یہ ہے کہ غایت کو اگر سائنس میں شامل کر لیا جائے تو مطالعہ سائنس میں زیادہ معنویت پیدا ہو سکتی ہے، ایک فاضل محقق کے بقول:

> "غایت کو سائنس میں شامل کر لینے سے ہر مضمون میں علت اور معلول کی حکمتوں تک انسان کی رسائی ہو سکے گی، اس کے بعد سائنس کا مطالعہ زیادہ بامعنی ہو جائے گا۔ اس کام میں مسلمان سائنس دانوں پر بہت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم اس اصول مفاہمت کی مذہبی سطح پر پہلے ہی سے قائل ہیں، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس اُصول کو سائنس کی آئیڈیالوجی بنائیں، اور اس آئیڈیالوجی سے عالمی سائنس کو روشناس کرائیں۔"

سائنس کی ایک اہم ضرورت:

یہ گفتگو اس اعتبار سے تھی کہ سائنس مذہب کا انکار کر کے جن خطرات سے دوچار ہو رہی ہے، ان سے بچنے کا محفوظ طریقہ مذہب کے زیر سایہ آ جانے کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن ایک اور پہلو سے بھی سائنس کو مذہب کی چھتری درکار ہے، سائنس نے انکشافات و اکتشافات کے میدان میں تو یقیناً بے حد ترقی کر لی ہے، مگر وہ اخلاقیات اور نفسیات

کے میدان میں بہت پیچھے ہے، ان میدانوں میں اس کے انحطاط پر یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ سائنس جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اخلاقیات کے میدان میں اس کا تنزل اور انحطاط اسی رفتار سے زیادہ ہو رہا ہے۔

ان حالات میں خصوصاً کسی ایسی رکاوٹ کی ضرورت ہوتی ہے، جو سائنس کو ان تنزلیوں کا شکار ہونے سے روک سکے، اور اسے ایک ایسا مربی درکار ہے، جو اسے بتا سکے کہ اسے کیا کرنا ہے، اور کن اُمور سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے؟ مختصر لفظوں میں یہ کہ اس کی حدود کار کیا ہیں؟ جدید سائنسی تحقیقات و ایجادات کے بعد اس کی ضرورت یوں بھی بڑھ گئی ہے کہ ان کے نتیجے میں ایسے عوامل سامنے آ رہے ہیں، جن کی موجودگی پوری انسانیت کے لیے خطرہ بن رہی ہے۔ ان کی مثال میں دو چیزیں: مہلک ایٹمی و جراثیمی ہتھیار اور سائنسی ایجادات سے متاثر ہونے والے عالمی ماحول کو پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے پوری دنیا میں موجود امن پسند اور درد دل رکھنے والے اصحاب فکر و نظر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اس خطرے کو بھی مذہب اور بالخصوص اسلام ہی ٹال سکتا ہے جو اس سمت میں بھی واضح اور دو ٹوک رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا سادہ اور واضح اصول یہ ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے لیے مفید ہیں، وہ اختیار کرنا ضروری ہیں اور جن سے انسانوں بلکہ کائنات کو کسی بھی قسم کے ضرر پہنچنے کا خدشہ ہو تو اس سے احتراز ضروری ہے، اور اگر اس سے فوائد بھی وابستہ ہوں تو ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے اس کی مضرت ختم ہو جائے...... یہ ہے اسلامی نقطہ نظر کا خلاصہ!

یہ صورت حال عرصے سے اہل علم کو مضطرب کئے ہوئے ہے اور اس کا احساس غیر مسلم مفکرین کو بھی ہے، اور غور و فکر کے بعد وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مشکل سے نکلنے کا واحد حل مذہب ہے۔

ریان ایپل یارڈ (Reyenale Yard) اپنی کتاب ''عصر کی تفہیم'' (Understanding the Present) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''سائنس کی کوئی اخلاقیات یا ایمان نہیں ہے اور وہ ہمیں ہماری حیات کے معنی، مقصد اور اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی، لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ سائنس کی فیضاتی کارکردگی ثابت کرتی ہے کہ وہ سب چیزیں مہیا کر سکتی ہے۔ لوگوں میں غلط خیال کو مستحکم کرنے میں سائنسی لٹریچر پیدا کرنے والوں کا بڑا ہاتھ ہے، جو عموماً ناقص، بلند آہنگ اور اکثر غلط ملط مقبول عام لٹریچر لکھتے رہتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کو واپس کھینچ کر ثقافت و تہذیب کے
دائرے میں لایا جائے، تاکہ اس کے بدترین استعمال اور بھیانک دعوؤں
کو لگام دی جاسکے۔"

ایک اور دانشور جو خود بھی فزکس کے پروفیسر ہیں، فرٹ جوف کیپر نے سائنس کے فروغ اور سائنسی رجحانات میں اضافے سے پیدا ہونے والی صورتحال پر تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہماری صدی، یعنی بیسویں صدی کے گذشتہ دو دہے کے آغاز میں ہم
اپنے آپ کو گھرے عالمگیر بحران کی حالت میں پاتے ہیں، یہ مختلف
الجہات بحرانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے اثرات ہماری زندگی کے تمام
پہلوؤں یعنی صحت اور سامان زندگی، ماحول کی کیفیت، سماجی تعلقات،
معیشت، صنعت اور سیاست کو چھوتے ہیں۔ یہ بحران، ذہنی، اخلاقی اور
روحانی سمت کا ہے۔ یہ بحران ہے میزان اور ضرورت کا، جس کی کوئی نظیر
انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، پہلی مرتبہ ہمیں نسل انسانی اور اس کے کرۂ ارض
کے تمام جانداروں کو ہلاکت کی حقیقی دھمکی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

آگے چل کر کیپر، نیوٹن کے نظریۂ حرکت کے طبیعیاتی دنیا میں انقلابی اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مطلق عالمگیر مشین کی اس تصویر میں ایک خارجی خالق مضمر ہے، یعنی
ایک شہنشاہ خدا، جس نے دنیا میں اپنے آسمانی قوانین کے نفاذ کے
ذریعے حکومت کی ہے، طبیعیاتی مظاہر کو کسی بھی معنی میں بجائے خود آسمانی
نہیں سمجھا گیا، اور سائنس نے ایسے کسی خدا پر یقین کو زیادہ سے زیادہ
مشکل بنا دیا اور تقدس سائنس کے عالمی نظریے سے مکمل طور پر غائب
ہوگیا، جس کے نتیجے میں روحانی خلا پیدا ہوا، جو ہمارے تہذیبی دھارے
کی خصوصیت بن گیا ہے۔"

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دو وجوہ کی بنا پر، جن میں پہلی وجہ سائنس کے فروغ سے روحانی دنیا میں پیدا ہونے والا خلا ہے، اور دوسری وجہ اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی بحران ہے، سائنس کے لیے مذہب کو قبول کرنا ضروری ہوگیا ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ اسلام سائنس کو نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ وہ خود تجربے اور مشاہدے نیز غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، البتہ اس کا مدعا اس سے یہ ہوتا ہے کہ انسان اس تدبیر اور

غور وفکر کے ذریعے اس کائنات کے رب تک پہنچ سکے، اور پھر بعد کے اقدام کے طور پر وہ اس کے احکامات کی بھی بجا آوری کر سکے، یہی انسانیت کی معراج ہے اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے!!

قرآن اور سائنس

قرآن حکیم کتاب حکمت اور صحیفہ ہدایت ہے۔ اس کے پیش نظر انسانیت کی رہنمائی ہے تاکہ شاہراہ زیست پر سفر کرتے ہوئے اسے کسی قسم کی دقت اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کا یہ بھی اعجاز ہے کہ اس میں دیگر علوم وفنون کی جانب بھی رہنمائی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے شواہد موجود ہیں، ابوبکر ابن العربی کے بقول:

> ”قرآن حکیم ستتر ہزار چار سو پچاس علوم پر مشتمل ہے۔ یہ عدد قرآنی کلمات کو چار سے ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے ہر کلمے کی چار حالتیں ہیں: ایک اس کا ظاہر و باطن ہے، اور ایک حد و مطلع۔ یہ اس صورت میں ہے جب قرآن کے کلمات کو انفرادی اعتبار سے ترکیب کے بغیر دیکھا جائے، اگر کتاب کی تراکیب وغیرہ پر غور وفکر کیا جائے تو اس کی (حالتوں اور اسی اعتبار سے اس کے علوم وفنون) کی تعداد شمار وحساب سے باہر ہو جاتی ہے۔“

ابن العربی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ

> ”کتاب خداوندی ہر چیز کی جامع ہے، کوئی علم اور مسئلہ ایسا نہیں جس کی اصل واساس قرآن کریم میں موجود نہ ہو، قرآن میں عجائب المخلوقات، آسمان وزمین کی سلطنت اور عالم علوی وسفلی سے متعلق ہر شے کی تفصیلات موجود ہیں، جن کی شرح وتفصیل کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں۔“

اسی اعتبار سے قرآن حکیم میں سائنسی علوم کی جانب بھی راہنمائی ملی ہے، اگرچہ یہ چیز قرآنی نقطہ نظر سے مطلوب اول نہیں ہے۔ ذیل میں ایسی چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

ا۔ قرآن حکیم انسان کے جنین کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ”اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے (جوہر) سے بنایا، پھر ہم ہی نے اس کی حفاظت کی جگہ (رحم مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم ہی نے اس لوتھڑے سے گوشت کی بوٹی بنائی، پھر ہم ہی نے اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم ہی نے ان ہڈیوں پر

گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو ایک نئی صورت میں (انسان بنا کر) اٹھا کھڑا کیا تو اللہ بڑا ہی برکت والا، سب سے بہتر بنانے والا ہے۔"

۲۔ قرآن حکیم میں پہاڑوں کو 'میخیں' کہا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کیا ہم نے تمہارے لیے زمین کو فرش، اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟"

۳۔ سمندر یا دریا کے دو مختلف الاقسام پانیوں کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا:

"اور (اللہ) وہی ہے، جس نے دو دوریاؤں کو چلایا، ایک میٹھا پیاس بجھانے والا، اور ایک کھارا کڑوا، اور دونوں کے درمیان ایک رکاوٹ اور آڑ بنادی۔"

۴۔ بادلوں اور اولوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر وہ ان کو ملا دیتا ہے، پھر وہ ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے مینہ برستا ہے، وہی اللہ آسمان میں پہاڑ جیسے بادلوں میں سے اولے برساتا ہے، پھر جس پر چاہتا ہے ان (اولوں) کو گرا دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک ایسی ہے کہ گویا آنکھوں کی بینائی لے جائے۔"

۵۔ انسانی جلد کی حسی کیفیات اور حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے:

"بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم بہت جلد ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی، تو ہم ان کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب چکھیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔"

قرآن حکیم کی ان کئی سو آیات میں سے، جن میں سائنسی حقائق کی جانب اشارہ موجود ہے، یہاں صرف چند آیات نقل کی گئیں، تاکہ یہ امر واضح ہو سکے کہ اسلام اور سائنس باہم متعارض حقیقتوں کے نام نہیں، بلکہ جدید سائنس خود اسلام اور اسلامی تعلیمات کا اثبات کر رہی ہے، اور ایسے کتنے ہی مسائل ہیں، جن کے بارے میں جب اسلام نے حکم دیا تھا تو لوگوں کے سامنے اس کی علت اور سبب کچھ نہیں تھا، مگر لوگ امر تعبدی قرار دے کر اسے بجالاتے تھے، لیکن آج ان کے حقائق سامنے آچکے ہیں، اور یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ ان احکامات میں بھی ہماری ہی فلاح اور بہبود مضمر تھی۔

'سائنس' قرآن کا اثبات کرتی ہے!

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ سائنس کے جدید انکشافات نے اسلام کے بیان کردہ اصولوں کا اثبات اور ان کی تائید کی ہے، اس لیے اسلام کو سائنس کی جانب سے کوئی چیلنج درپیش نہیں ہے، بلکہ جب مذہب اور سائنس کا باہم ٹکراؤ شروع ہوا، جس کا سرسری سا تذکرہ ان سطور کے آغاز میں گزر چکا ہے، تب بھی چونکہ وہ مسئلہ عیسائیت کی محرف روایات کا تھا، نہ کہ اسلام کا اس لیے مسلمان اس وقت بھی کسی ذہنی الجھن کا شکار نہیں ہوئے، اور جب مرکزیت آفتاب کا نقطہ نظر سامنے آیا، تو مسلم سائنس دانوں نے اسے زیادہ معقول اور مدلل پا کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا، پروفیسر ایڈورڈ میک برنس لکھتے ہیں:

> ''مسلمان ماہرین فلکیات و ریاضیات، طبعیات، کیمیا، اور طب میں نہایت باکمال عالم تھے، ارسطو کے احترام کے باوجود انہوں نے اس میں ذرا تامل نہیں کیا کہ وہ اس کے اس نظریے پر تنقید کریں کہ زمین مرکز ہے، اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے بلکہ انہوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔''

ذیل میں ہم چند سائنسی مظاہر اور نئی معلومات پیش کرتے ہیں جو قرآن حکیم کی تائید کر رہی ہے، یہ ان ہی آیات کے بارے میں ہیں، جن کا ذکر ہم ابھی ما قبل کر آئے ہیں۔

(i) قرآن حکیم اور انسانی جنین کا ارتقاء:

قرآن حکیم میں انسانی جنین کے بارے میں کئی ایک مقامات پر تفصیل سے معلومات دی گئی ہیں۔ یہ وہ معلومات ہیں جو ۱۴۰۰ سو سال سے پڑھی جا رہی ہیں، مگر اس صدی میں جا کر سائنس نے بھی اس امر کی تائید کر دی ہے کہ یہ معلومات نہ صرف حرف بہ حرف درست ہیں، بلکہ چونکہ یہ معلومات اس وقت پیش کی گئی ہیں، جب یہ باتیں کسی کے علم میں نہیں تھیں، اس لیے قرآن حکیم اور اسلام کے آسمانی مذہب ہونے اور مبنی برحق ہونے کی بین دلیل بھی ہیں، قرآن حکیم کی ایک آیت اس سے قبل (آیت نمبر۱) پیش کی جا چکی ہے۔ جس میں تفصیل کے ساتھ انسانی جنین کی تشکیل کے مراحل بیان ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر کیتھ ایل مور (Khith L Moor) جینیات کے ایک معروف سائنس دان ہیں، انہوں نے ایک بار اس بارے میں اپنے ایک مقالے میں کہا:

"یہ بات مجھ پر عیاں ہو چکی ہے کہ یہ بیانات (انسانی نشو و نما سے متعلق) محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، کیونکہ یہ تمام معلومات چند صدیاں پہلے تک منکشف ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس سے یہ بات مجھ پر ثابت ہو جاتی ہے کہ (محمد ﷺ) اللہ کے پیغمبر ہیں"

انسانی جنین کی تشکیل اور ارتقا کے بارے میں سائنسی انکشافات اور توجیہات پر بہت سی کتب میں معلومات سامنے آ گئی ہیں، جہاں سے یہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(ii) پہاڑوں کے بارے میں قرآنی بیان

پہاڑوں کے بارے میں قرآن حکیم کا یہ بیان گزر چکا ہے (آیت نمبر۲) کہ ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنایا ہے۔ اب جدید سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ پہاڑ سطح زمین کے نیچے گہری تہیں رکھتے ہیں اور یہ کہ یہ پہاڑ زمین کی تہ کو مضبوطی سے جمانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(iii) سمندر اور دریاؤں کے طبعی خواص اور قرآن کریم

سمندر اور دریا انسان کی اہم ضرورت ہیں۔ دونوں کے پانی بھی طرح طرح کے خواص رکھتے ہیں، جس میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض مقامات پر میٹھے اور کھارے پانی یکساں چلتے ہیں، مگر باہم نہیں ملتے، اس حقیقت کو قرآن نے چودہ صدیاں قبل بیان کیا تھا، اور اس کا ذکر سطور بالا (آیت نمبر۳) میں گزر چکا ہے۔ اب جدید سائنس نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ جہاں میٹھے اور کھارے پانی باہم ملتے ہیں، وہاں ان کے درمیان، ایک گاڑھے پانی کا حجاب ہوتا ہے جو تازہ پانی اور کھارے پانی کی پرتوں کو باہم ملنے نہیں دیتا۔

(iv) بادلوں اور اولوں کے بارے میں تفصیلات اور قرآن کریم

بادلوں اور اولوں کے بارے میں قرآن حکیم نے جو بیان ذکر کیا تھا (آیت نمبر۴) آج وہی تفصیل سائنس بیان کر رہی ہے، مثلاً سائنس دان غور و فکر اور مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بارش کے بادل ان مراحل سے گزرتے ہیں (۱) ہوا کا بادلوں کو دھکیلنا (۲) چھوٹے بڑے بادلوں کا ملاپ (۳) بادلوں کا ابھار، جب بادل اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ ہوا کی حرکت سے ابھار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہاں سے یہ فضا کے ٹھنڈے علاقوں تک پھیل جاتے ہیں۔

(v) انسانی جلد کی حسی خصوصیات اور قرآن حکیم

قرآن حکیم میں بیان کیا گیا ہے (آیت نمبر۵) کہ کافروں کو جب عذاب ہو گا تو ان کی

جلد تلف ہو جائے گی، اس کے بعد فوراً انہیں دوسری جلد دی جائے گی تاکہ وہ مسلسل عذاب کا مزا چکھتے رہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں جلد ہی تکلیف محسوس کرتی ہے۔ اب سائنس نے بھی یہ بات دریافت کر لی ہے کہ تمام تکالیف جلد ہی پر ہوتی ہیں، اور اعصاب جو درد کا ادراک کرتے ہیں، وہ فقط جلد ہی میں پائے جاتے ہیں، مثلاً اگر جسم کے کسی حصے میں سوئی چبھوئی جائے تو درد صرف جلد میں ہوگا، اور سوئی کو جلد سے آگے گزار دیا جائے، تب بھی فی الواقع درد جلد تک محدود رہے گا، آگے گوشت میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

ان سطور میں قرآنی بیانات کی سائنس سے تائید دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دیا جائے کہ سائنس کے بارے میں اسلام کا رویہ معاندانہ نہیں ہے، نہ مخالفانہ ہے، بلکہ وہ اسے زندگی کی دیگر دوسری ضرورتوں اور لوازم کی طرح باور کرتا ہے، اور جدید سائنس بھی قدم بہ قدم اس کے بیانات ہی کو آگے بڑھا رہی ہے۔ قرآن کریم میں پیش کردہ رہنمائی کو پیش نظر رکھ کر اگر سائنس قدم آگے بڑھائے تو اس کے لیے حقائق تک جلد پہنچنا ممکن ہوگا۔ اس کی تائید ان چند بیانات سے ہوتی ہے، جس کی جھلکیاں اوپر پیش کی گئیں، وقت کی قلت اور مقالے کی محدود گنجائش کے سبب اس جانب چند اشارے ہی کیے جا سکے ہیں، مگر ان سطور کا مقصد اس سے ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

اعترافِ حقیقت

یہ بات باشعور اور علم رکھنے والے مفکرین سے بھی پوشیدہ نہیں، بلکہ سبھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں کہ اسلام اور سائنس دونوں آج کی زندہ ضرورتیں ہیں، جن سے اعراض ممکن نہیں، معروف نومسلم فرانسیسی مصنف موریس بوکائے لکھتے ہیں:

> "قرآن ہمیں جہاں جدید سائنس کو ترقی دینے کی دعوت دیتا ہے، وہاں خود اس میں قدرتی حوادث سے متعلق بہت سے مشاہدات وشواہد ملتے ہیں، اور اس میں ایسی تشریحی تفصیلات موجود ہیں جو جدید سائنسی مواد سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہیں، یہودی، عیسائی تنزیل میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

دوسرے مقام پر مزید لکھتے ہیں:

> "قرآنِ کریم میں، مقدس بائبل سے کہیں زیادہ سائنسی دلچسپی کے مضامین زیر بحث آئے ہیں، بائبل میں یہ بیانات محدود تعداد میں ہیں، لیکن سائنس سے متباین ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن میں بہ کثرت

مضامین سائنسی نوعیت کے ہیں، اس لیے دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں، موخر الذکر (قرآن) میں کوئی بیان بھی ایسا نہیں، جو سائنسی نقطہ نظر سے متصادم ہوتا ہو۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے، جو ہمارے جائزہ لینے سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔"

اور ڈاکٹر کیتھ مور جن کا اس سے قبل بھی ایک بیان گزر چکا ہے، ان کا ایک اور بیان ملاحظہ کیجیے:

"۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقا کے بارے میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔"

خلاصۂ بحث

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلقات اور ان کے مابین مفاہمت کے بارے میں درج بالا بیانات اور سطور پر غور و فکر کرنے سے انسان دو باتیں بہت سہولت کے ساتھ اخذ کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کسی بھی ذریعے سے کائنات اور اس کی اشیا کے بارے میں وہ باتیں نہ جان سکا تھا، جو قرآن مجید نے بتائی ہیں۔ دوسری بات یہ اخذ کی جا سکتی ہے کہ اس کائنات کی مادّی دنیا میں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، وہ صرف خدا کے حکم سے ہو رہا ہے اور اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، بہ الفاظ دیگر ہر کام میں علت (Cause) اور معلول (Effect) کے علاوہ غایت (Purpose) بھی لازماً کارفرما ہے، اور کائنات کی ہر شے اور اس کا ہر قدم اسی سہ رکنی عمل کا نتیجہ ہے۔

اس لیے ہمیں باہمی مشترک قدروں کو اپناتے ہوئے اور تمام مادّی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے، انسانی زندگی کے دونوں اہم پہلوؤں اور انسانی زندگی کی دونوں اہم ضرورتوں کو، ان کی ضرورت، حق اور حیثیت کے مطابق ان کا حق دینا ہوگا۔ نہ تو مذہب کے فرض اور دیومالائی مفروضات اختیار کر کے ہم سائنس سے دور رہ سکتے ہیں، نہ سائنس کو خدا کا درجہ دے کر خالق حقیقی سے اپنی زندگیوں کو خالی رکھ سکتے ہیں اور اگر بالفرض ایسا کریں گے بھی تو کامیابی کی راہ سے دور ہوتے چلے جائیں گے اور فلاح کی جگہ ناکامی ہمارا مقدر بنے گی۔

اسلام، قرآن اور سائنس

ڈاکٹر وکیل جبران

سائنسی علوم نے دور حاضر میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ سائنسی ایجادات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ ہر نیا دن ایک نئی ایجاد کی نوید سناتا ہے اور **کل یوم ھو فی شان** کا مفہوم سامنے نظر آتا ہے۔ سائنسی ایجادات سے انسان بے پناہ فائدے حاصل کر رہا ہے اور انسانی عقل نے سائنس کے میدان میں جو جو کارنامے انجام دیئے ہیں، انسان ان پر بجاطور پر فخر کرسکتا ہے۔

سائنس کے ذریعہ ہی انسان کے لیے ممکن ہوا کہ اس نے کرہ ارضی سے نکل کر خلا کا رخ کیا اور چاند پر جا پہنچا اور دیگر خلائی سیاروں پر پہنچنے کا اپنے دل میں عزم کرلیا۔ انسان کے ان ارادوں میں کہاں تک اس کو کامیابی حاصل ہوتی ہے؟ یہ مستقبل میں ہی معلوم ہوسکے گا مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تک اس میدان میں انسان ترقی حاصل کر چکا ہے وہ بھی خاصا وسیع وعریض میدان ہے۔

مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں بڑے جاندار کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور آج سائنس دان جن سائنسی اصولوں کو بنیاد بنا کر اپنی تحقیقات کو آگے بڑھا رہا ہے وہ مسلمان سائنس دانوں کے ہی ایجاد کردہ ہیں۔

بے شک قرآن مجید ایک سائنسی کتاب نہیں ہے۔ یہ کتاب ہدایت ہے مگر اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علم و دانائی، عقل و دانش اور شعور انسانی کو بیدار کرنے میں جو کردار قرآن مجید نے ادا کیا ہے وہ کسی اور کتاب نے نہیں کیا۔ قرآن مجید نے ایک فلسفہ پیش کیا اور دنیا کو سوچنے کا ڈھنگ (Way of Thinking) سکھا دیا جس سے علم کو ترقی نصیب ہوئی، علم عام ہوا اور خواص کے قبضہ سے آزاد ہوا اور اسی علمی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سائنسی علوم کے ذریعہ انسان نے کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھایا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

اس مضمون میں جدید سائنسی تحقیقات کو قرآنی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مشتے از خروارے کے مصداق معمولی سی کوشش ہے۔ مگر اس میں اہل فکر و دانش کے لیے ایک راستہ اور سمت کا تعین ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سائنسی علوم کو انسان کے لیے مفید بنائے اور ان کے منفی اثرات و نفوذ سے انسانیت کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

قرآن مجید میں ارشاد باری ہے:

"بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں، رات دن کی (مسلسل) تبدیلی میں، اس کشتی (جہاز) میں سمندر میں چلتی اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور اس پانی میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان سے اتارتا ہے اور زمین کے مردہ ہونے کے بعد اسے اس پانی کے ساتھ زندہ کرتا ہے اور اس (زمین) میں اس (اللہ) نے ہر قسم کے چلنے والے (انسان و حیوان) پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلنے میں اور آسمان و زمین کے درمیان بادلوں کی تسخیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے اور اس کائنات کی ہر چیز جسے انسان دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے، کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اسی تدبر و تحقیق اور تجربات کا دوسرا نام "سائنس" ہے۔

درحقیقت سائنس کی ابتداء اسی روز سے ہوگئی تھی جب انسان کی تخلیق کا آغاز ہوا تھا اور وجود پا کر وہ اس کرۂ ارضی پر اتارا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں غور و فکر، تدبر و تحقیق اور تجربات و مشاہدات نے انسان کو رب العالمین پر ایمان کامل کی طرف رہنمائی کی۔ اسے استدلالی یقین یا علم الیقین کہا جاتا ہے۔

اللہ کے مومن و مخلص بندے اپنے اس علم الیقین اور ایمان کامل کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہمارے پروردگار تو نے انہیں بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ"

اس کے برعکس وہ لوگ جو مناظر قدرت سے متاثر نہیں ہوتے یا ان سے بصیرت حاصل نہیں کرتے، ان کے متعلق عظیم سائنس دان آئن سٹائن ان الفاظ میں حیرت کا اظہار کرتا ہے:

''وہ انسان جو کائنات پر اظہار تعجب کے لیے نہیں ٹھہرتا اور اس پر خشیت و تقویٰ کی کیفیت طاری نہیں ہوتی، درحقیقت وہ مر چکا ہے اور اس کی آنکھیں بصارت سے محروم ہو چکی ہیں''

جبکہ آئن سٹائن سے سینکڑوں برس پہلے قرآن مجید نے اسی بات کی طرف یوں اشارہ فرمایا تھا:

''کیا یہ لوگ کائنات ارض و سماء اور دیگر تخلیقات الٰہیہ پر غور نہیں کرتے، شاید ان کی موت قریب آ چکی ہے۔ اس کے بعد آخر یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے''

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک ''مناظر قدرت'' کو ''آیات اللہ'' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اور ان پر غور و فکر کرنے کا ہر مومن کو حکم دیتا ہے۔

۱۹۷۴ء میں وٹی کن میں ایک پوپ نے سعودی عرب کے چند مسلمان علماء سے بحث کرنے کے بعد ایک اعلانیہ جاری کیا کہ

''یہ مذہب اسلام انسانی ترقی خصوصاً سائنس کا حامل ہے''

اور واقعہ یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں قرآن حکیم سے ہدایت حاصل کرنے والا سائنس دان جوں جوں قوانین فطرت کی گہرائیوں کو سمجھتا جائے گا اتنا ہی اس کا ایمان پختہ ہوتا چلا جائے گا۔

سائنس کا مطلب:

سائنس لاطینی زبان کے لفظ Scientia سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ''علم'' ہے۔ چونکہ اس کائنات میں رونما ہونے والے تمام طبعی اعمال کسی نہ کسی طبعی قانون کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں اس لیے مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر کائنات کے قوانین طبعی کا جو علم حاصل ہو اس کو ''سائنس'' کہتے ہیں۔

سائنس اور مذہب:

انسان نے جب پہلی بار اس کائنات رنگ و بو میں قدم رکھا تو اس نے خود کو مادیات یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات میں گھرا ہوا پایا۔ اس نے اس خانہ عجائب کی ہر چیز کا بغور جائزہ لیا اور ان سے آہستہ آہستہ استفادہ کیا مگر جب اس نے آگے چل کر سائنس پر مذہب کا کنٹرول

دیکھا تو اسے یہ پسند نہ آیا۔ اس لیے اس نے مذہبی ہدایات کے خلاف ہر چیز کو اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا جس سے بحر و بر میں فساد برپا ہو گیا اور یہ اپنا سکون واطمینان کھو بیٹھا اور آخر کار یہ چیز اس کے لیے سوہان روح بنتی گئی۔ چنانچہ عہد وکٹوریہ کے صاحب بصیرت ناول نویس جارج کسنگ کو صاف لکھنا پڑا کہ

> ''میں سائنس سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ یہ انسان کی بے رحم دشمن بنی رہے گی اور اس کے گاڑھے پسینے کی تمام کارگزاریوں کو بدنظمی کے خونی سمندر میں غرق کر دے گی۔''

اسی قسم کی نفرت و مایوسی کا اظہار ''شعبہ عمرانیات واشنگٹن یونیورسٹی'' کے صدر ''جارج لنڈبرگ'' نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''کیمیاوی لیبارٹری سے ایسی اکسیر دوائی کی توقع کرنا جس سے نسلی وثقافتی امتیازات ختم ہو جائیں عبث ہے۔ البتہ ان مسائل کا حل مذہب کے پاس ہے۔''

سائنس کا مقام:

ماضی میں جب سائنس ''زوال یونان'' کے بعد ایک ہزار سال تک لاپتہ ہو گئی تو مسلمانوں نے اسے دریافت کر کے زندہ اور طاقتور علم بناتے ہوئے اسے اپنا علمی آئیڈیل سمجھا، کائنات کی بابت معلومات حاصل کرنا ساری قوم کے لیے دلکشی، ترقی اور عزت کا باعث سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں سائنسدانوں کو ''شیخ الرئیس'' کہا جاتا تھا۔

سائنس ان کے لیے معاشی پیشہ یا ہنرمندی نہیں تھی بلکہ یہ ان کا جذباتی ولولہ یا شوق تھا، اس کے برعکس آج مسلمانوں کی سوسائٹی میں سائنس کی تعلیم ایک نمایاں ولولہ یا نصب العین کی کیفیت سے خالی ہے۔ البتہ دور حاضر میں انسانی روح بے تابی کے ساتھ سائنس کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتی ہے اس لیے اس کو علمی جہاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سائنسدان کو چاہیے کو وہ سائنس کے سارے نکتہ نظر کو انسان کی بھلائی اور خدمت کی طرف اسی جذبہ وشوق سے پھیلا دے جیسے وہ کسی دینی یا روحانی یا جذباتی کام میں لگا ہو۔ چنانچہ حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ

> ''سائنس سے غفلت کرنا بے دینی ہے، جبکہ سائنس کی محبت خاموش عبادت ہے، ایسی عبادت جس میں اقرار باللسان وتصدیق بالقلب کے

ساتھ علم بالارکان شامل ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں جا بجا انسان کو اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت کا بغور مطالعہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

سائنس کی اہمیت:

سائنس علم کے طور پر بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ سائنس کے آلات انسان کو سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ اسلام انسانوں کی ضرورت کو پورا کرنے والی چیزوں پر خاص طور پر توجہ دیتا ہے۔ چنانچہ سکھایا ہوا شکاری کتا جب شکار کرتا ہے تو اس کا شکار حلال سمجھا جاتا ہے نیز اسلام نے بہت سی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا سوسائٹی، سماج اور ذات انسان پر فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ان ضروریات میں سائنس کا علم بھی شامل ہے جس کو سیکھنا ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کیونکہ اس سے ملک و قوم کی ترقی وابستہ ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اسلام سائنسی علوم کا مخالف ہے بلکہ سائنس تو اسلام کی مرہون منت ہے۔ اگر اسلام معرض وجود میں نہ آتا تو سائنسی تعلیم پردہ خفا میں رہتی اور انسان سائنسی سپرٹ اور تحقیقی ظرف سے متعارف نہ ہو سکتا۔

بہر حال سائنس، حقیقت میں "آیات اللہ" میں سے ہے جس نے فراعنہ مصر کے ہاں جنم لیا۔ منکرین و ملحدین کے ہاتھوں پرورش پائی۔ دنیا و جنت کی راحت، دوزخ کے عذاب اور قیامت کے قیام کا نمونہ دکھایا۔ خدا دوستی اور خدا شناسی کی دعوت دی۔ قرآنی نظریات کی صحت کا اعتراف کرایا اور ان سب کے لیے اتمام حجت بن کر رہی جنھوں نے اپنے کفر و انکار پر اصرار کیا۔ حشر کے روز ان کی اپنی سائنسی ایجادات و اختراعات ہی انہیں جھٹلانے کے لیے کافی ہوں گی۔

سائنسی تحقیقات و نظریات کی تاریخ

۶۰۰ء بعد از مسیح کا زمانہ سائنس کا قدیم زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس دور میں انسان تجربے کا نہیں بلکہ منطق کا عادی تھا۔ یونانی فلاسفروں نے سائنس کو نظریاتی مضمون کے طور پر پیش کیا۔ بعد میں تجرباتی سائنس کی ابتداء اس وقت ہوئی جب عرب کے افق پر اسلام کی روشنی نمودار ہوئی۔

قرآن حکیم دنیا کی وہ پہلی کتاب ہے جس نے علم فلکیات کی طرف انسان کو متوجہ کر کے اسے مظاہر قدرت کے مطالعہ و مشاہدہ کی دعوت دی ہے۔ اگرچہ زمانہ قدیم ہی سے یہ ستارے صحراؤں اور سمندروں میں انسان کی راہنمائی کر رہے تھے مگر قرآن حکیم نے یہ کہہ کر ان کی اہمیت کو

بڑھا دیا کہ سورج، چاند اور ستاروں کا تعلق عبادات سے بھی ہے۔ اسی لیے جوزف ھیل کہتا ہے کہ
"روحانیت کے بعد مسلمانوں نے سب سے زیادہ توجہ ریاضیات اور فلکیات پر دی۔"
مسلمان سائنس دان اور حکماء نے ہی الجبرا اور کیمسٹری کے ایسے اصول اور فارمولے وضع کیے جن کے بغیر سائنس دان ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے۔ بقول ڈاکٹر لیبان۔

"طلوع اسلام کے فوراً بعد ۱۳۲ھ میں بغداد میں مدرسہ علم ہیئت قائم ہو چکا تھا جو سات سو سال تک جاری رہا۔"

بقول "موسیو سیدیو" اس مدرسہ کے علماء و حکماء کا کمال یہ تھا کہ وہ دوربین اور کواکب کے ارتفاع معلوم کرنے والے آلہ "اصطرلاب" کی مدد کے بغیر ہی علوم فلکیات میں پورا کمال پیدا کر لیتے۔

دور اسلام کی پہلی پہلی رصدگاہ ۲۱۴ھ میں ہی دمشق میں قائم ہوگئی تھی۔ اسی طرح یورپ میں بھی پہلی رصدگاہ مسلمانوں نے قائم کی تھی، بقول ڈاکٹر ڈریپر "مسلمانوں نے ان تمام سیاروں کی فہرست مرتب کی جو آسمان پر نظر آئے اور بڑے بڑے ستاروں کے نام بھی مسلمانوں نے ہی رکھے"

قریب قریب تمام ستاروں کے ننانوے فیصد عربی نام معمولی تلفظ کی تبدیلی سے آج تک مروج ہیں۔ ان کا محل وقوع بھی وہی تسلیم کیا گیا جو مسلمان ماہرین نے متعین کیا تھا اور ان کی صحت پر آج دور جدید کی دوربینوں نے مہر ثبت کر دی ہے۔ یہی علوم تراجم کے ذریعے عربی سے دوسری مغربی زبانوں میں منتقل ہوئے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ علم و حکمت کا اسلامی دور ہے۔ اس دور میں فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات اور سائنس کے فراموش کردہ علوم کو مسلمانوں نے نہ صرف زندہ کیا بلکہ اپنی تحقیقات سے ان کو نئی وسعت بخشی اور مسلمان سائنسدانوں کی تحقیقی کاوشوں کی بدولت دنیا جدید علم کی روشنی سے منور ہوئی۔ بلاشبہ جدید سائنس کے بانی مسلمان ہی ہیں اس پر اہل یورپ کی مجال انکار نہیں۔

بعد میں مسلمانوں نے ان سائنسی علوم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دی تو اہل مغرب نے ان علوم کو اپنا کر اتنا آگے بڑھا دیا کہ ان کے ذریعے نہ صرف

چاند پر پہنچ گئے بلکہ اس سے بھی آگے ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں۔

قرآن اور سائنس:

قرآن حکیم میں تقریباً ساڑھے سات سو آیات ایسی ہیں جو کسی نہ کسی طرح سائنسی مظاہر اور عوامل کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں مگر ہم اپنی کم علمی کے باعث ابھی تک ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مقالے میں تمام سائنسی تحقیقات و نظریات اور متعلقہ آیات کا احاطہ کرنا تو بہت مشکل ہے البتہ چند مشہور تحقیقات کے بارے میں قرآن پاک کی پیش گوئیوں کا ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔

نظریہ اضافت:

انسان کے چاند پر پہنچ جانے سے مذہبی دنیا میں تہلکہ سا مچ گیا جیسے یہ بھی شجر ممنوعہ کی طرح کوئی شجر ممنوعہ تھا جسے چھو کر انسان غلطی کر بیٹھا ہے حالانکہ قرآن حکیم نے انسان کے چاند پر پہنچنے کی نہ ممانعت کی ہے اور نہ مخالفت بلکہ انسانوں کا وہاں پہنچنا قرآنی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

> ”قسم ہے اس چاند کی جب پورا ہو جائے کہ تم کو ایک کے بعد دوسری حالت پر ضرور پہنچنا ہے۔“

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک حالت پر جامد نہیں رہے گا بلکہ ترقی مخلوق ہونے کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرے گا۔

اس سے قدیم فلاسفر کے اس نظریہ کی تائید بھی ہو گئی کہ ”سرعت سیر“ کے لیے کوئی مقدار معین نہیں“ نیز اسراء نبوی ﷺ کی تائید و تصدیق کی ایک اور عقلی دلیل سامنے آ گئی کہ اگر ”گاگرین“ نے چوبیس گھنٹوں کے اندر دنیا کے سترہ چکر لگائے تو کیا رسول پاک ﷺ راتوں رات آسمانوں کی سیر کر کے واپس نہیں آ سکتے۔

عام طور پر مسلمانوں کے ہاں معراج نبوی ﷺ کے متعلق یہ توجیہہ مشہور ہے کہ ہر چیز بوقت معراج اپنی اپنی جگہ رک گئی تھی۔ اس کی تائید البرٹ آئن سٹائن کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ

> ”کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ نہیں ہو سکتی اگر کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ ہو جائے تو اس کے لیے وقت بھی تھم جاتا ہے۔“

چاند میں عرب دراڑ:

جب امریکی خلا باز چاند پر اترے تو انہوں نے چاند کے وسط میں ایک بڑی دراڑ دیکھی جو غیر معمولی نوعیت کی تھی، اس کو دیکھ کر امریکی خلا باز حیرت زدہ ہو گئے کیونکہ قدیم فلاسفہ کے نزدیک چاند میں خرق والیتام محال ہے۔ مگر جب ان کو پتہ چل گیا کہ مسلمانوں کے نبی پاک ﷺ کے معجزے کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے ہوئے اور اس کی وجہ سے یہ دراڑ پڑی تھی تو وہ مزید حیران ہوئے اور اس کے فوٹو لیے جو بعد ازاں عالمی اخبارات میں بھی شائع ہوئے۔

چنانچہ اسی وجہ سے امریکی خلائی محکمہ ''ناسا'' نے اس دراڑ کا نام عرب دراڑ رکھا ہے۔

قرآن حکیم نے چاند کی اس دراڑ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ پڑا''

ستارے:

یونانی حکماء کہتے تھے کہ ستارے آسمان میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح نگینہ انگوٹھی میں، لیکن دور حاضر میں خلا بازوں نے چاند کے گرد چکر لگا کر دیکھا اور چاند کے اوپر چڑھ کر بچشم خود چاروں طرف دیکھا تو یہ بیان دیا کہ ستارے آسمان سے نیچے خلاء میں بالکل اسی طرح رو بہ گردش ہیں جس طرح کرۂ ارض فضا میں گردش کر رہا ہے۔ اس طرح یونانیوں کے نظریہ کی تردید ہو گئی مگر قرآن مجید کے اس بیان

''یقیناً ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا''......کی تصدیق ہوتی ہے۔

پھر یہ ستارے یوں ہی گردش میں نہیں ہیں بلکہ ان کی گردش سائنسی ضابطوں اور اصولوں کے حساب سے ہے۔ جس کے متعلق قرآن حکیم نے فرمایا:

''اور سورج، چاند اور ستارے اس (اللہ) کے حکم کے تابع ہیں۔''

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا:

''کہ تمام اپنے اپنے مدار (دائرہ) میں گردش کر رہے ہیں۔''

آج کل کے جدید دور میں بھی خلائی جہازوں وغیرہ کے راستوں کا حساب بھی مختلف ستاروں کی مدد سے رکھا جاتا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں آیا ہے:

''اور یہ (اللہ) وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تا کہ تم
ان کی مدد سے خشکی اور پانی کے اندھیروں میں اپنے راستوں کے لیے
راہنمائی حاصل کر سکو۔''

دمدار ستارے:

اجرام فلکی میں ایسے ستارے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو خاموشی سے چلتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں انہیں دمدار ستارے کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک ''ھیلی'' نامی دمدار ستارہ ہے جو گذشتہ چند سالوں میں پاکستان میں ظاہر ہوا ہے اور اس کے متعلق اصول یہ ہے کہ تقریباً چھہتر (۷۶) برسوں میں ایک بار ظاہر ہوتا ہے اس قسم کے ستاروں کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

''ہم نے ہی آسمانوں کو اپنے دست قوت سے بنایا ہے...... اور ہم ہی اسے وسیع کرنے والے ہیں۔''

ارض وسما:

ہیولی گڈمڈ تھا پھر ایک دھماکے سے یہ پھٹا اور ایک ٹکڑا سیارہ بن کر خلا میں گھومنے لگا۔ اس تصویر کی تائید قرآن حکیم کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

''کیا وہ لوگ غور سے نہیں دیکھتے جنہوں نے انکار کیا کہ آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔''

ماہرین ارضیات کی تحقیق یہ ہے کہ آغاز میں جب زمین سورج سے الگ ہوئی تو اس کا درجہ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے۔ بعد میں یہ اوپر سے ٹھنڈی ہو کر سکڑنے لگی اور سکڑتی چلی جا رہی ہے۔ آج بھی اگر کسی زلزلے سے بطن زمین کا لاوا باہر آتا ہے تو اس کا درجہ حرارت وہی ہوتا ہے جو سورج کا ہے۔ نزول قرآن سے قبل زمین کے سکڑنے کا تصور مکہ مکرمہ میں تو کجا، دنیا کے کسی حصے میں موجود نہ تھا مگر قرآن پاک نے اعلان کیا کہ

''کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اطراف سے سکیڑتے ہوئے لا رہے ہیں''

زمین کے مخفی خزانے:

نزول قرآن سے قبل کسی کے وہم وگماں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ انسانی استعمال کی جس قدر چیزیں زمین کے اوپر موجود ہیں، اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ چیزوں کے خزانے اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ان خفیہ خزانوں سے متعلق سب سے پہلے قرآن حکیم نے خبر دی کہ

''کیا تم نے دیکھا کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور مخفی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔''

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین کے اندر سے کیسے کیسے انمول خزانے آئے دن نکل رہے ہیں مثلاً کوئلہ کی کانیں، تانبا، سونے کی کانیں، ہیرے جواہرات کے خزانے اور تیل، گیس اور پٹرول کے خزانوں کے دریا کے نکلنے کی مسلسل خبریں آ رہی ہیں۔

قدیم کھنڈرات:

دنیا کے قدیم کھنڈرات کے بارے میں سائنس نے نئی باتیں اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں ان میں مصر کے قدیم تاریخی اہرام ہیں جن کی تعمیر تک ایک معمہ ہے اور ان کا شمار دنیا کے عجائب میں سے ہوتا ہے۔ ان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی بڑی بڑی چٹانیں ایسی ہیں کہ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ ایک روسی کا اندازہ ہے کہ چالیس ہزار آدمی مل کر اس کو ان کی جگہ سے بمشکل کھسکا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سوال کرتا ہے کہ آخر کار ان جناتی چٹانوں کو کس نے کاٹا؟ کب اور کس مقصد کے لیے استعمال کی گئیں؟ ان کے متعلق روسی ماہر طبعیات Matest Agrest نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ بڑے بڑے پتھر ان لوگوں نے کاٹے ہیں جو کسی زمانے میں سیارہ مشتری سے زمین پر آئے تھے کیونکہ سائنسدان مذکور کو ایک ایسی تصویر ملی تھی جو خلا باز (Spacemans) کے لباس میں ملبوس شخص سے ملتی جلتی تھی۔ مگر قرآن مجید نے اس معمہ کو بطریق احسن حل کر دیا ہے کہ

> ”اور ہم نے اس (حضرت سلیمان علیہ السلام) کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں بعض وہ تھے جو اپنے رب کے حکم سے ان کے سامنے کام کرتے تھے اور (ہمارا فیصلہ تھا کہ) ان میں جو کوئی ہمارے (اس) حکم سے سرتابی کرے گا ہم اس کو (آخرت میں) جہنم کا عذاب چکھائیں گے وہ جنات ان کے لیے وہ وہ چیزیں بناتے تھے جو وہ چاہتے تھے مثلاً بڑی بڑی عمارتیں، مجسمے، حوضوں کی طرح بڑے لگن اور بڑی بڑی دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔“

مادہ کا منبع و ماخذ:

سائنس نے دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کر کے کہ ”مادہ کا منبع و ماخذ ایک لطیف ترین قوت ہے جو نہ جسم رکھتی ہے اور نہ نظر آ سکتی ہے بلکہ اپنی صفات و اثرات سے جانی پہچانی جاتی ہے“ ثابت کر دیا کہ اس لطیف ترین توانائی کا خالق بھی اپنی ناقابل تصور انتہائی لطافت کی وجہ سے نہ ہماری

طرح کا جسم رکھتا ہے اور نہ ہی نظر آسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم اس بات پر یوں دلالت کرتا ہے:

"آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتی اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے اور وہ لطیف و باخبر ہے"

چنانچہ امریکی خلاباز جان گلین لکھتا ہے کہ

"سائنسی اصطلاحات و پیمانوں میں خدا کی پیمائش ناممکن ہے۔ مذہبی اور ایمانی قوتوں کو نہ دیکھا جاسکتا ہے، نہ سونگھا جاسکتا ہے یہ ایک ناقابل فہم اور غیر محسوس شے ہے اس طرح ہمارے جہاز کے قطب نما کو جو قوت متحرک رکھتی ہے وہ بھی ہمارے تمام حواس خمسہ کے لیے کھلا چیلنج ہے کیونکہ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن، چھو اور سونگھ سکتے ہیں حالانکہ نتائج کا ظہور اس پر واضح دلالت کرتا ہے کہ یہاں کوئی پوشیدہ قوت موجود ہے۔"

غرض سائنس نے ان صفات خداوندی کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو قرآن حکیم چودہ سو برس پہلے بیان کر چکا ہے۔ ارشاد ہے:

"وہی ایک اللہ آسمانوں میں ہے اور زمین میں بھی ہے وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری حال کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اسے بھی جانتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ ماہر حیوانات وحشریات ایڈورڈ الوتھر یسل لکھتا ہے کہ

"اگر کھلے دماغ کے ساتھ سائنس کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کے لیے خدا پر ایمان لانے کے سوا اور کچھ چارہ کار باقی نہیں رہتا"

دنیا کے نامور ماہر طبعیات لارڈ کیلون (Kelvin) بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

"آپ جتنا غور وفکر سے کام لیں گے اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرے گی۔"

ماہر ارضیاتی کیمیا، وائن بوآلٹ کہتا ہے کہ

"اس کائنات کا ایک مقصد و مدعا ہے اور اس کی تخلیق میں حکمت و دانائی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کی ترتیب کبھی اتفاق کی رہین منت نہیں ہوسکتی۔ اس کارخانہ عالم میں جو عظیم الشان ربط نظر آرہا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ

آغوش ہونے سے بہت پہلے ہی اس کی شدید گرمی کے باعث نسل انسانی جل کر راکھ ہو چکی ہوگی۔"

"جس وقت سورج لپیٹا جائے گا، ستارے گدلے پڑ جائیں گے، پہاڑ چلا دیئے جائیں گے، دس مہینے کی حاملہ اونٹنی عدم توجہی کا شکار ہو جائے گی، وحشی جانور (انسانوں کے ساتھ) اکٹھے کیے جائیں گے، دریا جھونک دیئے جائیں گے، مختلف جانوں کو اکٹھا کیا جائے گا، زندہ درگور کی گئی (بیٹی) سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس گناہ کی پاداش میں مارا گیا، اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے، آسمان کی کھال اتار دی جائے گی، دوزخ دہکائی جائے گی اور بہشت کو قریب لایا جائے گا، (اس دن) ہر شخص جان لے گا جو اس نے (اعمال) پیش کیے ہوں گے۔"

دوسرے مقام پر یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کھڑ کھڑانے والی کیا ہے، کھڑ کھڑانے والی؟ آپ کو کیا معلوم کہ کھڑ کھڑانے والی کیا ہے؟ اس دن تمام انسان بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے اور سب پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی مانند ہوں گے"

برطانی ماہر طبیعیات وفلکیات اور مشہور سائنسدان Sir James Jeams کہتا ہے کہ

"علم حرکیات حرارت سے واضح کر دیا ہے کہ فطرت اپنی آخری حالت پر پہنچنے سے پہلے ایک ایسے عمل سے گذرتی ہے جسے "اضافہ ناکارگی" (Incerad of Emtropy) کہتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ناکارگی برابر بڑھتی رہے کیونکہ وہ کسی نقطہ پر خاموش ہو کر نہیں رک سکتی۔ اسے برابر بڑھتے رہنا چاہیے تا آنکہ وہ مرحلہ آ جائے جب مزید اضافہ کا امکان ہی نہ رہے جب یہ منزل آ جائے گی تو مزید ارتقاء ناممکن ہوگا اور کائنات مردہ ہو کر رہ جائے گی کیونکہ علم حرکیات حرارت کسی قیام وسکون کی اجازت نہیں دیتا سوائے قبر کے قیام وسکون کے۔"

اسی لیے قیامت اب شاعری نہیں رہی بلکہ ایک Scientific حقیقت بن چکی ہے جس کی قرآن حکیم نے ان الفاظ میں خبر دی ہے:

"قیامت ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ اس پر
ایمان نہیں رکھتے۔"

محاسبہ آخرت اور عصری ایجادات و اکتشافات

جس طرح ہر حکومت اور ہر محکمہ میں ملازمین کی سروس بک ہوتی ہے جس میں اس کے زمانہ ملازمت کی ہسٹری شیٹ تیار ہوتی ہے اور اس کی بنیاد پر اس کی ترقی و تنزلی کے معاملات نپٹائے جاتے ہیں بعینہٖ فرشتوں کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر انسان کی چوبیس گھنٹوں کی کارکردگی لکھتی رہتی ہے۔ علمائے سائنس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "اثیر" (جو برق و نور سے زیادہ لطیف ہے) کا اثیری جسم ایک انتہائی نازک قسم کے خودکار کیمرہ کی طرح ہوتا ہے اس اثیری پلیٹ کا عکاسی اتنی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ خیال تک کی تصویر لے سکتی ہے۔ ہر آواز و حرکت کا نقش و عکس تیار کر کے محفوظ کر لیتی ہے۔ اسی طرح عالم اثیر میں انسان کی ہر ظاہری و باطنی حرکت کی فلم تیار ہوتی رہتی ہے۔ جب "روح انسانی" پرواز کرتی ہے تو یہ اثیر ہمراہ لے جاتی ہے اسی کی بناء پر انسان کی ساری زندگی کی کارکردگی کا آڈٹ ہوگا۔

دور حاضر میں ریڈار سسٹم ایجاد ہو چکا ہے یہ بذات خود عکس بھی لیتا ہے اور نظر بھی کرتا ہے۔ اس سے برق پاروں کی تیز شعاعیں نکل کر سینکڑوں میل کے دائرہ پر چھا جاتی ہیں اور فضا و خلا کے گوشہ گوشہ کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے اندر ہر چیز کا عکس لے کر پردہ پر منعکس کر دیتی ہیں۔ جہاں سے بھی یہ برقی شعاعیں گذرتی ہیں وہاں کی ہر سیاہ و سفید چیز کی ہو بہو تصویر لے لیتی ہیں۔ چنانچہ مغربی جرمنی کی پولیس نے ارتکاب جرائم کے وقت غیر مرئی شعاعوں کا استعمال شروع کر دیا ہے جن کی بدولت پولیس تاریکی میں تین سو گز تک دیکھ سکے گی لیکن مجرم پولیس کو نہ دیکھ سکیں گے۔ یہ اس کے ساتھ ساتھ وقوعہ کی تصویریں بھی لیتی رہیں گی جو مجرموں کے خلاف عدالت میں بطور شہادت پیش کی جائیں گی۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ "ہر چیز خواہ وہ اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو اور وہ جہاں یا جس حالت میں ہو اپنے اندر سے مسلسل حرارت خارج کرتی رہتی ہے۔ یہ حرارت چیزوں کے اشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہ اس چیز کا عکس ہوتی ہے جس سے وہ نکلتی ہے۔ جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھرتھراہٹ کا عکس ہوتی ہے جو کسی زبان پر جاری ہوئی تھی۔ چنانچہ ایسے کیمرے ایجاد کئے جا چکے ہیں جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی شعاعوں کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں کہ جب

وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھیں اس کیمرے کو "Evaporagraph" کہتے ہیں ان کیمروں میں انفرا ریڈ شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے اس لیے وہ اندھیرے اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتے ہیں۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ "ایک رات نیویارک کے اوپر ایک پراسرار ہوائی جہاز چکر لگا کر چلا گیا۔ اس کے ذرا بعد اسی کیمرہ کے ذریعے فضا سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی جس کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا کہ اڑنے والا جہاز کس ساخت کا تھا۔ اس حیرت انگیز دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جارہی ہے۔ ہر وقت انسان کے اقوال و افعال کائنات کے پردہ پر نقش ہو رہے ہیں جسے روکا نہیں جا سکتا۔ جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور ایک شخص اسکرین پر اسی طرح دیکھتا ہے جیسے وہ عین موقع واردات پر موجود ہو۔ ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہوگا اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی گذاری ہوگی اس کی پوری تصویر اس کے سامنے اس طرح آ جائے گی کہ وہ اسے دیکھ کر پکار اٹھے گا:

"یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کام درج کر کے رکھ دیا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے اعمال کے بارے میں یوں آگاہ کیا ہے:

"سو جو کوئی ذرہ بھر نیکی کرے گا (قیامت کے روز) اسے دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ بھر برائی کرے گا وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔"

ٹیپ ریکارڈر ایک سائنسی ایجاد ہے۔ ہم جو الفاظ اس کے سامنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں۔ وہ بعینہ انہیں دہرا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے چودہ سو برس پہلے اس بات کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا تھا کہ:

"وہ (انسان) جو لفظ (بات) بھی منہ سے نکالتا ہے اسے اس کے قریب (موجود) نگہبان اور تیار (چوکنا فرشتہ) ریکارڈ کر لیتا ہے۔"

ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق حسین ۱۹۵۳ء میں جب کسی مقدمے میں نظر بند تھے تو ان کے کمرے میں خفیہ طور پر ایسی رکارڈنگ مشینیں لگا دی گئی تھیں، جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں۔ تا کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو ریکارڈ کر لیں اور بوقت ضرورت انہیں ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کیا جا سکے۔

اور اب تو یہ بات بالکل عام ہے جس کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہی۔ بس اسی طرح ہر شخص کے ساتھ اللہ کی طرف سے مقرر فرشتے جو اس کی ہر بات کو پوری صحت

و درستگی کے ساتھ لکھتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ غیر مرئی ریکارڈر ہر شخص کے اردگرد لگے ہوئے ہیں جو اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ یا اس کے اعضاء سے سرزد ہونے والے ہر عمل کو محفوظ کر رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا نے اس کا تصور یوں دیا ہے:

''اور یقیناً تمہارے اوپر معزز لکھنے والے محافظ موجود ہیں جو کچھ بھی تم کرتے ہو، وہ اسے جانتے ہیں۔''

حتیٰ کہ انسان کے اپنے ہاتھ پاؤں بھی قیامت کے روز اس کے اقوال واعمال کے لیے ٹیپ ریکارڈ کا کام دیں گے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ:

''اور آج (قیامت کے روز) ہم ان کے منہ پر مہر سکوت ثبت کر دیں گے تو ان کے ہاتھ ان کے کان اور ان کے پاؤں ان کے کئے کی گواہی دیں گے۔''

اس قسم کی موجودہ سائنسی ایجادات محاسبہ آخرت کے لیے بین ثبوت ہیں کہ دنیا کے علمائے اخلاق بھی اس کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ولیم لیکی لکھتا ہے کہ

''اگر انسان واقعی یہ سمجھ لے کہ اسے اپنے اعمال کا بدلہ ایک دائمی عذاب یا ثواب کی صورت میں کسی ہمہ دان اور ہمہ بین حاکم کی عدالت میں ملے گا تو یہ خیال اس کے نیک کرداری کا ایک ایسا زبردست محرک ہوگا جس کے سامنے ارتکاب جرم کی اس کی کوئی تاویل نہیں چل سکتی۔''

محاسبہ آخرت کی ایک اہم کڑی وزن اعمال ہے چنانچہ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں ہوا اور گرمی وغیرہ جیسی غیر مرئی اشیاء، جن کا تعلق دیکھی جانے والی اراض سے نہیں ہے، کی پیائش کے قانون نے قرآن حکیم کے اس قول ''اور اس روز (قیامت) اعمال کے وزن کی بات بالکل سچ ہے'' کی تصدیق کر دی ہے جس کی وجہ سے اس وقت علماء کو مختلف تاویلات کرنا پڑیں چنانچہ برطانیہ کے مشہور (بارکلے) نے یہ کہا کہ ''مادہ کے جتنے بھی اعتراض تسلیم کئے گئے ہیں ان کی اصل تو محسوسیت ہے۔''

بہر حال جدید سائنس نے اعمال (خیر وشر) جیسے غیر مرئی اشیاء کے وزن کئے جانے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

ٹیلیویژن:

دور حاضر کی ایک اور ایجاد ٹیلی ویژن نے جس طرح سینکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھے

انسان کی تمام حرکات وسکنات کو گھر بیٹھے عام انسانوں کو دکھا دیا ہے نیز اسے اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ مدتوں بعد بھی دوبارہ، سہ بارہ اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تحقیق نے محاسبہ آخرت میں انسانی اعمال کو بعینہٖ اسی طرح متشکل دوبارہ کھائے جانے کے تصور کی مزید تائید کی ہے جس طرح اس سے سرزد ہوتے وقت اعمال ریکارڈ ہوئے تھے۔

ذرائع مواصلات ونشریات:

آج کے جدید سائنسی دور کے ذرائع مواصلات ونشریات یعنی ریڈیو، ٹیلویژن وی سی آر، ٹیلیفون، وائرلیس اور ٹیلیگراف وغیرہ کی ایجادات اور ان کے استعمال (اچھے یا برے) نے قرآنی واقعات کی صداقت کا ایک اور ثبوت بہم پہنچا دیا اور اہل ایمان کے دل اپنے ایمان میں اور زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے بندے اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر تمام دنیا کے لوگوں کو حج اور زیارت بیت اللہ کی دعوت دی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی اس کو قدرتی ریڈیائی لہروں سے پوری دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ چنانچہ قرآن کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

> ''اے ابراہیم آپ لوگوں میں حج کا اعلان فرمایئے وہ آپ کے پاس پیدل یا سواریوں پر (باذوق وشوق) نہایت دور دراز سے چلے آئیں گے''

دور جدید کی سواریاں:

زمانہ قدیم میں بار برداری اور انسانوں کی سواری کے لیے عام طور پر گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ اور بیل وغیرہ کام آتے تھے۔ یا پھر دریاؤں اور سمندروں میں کشتیاں اور جہاز استعمال کیے جاتے تھے (جبکہ آج کے جدید دور میں ابھی تک ان کا استعمال ہو رہا ہے) اور دور حاضر کی سواریوں، سائیکل، موٹر سائیکل، رکشہ، ٹیکسی، کار، ریل اور طیارے وغیرہ کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر قرآن پاک نے اس وقت ہی دور جدید کی ان سواریوں اور انسان کے مختلف سیاروں تک ذرائع آمد ورفت کی طرف بڑے جامع وبلیغ الفاظ میں اشارہ فرما دیا تھا کہ:

> ''اور اس (اللہ) نے گھوڑے، خچر اور گدھے اس لیے پیدا کیے کہ تم ان پر سواری کرو اور یہ تمہارے لیے زینت بھی ہیں۔ اور وہ (اللہ تعالیٰ) ایسی سواریاں بھی پیدا کرے گا جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔''

''اور ہم نے کشتی کی مانند ان کے لیے چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔''

قدیم فلاسفروں کے نظریہ کے مطابق سرعت سیر کی کوئی حد متعین نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ دور حاضر میں راکٹ، میزائل اور خلائی جہاز جیسی چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں جن سے دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا جاتا ہے اور اسی طرح انسان چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جن کی بدولت افلاک گیر واقعات ظہور پذیر ہوئے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے وزیر آصف بن برخیا نے ملک سبا کی ملکہ بلقیس کے سینکڑوں میل دور پڑے تخت سے متعلق یہ کہا تھا:

''کہ میں اسے آپ کے پاس پلک جھپکنے میں لے آؤں گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور چند لمحوں میں تخت بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا۔

انسان کے چاند پر پہنچ جانے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مظاہر قدرت کا نظارہ کرنے کی دعوت قرآن پاک پہلے ہی دے چکا ہے۔ ارشاد ہے:

''آپ ﷺ فرما دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں مظاہر قدرت کا مظاہرہ کرو۔''

فرعون موسیٰ کی غرقابی اور اس کی نعش کی بازیابی:

قرآن پاک میں موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کو اس کی معصیت الٰہی اور احکام اللہ سے بغاوت کے انجام میں غرق کیے جانے اور پھر اس کی نعش کو تا قیامت محفوظ رکھ کر آنے والی نسلوں کے لیے سامان عبرت بنانے کے اس دعویٰ

''کہ آج ہم تیرے بدن کو (پانی سے بچا کر) محفوظ کر لیں گے تا کہ تو اپنے بعد آنے ولوں کے لیے (بطور انجام) باعث عبرت ہو۔''

کا اس دور کے کفار و مشرکین اور منکرین قرآن و رسول ﷺ نے اور جدید دور کے دشمنان اسلام نے بھی مذاق اڑایا اور کہا کہ قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق تو تب ہو کہ فرعون کی لاش کا علم ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر فرمایا ہے اس لیے ۱۸۸۱ء میں اہرام مصر کے قریب قدیم مصری قبرستان کی کھدائی کے دوران انگلستان کے ماہرین کو پتھر صندوقوں میں سے پانچ نعشیں ملیں جو کہ حنوط شدہ یعنی سائنٹیفک طریقوں سے محفوظ کی ہوئی تھیں اور ہر ایک

کے بارے میں معلومات تختیوں پر درج تھیں اور ان میں سے ایک نعش فرعون موسیٰ علیہ السلام کی تھی ۔تو قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق و تائید ہوگئی جبکہ یہ واقعہ نزول قرآن سے تقریباً بائیس سو سال قبل پیش آیا تھا۔

قانون زوجیت:

قدیم دور کے ماہرین علم اور سائنسدانوں کی تحقیق صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان اور حیوانوں کے جوڑے (نر مادہ) ہی پیدا فرمائے ہیں۔مگر جدید سائنسی تحقیقات و انکشافات نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ نباتات و جمادات اور مادی ذرات میں بھی جوڑے (نر اور مادہ یا مثبت و منفی کی صورت میں) پائے جاتے ہیں۔مثلاً درختوں کے نر اور مادہ کا ملاپ ہواؤں کے ذریعے ہوتا ہے اور قرآن نے پہلے سے یہ فرمایا ہے کہ:

''ہم نے بار آور کرنے والی ہوائیں بھیجیں۔''

اسی طرح جدید سائنسی تحقیق کے مطابق بجلی اور شعاعوں میں بھی مثبت و منفی جوڑے ہیں اور ان دونوں کے ملاپ کے بغیر صحیح اور مفید برآمد نہیں ہوسکتا۔اس طرح بھی قرآن حکیم کے عالمگیر اصولوں کی صداقت کی تائید بدرجہ اتم ہو جاتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اپنے پیغمبر کے ذریعے عام انسانوں پر یہ کہہ کر منکشف کر دیا تھا کہ:

''اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو''......

اور یہ کہ

''پاک ہے وہ ذات جس نے زمین کی نباتات کے اور انسانوں کے اپنے اور ان چیزوں کے، جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہے، سب کے جوڑے بنائے''

اس آیت کے آخری حصے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''آئندہ دنیا میں معلوم نہیں کہ کتنی ایسی چیزیں علم انسانی میں آئیں گی جن کی آج ہمیں خبر نہیں اور سائنس کی اس دوڑ کے زمانے میں کا وجود یا علم میں آنا عین ممکن ہے''

مخفی مخلوق:

اللہ جل شانہ نے جس طرح اپنی ذات پاک کو اپنی صفات کے پردوں میں چھپا رکھا ہے اسی طرح اس نے مخلوقات میں سے بعض ایسی بھی پیدا کی ہیں کہ جسم و جان رکھنے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتیں جیسے ملائکہ اور جنات۔انسان اپنی طبعی کثافت کی بناء پر سب کو نظر آتا ہے جبکہ وہ

اپنی طبعی لطافت کی بناء پر کسی کو نظر نہیں آتے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی انسان دشمنی کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"کہ وہ شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جبکہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔"

اسی وجہ سے بعض ملحد قسم کے لوگ ان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے لیکن جدید سائنس نے ایک اور مخفی مخلوق دریافت کر کے اس حقیقت کا واضح اظہار کر دیا ہے کہ اس کائنات میں بے شمار ایسی مخلوقات کا وجود ہے جو جسم و جان رکھنے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتیں۔

چنانچہ سائنس کی جدید تحقیق کے مطابق الیکٹرون اور پروٹون کے اختلاط سے پیدا ہونے والے عنصر کو سیل (Cell) کہتے ہیں۔ یہ جاندار بڑے حساس، صاحب جسامت، تیز حرکت کرنے والے اور اپنی بقا کے لیے کوشاں رہنے والے ہوتے ہیں۔ جنہیں انسانی نظر صرف خوردبین کی مدد سے دیکھ سکتی ہے۔

سر چارلس ڈارون کے بیان کے مطابق بیکٹیریا اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک پن کی نوک پر ایسے لاکھوں ذی روح اور ذی حیات نظر آتے ہیں۔ خود حضرت انسان دو ہزار کروڑ Cells کا مرکب ہے اور اس کائنات اکبر میں کائنات اصغر کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا قرآن مجید میں متعدد جگہ مذکور جنات و ملائکہ کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہزاروں تحقیق گاہوں میں ان کی موجودگی کا سائنسی آلات کے ذریعے مشاہدہ ہو چکا ہے۔

دماغی امراض:

پوری دنیا کے ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ تمام دماغی بیماریوں کی ابتداء (Frustration) اطمینان قلب کے فقدان سے ہوتی ہے۔ اسی کی بنا پر کنگ ایڈورڈ کالج کے شعبہ نفسیات کے سربراہ "پروفیسر آئی اے کے ترین" نے کہا کہ "ذہنی دباؤ کا بہتر علاج، صبح کی نماز ہے" اسی شعبہ میں ہونے والے ایک تحقیقاتی سروے کے حوالے سے بتایا گیا کہ "تہجد کی نماز اس بیماری کا موثر علاج ہے۔"

گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان امراض کے علاج یا اطمینان قلب کے حصول کے لیے ذکر الٰہی ضروری ہے اور یہ بات قرآن پاک میں پہلے سے موجود ہے کہ:

"یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔"

چنانچہ ڈاکٹر سید مبارک علی الجیلانی فرماتے ہیں کہ "شفا خانہ امراض دماغی۔ طائف

(سعودی عرب) میں میرے طریق علاج یعنی بالقرآن کا مختلف ممالک کے ماہرین نفسیات نے مشاہدہ کیا بلکہ ایک باقاعدہ سائنٹیفک تحقیقاتی ادارہ برائے ریلیجس تھراپی (Religeous Thrapy) قائم کر دیا جس میں کئی مرضوں خصوصاً جنون، مرگی اور مالیخولیا وغیرہ میں مبتلا مریضوں کو علاج بالقرآن کے ذریعہ بحکم الٰہی شفا سے ہمکنار کر کے موجودہ مادی سائنس، فرائیڈ کے نظریات کے ابطال اور آیات قرآن کی تاثیر کو سائنسی طور پر ثابت کیا ہے۔ اور اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں ان الفاظ میں کر چکا ہے۔

''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہوتی ہیں۔''

سور کا گوشت اور خون:

ان دونوں چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

''بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے مردار اور خون (پینا) اور سور کا گوشت (کھانا) حرام قرار دیا ہے۔''

سور (خنزیر) کے گوشت کی وجہ تحریم کے بارے میں ایک جرمن مقالہ نویس نے بیان دیا ہے کہ:

''حضرت محمد ﷺ نے خنزیر کے گوشت اور دیگر حرام جانوروں کے گوشت جن کو کھانے سے انہوں نے اپنی اُمت کو روکا ہے، کے اندر انہوں نے ضرور امراض ہیضہ، ٹائیفائڈ اور بخار وغیرہ کا خطرہ دریافت کر لیا ہوگا۔''

رہی خون کی بات تو جدید سائنس کی اس کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ ''خون میں جسم کی تمام فاسد رطوبتیں جمع ہوتی رہتیں ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خون کا استعمال حرام قرار دیا ہے۔

شراب:

موجودہ سائنسی تحقیقات نے شراب کے نقصانات کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے جب کہ مشہور ماہر غذائیات ''پروفیسر شبلر'' نے اعداد و شمار کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ترقی یافتہ مغربی معاشروں میں جتنے جان لیوا امراض موجود ہیں، ان سب کی وجہ شراب نوشی ہے کیونکہ یہ پھیپھڑوں اور زبان کے کینسر کا بڑا سبب ہے: ذیابیطس اور گنٹھیا کا مرض بھی اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی اس کے نقصانات کا تذکرہ کر کے اسے حرام قرار دیا

دے دیا تھا۔ بلکہ خود بعض صحابہ کرام نے مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں مطالبہ کیا تھا کہ

"اے اللہ کے رسول ﷺ ہمیں شراب کے بارے میں فتویٰ دیجئے (کہ یہ حرام ہے) کیونکہ یہ عقل کو ضائع کرنے والی اور مال برباد کرنے والی چیز ہے".....تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرما کر اسے حرام قرار دیا:

"اے ایمان دارو، شراب، جوا، بت اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں لہٰذا ان سے پرہیز کرو تا کہ تم کامیاب ہوسکو"

سچے اور مخلص مسلمانوں نے ایک ہی حکم کا اشارہ پاتے ہی اس "ام الخبائث" کا خاتمہ کر دیا اور اپنے اوپر حرام کر لیا۔ چنانچہ ایک متعصب مغربی مفکر (سر ولیم میور) لکھتا ہے کہ "اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترک مے خواری میں جس طرح وہ کامیاب ہوا ہے، کوئی اور مذہب کامیاب نہیں ہوا۔"

مگر افسوس کہ آج کا نام نہاد مسلمان ابھی تک اس حرام، ام الخبائث کا شکار ہے۔

مختصراً یہ کہ مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ سائنسی تحقیقات و نظریات اسلامی تعلیمات یا قرآن مجید کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس کی مرہون منت اور مؤید ہیں۔ سائنس کی ترقی نے قرآن مجید کی تمام بتائی ہوئی باتوں کو ثابت کر دکھایا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے اس مضمون میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری ناقص کوشش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو عقل سلیم اور فکر اسلامی عطا فرمائے۔ آمین

قرآن مجید اور سائنس

مہر حسین بخاری

قرآن حکیم انسان کے لیے مکمل ہدایت ربانی ہونے کی وجہ سے اس کی اخلاقی و روحانی کا ترقیوں کا ضامن ہے اور بلاشبہ اس کی جملہ مادی اور جسمانی ضرورتوں کا کفیل بھی۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "اگرچہ سائنس میں قرآن نہیں لیکن قرآن میں سائنس ضرور موجود ہے۔" کیونکہ موجودہ سائنس نے مادہ کا گہرا مشاہدہ اور اس پر غور وفکر کر کے ظاہری طور پر تو حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن گمراہ کن نظریات نے روحانی اور اخلاقی انحطاط کی پریشان کن صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ مذہب اور سائنس باہم متضاد ہیں حالانکہ نظریاتی اختلاف صرف اس وجہ سے ہے کہ سائنسی نظریات قائم کرتے وقت خدا کی ہدایت "قرآن حکیم" اور "سنت رسول" سے بے نیازی برتی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں لادین فلسفہ "علمی ترقی" کے نام پر سامنے آتا ہے حالانکہ افکار و نظریات کے باب میں آخری رہنما صرف "وحی الٰہی" ہو سکتی ہے۔

معاشرتی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات اور مسائل میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ ان ضروریات کی تکمیل اور مسائل کے حل کے لیے مختلف علوم وفنون وجود میں آئے۔ اس کی ایک عام فہم مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ انسان کی ایک بنیادی ضرورت "خوراک" تھی۔ اسے اس ضرورت کی تسکین پودوں سے حاصل ہوئی۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ جب تک وہ پودوں میں موجود خوراک سے پورا پورا استفادہ نہیں کرتا اس کی یہ بنیادی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے مختلف فصلیں اگائیں۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ فصلوں کو زیادہ اور بہتر طور اگایا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ پودوں کی زندگی کا مربوط اور منظم مطالعہ کیا جاتا۔ چنانچہ انسان نے نباتات کی زندگی کا منظم اور مربوط طریق پر مطالعہ شروع کر دیا اور اس طرح ایک علم وجود میں آیا جسے علم نباتات (Botany) کہتے ہیں۔

ایسے ہی اس نے محسوس کیا کہ کھانے کے ساتھ ساتھ اسے لباس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے فصلوں اور پودوں کو بطور خوراک استعمال کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کی عقل سلیم نے اسے بتایا کہ کپاس سے کپڑا تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح انسان کی یہ بنیادی ضرورت بھی پوری ہو سکتی ہے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کپاس سے کپڑا کیسے بنایا جائے؟ اس مسئلے کا حل انسان نے کھڈی سے کیا مگر یہ کھڈیاں روز افزوں آبادی کا ساتھ نہ دے سکیں اور انسان کے لباس کی ضروریات سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ٹیکسٹائل ملیں وجود میں آئیں۔ ٹیکسٹائل مل کیسے لگائی جائے؟ اس میں کون کون سی معدنیات استعمال ہو سکتی ہیں اور کون سی دھات سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے؟ اس کا متجسس ذہن مختلف تجربات و مشاہدات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ لوہا اور فولاد اس سلسلے میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے جب انسان لوہے سے اتنی بڑی خدمت لینا چاہتا تھا اس کے لیے اس کی ترکیب، ماہیت اور طبعی و کیمیائی خصوصیت سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ ایسے ہی ضروریات کی تکمیل اور مسائل کے حل کے لیے ایک ایسے علم کی ضرورت پیش آئی جو مادہ کی ترکیب، ماہیت اور خواص سے بحث کرے اسے کیمیا (Chemistry) کا نام دے دیا گیا جو سائنس کی اہم شاخ ہے۔

گویا انسانی ضروریات اور مسائل میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو بتدریج اضافے ہوتے رہے۔ ان کی تسکین و تکمیل اور حل کے لیے مختلف علوم، علم نباتات، علم حیوانات، علم کیمیا، علم نجوم، علم طبیعات وغیرہ وجود میں آئے۔ ان علوم کو انسان سائنسی علوم سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسے ہی علم سیاسیات، علم تاریخ، علم شہریت اور تمام دیگر معاشرتی و عمرانی علوم انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے انسانی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن علوم کی اس قدر بہتات اور فراوانی کے باوجود انسانی مسائل بدستور جنم لیتے رہے اور لیتے رہیں گے۔ اور ایسے علوم معرض وجود میں آتے رہیں گے مگر ہمارے مدنظر وہ علوم ہیں جو سائنسی علوم گردانے جاتے ہیں۔ اور سائنس کی ہی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس قدر ضرورت مند بنا دیا کہ اس کی ضروریات نئی ضروریات کو اور اس کے مسائل نئے مسائل کو جنم دیں تو اس قادر مطلق نے ساتھ ہی ایک ایسی کتاب بھی بھیجی جو انسانی ضروریات کی تکمیل اور ہر دور میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کرنے میں رہنمائی کر سکے۔ اور اس کتاب کو ''الکتاب'' کا نام دیا۔ قرآن میں ہے:۔

الم۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے۔

حاجت مند اور ضرورت مندوں کو پیدا کیا اور پھر ان کے لیے گوناگوں مسائل بھی پیدا

کر دیئے۔اس کے ساتھ ہی اس نے تمام انسانی مسائل کا حل اور تمام انسانی ضروریات وحاجات کی تسکین وتکمیل کے لیے راہنمائی کا بندوبست بھی خود کردیا۔ بالفاظ دیگر تمام ممکنہ علوم اس کتاب مبین میں رکھ دیئے۔''لا رطب ولا یا بس الا فی کتب مبین'' کی فضیلت صرف اسی کتاب کے حصہ میں آئی۔

اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مسلمان مختلف ادوار میں اس الہامی کتاب سے استفادہ کرتا رہا۔اور اسی سے اپنے روحانی، مادی، جسمانی، طبعی ہر قسم کے انسانی مسائل کا حل تلاش کرتا رہا۔لیکن دوسری طرف ایک وہ طبقہ تھا جو مذہب کے نام پر صرف روحانی اور اخلاقی علوم میں منہمک ہو گیا۔مختلف سائنسی علوم پر نہ صرف خود نظر نہ کی بلکہ اسے دین و مذہب سے متصادم قرار دے کر مذہب اور سائنس کو بر سر پیکار کر دیا گویا اس طرح سے دین و دنیا کی تفریق کر دی۔ ان کے پراپیگنڈے کے نتیجے میں قرآن کریم صرف اخلاقی اور روحانی علوم کی کتاب قرار پائی۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس کے پس پشت ایک ایسا ہاتھ نظر آتا ہے جو ابتدا سے ہی قرآن کی عالمی صداقت کو ماننے سے انکار کر چکا تھا۔اس کے زہریلے پروپیگنڈے نے چند خام ذہن اور سادہ لوح مسلمانوں پر بھی اثر کیا چنانچہ انہوں نے بھی اپنی سادہ لوحی اور کم علمی کی بنا پر درس خواندہ کو دہرانا شروع کر دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کے نام نہاد وترقی یافتہ سائنسدان خود انھی مسلمان سائنسدانوں اور فلاسفروں کے خوشہ چین اور شاگرد ہیں جن کی سائنسی ترقی میں بڑا ہاتھ خود قرآنی تعلیمات کا ہے۔انہوں نے قرآن سے استفادہ کی بنیاد پر انسانی تجربات اور تحقیقات کے نتیجہ میں بے مثل اصول پیش کر کے اہل دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ البتہ غیر مسلم سائنسدان تصویر کے خدوخال کی عمدگی اور حسن و جمال میں کھو کر خود ''تصویر'' بن گیا۔مگر مصور حقیقی کے فن مصوری کو داد و تحسین پیش کر کے خود کو اس کا بندہ و غلام نہ بنا سکا۔ کہ اس نے مادہ سے متعلق علوم میں تو کافی حد تک دسترس حاصل کر لی مگر اخلاقی و روحانی علوم سے بے بہرہ رہا۔اسی خالص مادیت کے نتیجے میں بے خدا ترقی کو دو مرتبہ دو عظیم جنگوں کی ہولناکیوں اور فتنہ سامانیوں کا سامنا ہوا لیکن اس کے باوجود سامراج اپنی مادیت کو فکری محاذ پر مسلط رکھنے کے لیے اس کوشش میں ہے کہ مسلمانوں کے اذہان سے اس کتاب کی عظمت و افادیت محو کر دی جائے۔ تاکہ مسلمان ایک رہنما اور منظم قوم کی صورت میں نہ اُبھر سکیں۔ان کے اذہان میں یہ زہر بھی گھولنے کی بحث کرتی ہے۔ چنانچہ وہ خام ذہن جس میں ابھی کتاب مبین کی حقیقی اہمیت اور افادیت راسخ نہیں ہوئی تھی اس نے اس مقدس کتاب کو اس حد تک تو ضرور اہمیت دی کہ اسے اپنے گھروں میں بطور خیر و برکت کے جگہ دی مگر اس سے عملی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے مادی پہلو کو بجائے

خود چھوڑا لیکن صحیح روحانی اور اخلاقی اقدار کو بھی باقی نہ رکھ سکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں وہ مادی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا وہاں ایمان ویقین کی دولت سے بھی تہی دامن ہو گیا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس قوم کو نیست و نابود کرنا ہو اس کی ماضی کی تاریخ کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دو۔ وہ قوم خود بخود صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ دشمن سیاستدانوں نے یہی اصول مسلمانوں پر آزمایا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کا ماضی اس کتاب سے وابستہ ہے۔ ماضی میں جو فتوحات، علمی واقتصادی ترقی ہوتی رہی اور جس بنا پر مسلمان دنیا کی فاتح اور کیمیا گر قوم بن گئے وہ دراصل اسی مقدس کی کتاب کی تعلیم و تدریس ہی کی بدولت تھی۔ چنانچہ مکار دشمن نے سب سے زیادہ جو کوشش کی وہ یہی تھی کہ قرآن مجید کی جامع افادیت مسلمان کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے محو کر دی جائے۔ اگر آج بھی اس مقدس کتاب کی صحیح تعلیم و تدریس کا تسلی بخش اہتمام کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اب بھی مسلمانوں میں جابر بن حیان، الخوارزمی، البیرونی اور غزالی جیسے مفکر اور کیمیا دان پیدا نہ ہوں۔

دین و مذہب کے اس ناقص تصور کی وجہ سے جدید دور کے مسلمان نوجوانوں کے اذہان میں کچھ اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:

۱۔ کیا قرآن مجید صرف اخلاقیات کی کتاب ہے؟

۲۔ کیا قرآن مجید میں سائنسی علوم بھی موجود ہیں؟

۳۔ اگر قرآن مجید میں سائنسی علوم موجود ہیں تو دوسری اقوام کی نسبت مسلمانوں میں سب سے زیادہ سائنسدان کیوں نہیں؟

ایسے ہی دیگر سوالات آج کل کے پڑھے لکھے طبقے کے اذہان میں اٹھ رہے ہیں اور بدقسمتی سے ان سوالات کے جوابات معقول صورت میں مسلمان قائدین اور دینی علماء سے بہت ہی کم حاصل ہو رہے ہیں چنانچہ اسی موضوع پر ہی کہ "کیا قرآن مجید صرف اخلاقی کتاب ہے یا اس میں سائنسی علوم بھی موجود ہیں" پر کچھ لکھنا موزوں ہوگا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن مجید جب تمام انسانی ضروریات کا خود کفیل ہے اور اس سلسلہ میں مکمل رہنمائی پیش کرتا ہے تو لامحالہ تمام علوم خواہ مادی ہوں یا روحانی، غیر سائنسی ہوں یا سائنسی کا مرجع و منبع بھی ہے۔ نوجوان نسل کے ذہنی انتشار کا ایک بڑا باعث یہ ہے کہ وہ لادین سائنس میں قرآن دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کا ذہن اس بات سے غافل ہے کہ اگرچہ سائنس میں قرآن نہیں لیکن قرآن میں "سائنس" ضرور موجود ہے۔ سائنس تو دراصل انسانی مشاہدات، تجربات سے حاصل شدہ نتائج کا نام ہے جس کا مبحث "مادہ" ہے۔ اب سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ مادہ کا وجود پہلے عمل میں آیا یا سائنس کا؟ ظاہر ہے مادہ پہلے بنا۔ بعد میں انسان کے متجسس ذہن نے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں قوانین اخذ کر کے جمع کیے اور اسے سائنس کا نام دیا۔ گویا علم سائنس ایک ایسا علم ہے جو انسانی ذہن کی ایجاد ہے اور یہ مادہ سے بحث کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان مادہ کا خالق نہیں بلکہ اس کا خالق خود اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مصور ہی اپنی تصویر کے محاسن ومعائب کو بہتر جانتا ہے۔ مصور اور خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ مادے کی ترکیب، ماہیت اور خواص سے بخوبی واقف ہے اسی لیے اپنے آپ کو ''علیم'' کے وصفی نام سے یاد فرماتا ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ مادہ پہلے وجود میں آیا اور سائنس بعد میں۔ مادے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور علم سائنس انسانی ذہن کی تخلیق ہے۔ قرآن مجید من جانب اللہ حضرت محمد ﷺ عربی پر نازل ہوا۔ یہ سوال کرنا کہ کیا قرآن مجید میں سائنسی علوم بھی موجود ہیں، ایسے ہی ہے جیسا کہ کوئی پوچھے ''کیا اللہ تعالیٰ وہ علوم بھی جانتا ہے جو انسان جانتا ہے؟''

اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوسکتی ہے کہ انسان اپنے ذہن کے تخلیقی مضامین وعلوم کو اس قدر اہمیت دے جب کہ اس کا ذہن خالق حقیقی کی تخلیق ہے۔ بہ الفاظ دیگر انسان کے تخلیق کردہ مضامین اور علوم کو قرآن مجید پر ترجیح دینا ایسے ہی ہے جیسے انسان خالق پر مخلوق کو افضل قرار دے۔

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں وہ ابدی اور دائمی اصول پیش کیے ہیں جن کو بنیاد بنا کر انسان تحقیق و تدقیق کا کام بطریق احسن انجام دے سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ذہنی انتشار کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ وہ سائنسدان کے بنائے گئے نظریات و قوانین پر قرآن مجید کی آیات کو منطبق کر کے دیکھنا چاہتا ہے اور جب کبھی اسے سائنسی قوانین اور قرآنی حقائق میں اختلاف نظر آتا ہے تو نتیجتاً وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ تقابل وانطباق کی یہ عادت خام ذہن کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔ سائنسی قوانین اور قرآنی حقائق کے درمیان تقابل تو جبھی ممکن ہے کہ مقابل کرنے والا دونوں علوم پر دسترس رکھتا ہو۔ مگر بصد افسوس اس صحیح حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جدید دور میں جنم لینے والا ذہن قرآن مجید کے مطالعہ کرنے کی نعمت سے محروم ہے۔ جب وہ سائنس کی کسی شاخ میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پڑھا لکھا انسان تصور کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سائنسی مضمون میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی قرآن مجید کے علوم سے بے بہرہ رہتا ہے جو کہ صحیح معنوں میں تمام تر علوم کا مخزن ہے۔

موجودہ دور میں قرآن مجید کے حقائق کو جو چیز سب سے زیادہ واضح کر رہی ہے وہ سائنس ہے اور سائنس کو جو چیز سب سے زیادہ ناقص ثابت کر رہی ہے وہ بھی سائنس ہی ہے

سائنس کا تعلق تجربات و مشاہدات سے ہے۔ قانون بقائے مادہ۔ (Law of conseo yation of mass) اس وقت تک صحیح ہے جب تک ایٹم ناقابل تقسیم ذرہ تصور کیا جاتا ہے مگر جب آئن سٹائن کا مشاہدہ اور تجربہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ایٹم ناقابل تقسیم ذرہ نہیں بلکہ اسے توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد قانون بقائے مادہ، کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ وقت کی رفتار اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ذہنی کلیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایک سائنسی نظریہ ایک مقررہ مدت تک تو ایک اٹل حقیقت اور مسلمہ قانون مانا جاتا ہے۔ مگر بعد میں آنے والے سائنس دان اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ مگر الہامی اور قرآنی قوانین وہ قوانین ہیں جن کی صداقت، عظمت اور ابدیت میں وقت کی رفتار اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یقین محکم سے محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کلیہ بقائے مادہ، آئن سٹائن اور ڈالٹن اٹامک تھیوریز اور جدید ترین ایٹمی نظریات سے وہ الہامی صداقت اور قرآنی قانون کس قدر اعلیٰ وارفع ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ لیتے یاد کرتے ہیں۔ آسمان اور زمین میں موجود اشیاء کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تو نے کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی۔ تیری ذات پاک ہے۔ تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں اے ہمارے رب! تو نے کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی، فرما کر ہر دور میں جنم لینے والے کیمیا دانوں، جغرافیہ دانوں، ماہرین نباتات، ماہرین علم حیوانات، ماہر طبعیات اور دیگر تمام تر سائنسی علوم کے ماہرین کے لیے تحقیق و تدقیق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ آج سے ایک صدی پیشتر اگر کوئی شخص کہتا کہ مادہ کے حقیر ترین ذرے یعنی ایٹم میں ایک مربوط اور منظم نظام کام کر رہا ہے تو اسے اس ایک صدی پہلے کے لوگ احمق خیال کرتے۔ مگر خالق حقیقی نے اسی حقیقت کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ عرب بدو بھی ماننے پر مجبور ہو گئے اور موجودہ دور میں جنم لینے والا انسان تو اس حقیقت سے انحراف کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ دنیا کا حقیر ترین ذرہ ''ایٹم'' اپنے اندر ''پروٹان، نیوٹران اور الیکٹران کا ایک وسیع نظام لیے ہوئے ہے۔ اسے اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ ایٹم کو توانائی میں تبدیل کرنے سے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے گنجان آباد شہر تباہ و برباد ہو سکتے ہیں۔ یہ تو وہ معلومات ہیں جو عام انسان بھی حاصل کر چکا ہے جب کہ سائنسدان نت۔ نئے تجربات کر رہے ہیں جن کے نتیجے میں حیران کن ایجادات ہو رہی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ایٹم کے متعلق ان حاصل کردہ معلومات

سے کہیں زیادہ حیران کن اطلاعات حاصل ہوں۔ اور یہی سائنسی انکشافات ہیں جو اس حقیقت کو ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ خداوند کریم نے دنیا میں کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی۔ ایٹم تو کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جس کے متعلق ابھی انسانوں کی معلومات ناکافی ہیں۔ اس صورت حال میں انسان کائنات اور اس میں موجود بڑے بڑے نظاموں کی عظمت، زمین اور آسمان میں موجود اشیاء کی تخلیق کے بارے میں سوچ کر خالق حقیقی کی حمد وثنا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوں جوں سائنس ترقی کی منازل طے کرے گی۔ حقائق کو بے نقاب کرے گی۔ اسی قدر انسان کا یقین محکم ہوتا جائے گا اور اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ واقعی دنیا میں خداوند کریم نے کوئی چیز بھی عبث پیدا نہیں کی۔

یہ امتیاز صرف اور صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ اس میں بیان کردہ قوانین، نظریات اور اصول ہر دور، ہر ذہن اور ہر مکتبہ فکر کے لیے ہدایت ہیں۔ قرآنی آیات کی اہمیت، افادیت اور عظمت واضح سے واضح تر ہوتی جائے گی۔ جب تک انسان کائنات کے تمام سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا رہے گا۔ جب اس کی بینا نظر قرآن مجید میں موجود اور پنہاں موتیوں کی شناخت کرے گی۔ کارواں رواں دواں ہے مگر ابھی آغاز سفر ہے۔ جوں جوں فاصلہ طے ہو رہا ہے سفر طویل ہو رہا ہے۔ تسخیر قمر کے بعد ہی انسان کو سیاروں، ستاروں اور کہکشاؤں کے فاصلوں کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوا۔ ان فاصلوں کو ماپنے کے لیے اس نے نوری سال کی ثانی دریافت کی جو ۱۸۶۰۰۰×۶۰×۶۰×۲۴×۳۶۵ کے برابر ہے۔ ان تمام تر سائنسی انکشافات اور ایجادات نے ہی ہمیں خبردار کیا ہے کہ سنبھل جاؤ! ابھی آغاز سفر ہے۔ قافلہ رواں دواں ہے۔ اختتام کا انتہا کا تصور ایک حسین خواب ہے۔ سائنس نے آج ہمیں جن تصورات، تغیرات اور ایجادات کا علم دیا ہے وہ حقائق اور نظریات تو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن مجید بدرجہ اتم اور بطریق احسن پیش کر چکا ہے۔ اگر کوئی نظر ان رموز تک نہیں پہنچ سکتی تو بینائی کی کمی ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

اگر چمگادڑ کو دن میں کچھ نظر نہ آئے تو اس میں سورج کا کیا قصور؟

دنیا کی ہر کتاب اس خطرے میں مبتلا ہے کہ کس وقت سائنس دانوں کی تازہ ترین معلومات اور تجربات اس میں پیش کردہ نظریات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیں؟ دنیا میں صرف ''الکتاب'' ہی ہے جو سائنسدانوں کے تازہ ترین تجربات، مشاہدات اور معلومات کے انتظار میں ہے کہ کس وقت انسانی ذہن خود تجربہ ومشاہدہ کر کے اس میں موجود قوانین ونظریات کی حقانیت اور

کاش! کہ آج بھی انسان اس حقیقت کا اعتراف کر لے کہ قرآن مجید نہ صرف اخلاقی، مذہبی اور روحانی علوم پر بحث کرتا ہے بلکہ تمام قسم کے علوم جن میں سائنسی علوم شامل ہیں کے لیے بہتر سے بہتر مواد مہیا کر کے اس کے لیے تعلیم، تحقیق و تدقیق اور جستجو کے دروازے کھول دیتا ہے۔

قرآن مجید کے غائر مطالعہ کے بعد ''ایمرسن'' کا افلاطون کی تصنیف ''جمہوریت'' کے بارے میں یہ کہنا کہ ''دنیا کے تمام کتب خانوں کو جلا دو۔ کیونکہ ان کے اندر جتنی کام کی باتیں ہیں وہ صرف ایک کتاب (جمہوریت) میں موجود ہیں۔ مہمل اور احمقانہ فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ فقرہ پڑھے لکھے جہلا کے لیے ایک ضرب المثل ہی کیوں نہ بن چکا ہو۔

تمام اقوام اور خصوصاً مسلمان قوم کے لیے مادی اور غیر مادی ترقی کا صرف اور صرف ایک راستہ ہے کہ اس کے افراد تمام ممکنہ علوم حاصل کریں مگر مرکزیت صرف قرآن مجید ہی کو حاصل ہو۔

صداقت سے واقف ہو؟

اگر قرآن مجید "ایٹم" کے متعلق ہی صرف معلومات مہیا کرتا تو کیمیا دانوں کی ذہنی تشفی کا سامان تو ضرور ہوتا مگر بیسویں صدی اور بعد میں آنے والے ماہرین نباتات کے لیے اعتراض کا یہ پہلو ضرور نکل آتا کہ قرآن میں "سیل" Cell جو ہر زندہ جسم کی اکائی ہے، کے متعلق کچھ معلومات نہیں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اتنا فرما دیا کہ:۔

"اے ہمارے رب! تو نے کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی۔"

کسی بھی انسان کے لیے خواہ وہ علم نباتات کا ماہر ہو یا کیمیا دان۔ اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یا تو اس کیمیا دان کو ہو سکتا ہے جس نے ایٹم کے اندر موجود پروٹانوں، نیوٹرانوں، الیکٹرانوں اور ایٹم کے دیگر اجزاء پر مشتمل نظام کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ یا اس کی عظمت و صداقت کا احساس اس ماہر علم نباتات و حیوانات (ماہر حیاتیات) کو ہو سکتا ہے جس نے حیاتیاتی خلیہ اور اس میں موجود نیوکلس، پروٹو پلازم، سائٹو پلازم، اور دیوار خلیہ اور دیگر اجزائے خلیہ کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہو۔ اگر کیمیا دان ایٹم اور ماہر حیاتیات خلیے کے بارے میں جس وقت غور کر رہے ہوں اور اول الذکر کو بے جان جسم کی اکائی اور موخر الذکر کو جاندار جسم کی اکائی خلیہ ایک کارخانہ قدرت نظر آ رہا ہو تو ہر دو خالق حقیقی کی حمد و ثنا اور تسبیح و استغفار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے بشرطیکہ ان کو تقویٰ کی نعمت حاصل ہو۔ بایں ہمہ یہ انسانی ذہن کے ابتدائی مراحل ہیں اور اب یہ سائنسی علوم اس قدر ترقی کر رہے ہیں کہ ایک دن آج کی کہی ہوئی بات بالکل اسی طرح افسانہ معلوم ہو گی جس طرح کل کی بات کا آج ہم مذاق اڑاتے ہیں تا معلوم آج ہمیں چاند میں بڑھیا نظر کیوں نہیں آتی جو ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں چرخہ کاتا کرتی تھی۔ لیکن یہ بات آج بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جوں جوں ایٹم، سیل اور دیگر مادی و غیر مادی اشیاء، موضوعات کے متعلق تحقیقات اور تجربات کا دائرہ وسیع ہو گا اسی قدر انسان کو اس حقیقت کا زیادہ پختگی اور یقین محکم سے اعتراف کرنا پڑے گا کہ واقعی خداوند عزوجل نے کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی۔

دنیا کی ہر کتاب کا ایک خاص دائرہ کار ہے اور وہ اپنے مخصوص دائرے سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کہہ سکتی۔ اگر وہ نباتات سے متعلق لکھی گئی ہے تو اس میں علم کیمیا مفقود ہے۔ اگر علم کیمیا سے بحث کرتی ہے تو علم نباتات کے بارے میں خاموش ہے۔ گویا دنیا کی ہر کتاب ایک مخصوص اور محدود دائرہ کار رکھتی ہے لیکن قرآن مجید کے اس فرمان کو کسی بھی کتاب خواہ وہ نباتات سے متعلق ہو یا حیوانات سے، علم کیمیا سے متعلق ہو یا علم طبیعیات سے۔ کا موضوع بنایا جا سکتا ہے اور تحقیق کا کام کیا جا سکتا ہے۔

کاش! کہ آج بھی انسان اس حقیقت کا اعتراف کر لے کہ قرآن مجید نہ صرف اخلاقی، مذہبی اور روحانی علوم پر بحث کرتا ہے بلکہ تمام قسم کے علوم جن میں سائنسی علوم شامل ہیں کے لیے بہتر سے بہتر مواد مہیا کر کے اس کے لیے تعلیم، تحقیق و تدقیق اور جستجو کے دروازے کھول دیتا ہے۔
قرآن مجید کے غائر مطالعہ کے بعد ''ایمرسن'' کا افلاطون کی تصنیف ''جمہوریت'' کے بارے میں یہ کہنا کہ ''دنیا کے تمام کتب خانوں کو جلا دو۔ کیونکہ ان کے اندر جتنی کام کی باتیں ہیں وہ صرف ایک کتاب (جمہوریت) میں موجود ہیں۔ مہمل اور احمقانہ فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ فقرہ پڑھے لکھے جہلا کے لیے ایک ضرب المثل ہی کیوں نہ بن چکا ہو۔
تمام اقوام اور خصوصاً مسلمان قوم کے لیے مادی اور غیر مادی ترقی کا صرف اور صرف ایک راستہ ہے کہ اس کے افراد تمام ممکنہ علوم حاصل کریں مگر مرکزیت صرف قرآن مجید ہی کو حاصل ہو۔

کاش! کہ آج بھی انسان اس حقیقت کا اعتراف کر لے کہ قرآن مجید نہ صرف اخلاقی، مذہبی اور روحانی علوم پر بحث کرتا ہے بلکہ تمام قسم کے علوم جن میں سائنسی علوم شامل ہیں کے لیے بہتر سے بہتر مواد مہیا کر کے اس کے لیے تعلیم، تحقیق وتدقیق اور جستجو کے دروازے کھول دیتا ہے۔

قرآن مجید کے غائر مطالعہ کے بعد ''ایمرسن'' کا افلاطون کی تصنیف ''جمہوریت'' کے بارے میں یہ کہنا کہ ''دنیا کے تمام کتب خانوں کو جلا دو۔ کیونکہ ان کے اندر جتنی کام کی باتیں ہیں وہ صرف ایک کتاب (جمہوریت) میں موجود ہیں۔ مہمل اور احمقانہ فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ فقرہ پڑھے لکھے جہلا کے لیے ایک ضرب المثل ہی کیوں نہ بن چکا ہو۔

تمام اقوام اور خصوصاً مسلمان قوم کے لیے مادی اور غیر مادی ترقی کا صرف اور صرف ایک راستہ ہے کہ اس کے افراد تمام ممکنہ علوم حاصل کریں مگر مرکزیت صرف قرآن مجید ہی کو حاصل ہو۔

قرآن۔ سائنس اور سائنسی تعلیم

ڈاکٹر عبدالبصیر پال، شعبہ طبیعیات، پنجاب یونیورسٹی

اس موضوع پر سیارہ ڈائجسٹ نے اپنے قرآن نمبر کے لیے ایک تحریری مذاکرہ کے لیے متعدد اصحاب سے ایک سوالنامے کے ذریعے یہ دریافت کیا کہ قرآن ایک سائنس دان (خصوصاً مسلم) کو کیا رہنمائی دیتا ہے دوسرے یہ کہ قرآن کی تعلیم کو سائنسی نصابیات میں متناسب طریقے سے کیونکر سمویا جاسکتا ہے؟ اس مذاکرہ کے جواب میں موصول ہونے والے جوابات سیارہ ڈائجسٹ کے شکریہ کے ساتھ شامل کررہے ہیں۔

قرآن مجید ایک روحانی کتاب ہے، جسے سائنس سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں، لیکن چونکہ یہ پاک کتاب اللہ تعالیٰ کا ''کلام'' ہے اور کائنات اس کا ''فعل'' ہے اس لیے اس کتاب کے پڑھنے سے ہمیں قدرتی مظاہر میں ایک باقاعدگی نظر آتی ہے اور بعض بعض کو سائنس دانوں نے بڑی کاوش کے بعد دریافت کیا ہے۔ ان اشاروں سے سائنس دان استفادہ کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

(ا) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝

(سورۃ الاعلیٰ آیات ا۔۳)

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِن فُطُورٍ

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قدرت کا نظام کامل ہے اور اس میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں پائی جاتی۔

(ب) سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ

اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ

(سورۃ یٰسین۔آیت ۳۶)

یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نراور مادہ نہ صرف انسانوں اور پودوں میں بلکہ ان چیزوں بھی پائے جاتے ہیں جن کا علم ہمیں نہیں ہے۔اگر چہ پرانے زمانے میں پودوں میں نر اور مادہ کی موجودگی ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی لیکن سائنس نے اب حقیقت کی تصدیق کر دی ہے۔

(ج) ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُO اَمْ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ

(سورۃ الملک آیات ۱۶، ۱۷)

ان آیات میں دو قسم کی آفتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایک قسم کی آفتیں وہ ہیں جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں، مثلاً زلزلے، طوفان وغیرہ، دوسری قسم کی آفتیں وہ ہیں جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں، مثلاً بجلی کا گرنا، فضائی تحقیق سے بہت سی دیگر آسمانی بلاؤں کا بھی پتہ چلا ہے۔جن کا ہمیں پہلے علم نہ تھا۔مثلاً سورج سے بڑے تیز رفتار اور برقائے ہوئے ذرے خارج ہوتے رہتے ہیں۔یہ ذرے بے حد خطرناک ہوتے ہیں، جن سے بچنے کے لیے خلائی سفر کرنے والے مناسب حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔جب یہ ذرے ہماری زمین کی طرف آتے ہیں تو ان پر زمین کی مقناطیسی قوت عمل کرتی ہے۔جس کی وجہ سے یہ ذرات زمین کے قطبوں کے درمیان ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں اور ہم ان سے محفوظ رہتے ہیں۔یہ ذرے زمین کے گرد بیلٹوں (Belts) کی صورت میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بیلٹ مثبت ذروں کی ہوتی ہے جس کی بلندی تقریباً دو ہزار میل ہے اور دوسری بیلٹ منفی ذروں کی ہوتی ہے جس کی بلندی تقریباً بیس ہزار میل ہے اس طرح خداوند کریم نے اپنی رحمت سے ہمیں ان خطرناک ذروں سے محفوظ رکھا ہے۔ان ذروں کے علاوہ کئی اور خطرناک چیزیں بھی ہماری زمین کی طرف آتی ہیں لیکن کرہ ہوائی Atmosphere انہیں جذب کر لیتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں انسان کو قدرتی مظاہر کے مشاہدہ کے لیے بار بار تاکید کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرتی مظاہر سے خداوند تعالیٰ کی حکمت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے۔سائنسی آلات کی مدد سے قدرت کی وہ باریکیاں بھی منکشف ہو جاتی ہیں جنہیں خالی آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے اس لیے اگر سائنس کے طلبا کو قدرتی عجائب

بتاتے وقت یہ بھی بتایا جائے کہ یہ خداوند تعالیٰ کی حکمت کا مظہر ہیں تو اس سے ان کے دلوں میں اسلام کی عظمت بڑھے گی۔ چنانچہ قرآن کی اصولی تعلیمات کو سائنس کی تعلیم میں سمونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مدرس نہ صرف سائنس جانتا ہو بلکہ اسے قرآنی تعلیمات سے بھی واقفیت ہو اور وہ طلبا کو سائنس کے ساتھ ساتھ قرآنی تعلیمات سے بھی روشناس کراتا رہے۔ مثلاً جب ہم اپنے طلبا کو ایٹم بم ہائیڈروجن بم کی تفصیلات بتاتے ہیں تو اس کے ساتھ انہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے کہ خدائی طاقت کے مقابلے میں یہ ایٹمی ہتھیار ہیچ ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل تفصیلات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

۱۹۰۵ میں جب آئن سٹائن نے اپنا انقلابی نظریہ یعنی نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) پیش کیا تو اس نے بتایا کہ مادے کو فنا کر کے توانائی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایٹم بم میں توانائی کی جو کثیر مقدار پیدا ہوتی ہے۔ وہ اسی اصول کا ایک عملی اطلاق ہے۔ ایٹم بم کی تباہ کاری کا جو قابل افسوس مظاہرہ ہیروشیما اور ناگا ساکی میں ہوا وہ ناقابل فراموش ہے نیز ایٹمی ہتھیاروں کے خطرے نے تمام دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ اگرچہ سائنس دانوں نے ایٹمی توانائی اب دریافت کی ہے لیکن قدرت کے وسیع کارخانے میں ایٹمی توانائی کروڑہا سال سے پیدا ہو رہی ہے۔ سورج اور دیگر ستارے جو کروڑہا سال سے چمک رہے ہیں۔ یہ سب ایٹمی توانائی کا کرشمہ ہے۔ ایک ایٹم بم مادے کے صرف چند تولے فنا ہو کر ایٹمی توانائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن سورج میں محض ایک سیکنڈ میں مادے کے چالیس لاکھ ٹن فنا ہو کر توانائی میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اور یہ عمل کروڑہا سال سے جاری ہے۔ یہی حال دوسرے ستاروں کا ہے۔ رات کو جو ستارے ہمیں نظر آتے ہیں وہ ستاروں کا ایک مقامی گروہ ہے جس میں ستاروں کی تعداد دس ہزار کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ستاروں کے اس مقامی گروہ کو کہکشاں کہتے ہیں۔ لیکن کہکشاں سارا جہاں نہیں۔ فضا کی وسعتوں میں کہکشاں کی طرح ستاروں کے کئی گروہ جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ساری کائنات میں ایسے گروہوں کی تعداد دس ہزار کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ بعض ستارے سورج سے بڑے ہیں اور بعض چھوٹے۔ اگر ہم فرض کریں کہ ایک ستارے میں ایک سیکنڈ میں مادے کے جتنے ٹن توانائی میں تبدیل ہوتے ہیں ان کی اوسط قیمت چالیس لاکھ ہے تو ساری کائنات میں ایک سیکنڈ میں مادے کے جتنے ٹن توانائی میں تبدیل ہوتے ہیں اُن کی قیمت ذیل کے عدد سے ظاہر کی جا سکتی ہے؟

۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

اس عدد ۴ کے ساتھ ۲۸ صفر ہیں اور یہ خالق کائنات کی طاقت کی محض ایک جھلک ہے جسے جدید سائنس نے بے نقاب کیا ہے۔ سائنس دان صرف ظاہری کائنات کا مشاہدہ کر سکتے

ہیں۔توانائی کے دیگر لامحدود غیبی سرچشموں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔
اوپر کے اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ قدرت کی طاقت کے مقابلہ میں ایٹمی ہتھیار ہیچ ہیں۔

ڈاکٹر ایم اے قاضی۔زرعی یونیورسٹی فیصل آباد

قرآن کریم میں نہ تو ریاضی کا کوئی کلیہ درج ہے اور نہ سائنس کا کوئی اصطلاحی فارمولا۔اس نقطہ نظر سے قرآن نہ ریاضی کی کتاب ہے اور نہ سائنس کی۔ بایں ہمہ قرآن علم و حکمت کا سرچشمہ ہے کیونکہ اس بزرگ و برتر کتاب میں قوانین فطرت کو سمجھنے اور ان پر غور و تدبر کرنے کی ہدایت بار بار فرمائی گئی ہے۔چونکہ غور و تدبر ہی تمام علوم وفنون اور دانش وحکمت کا منبع ہے اس لیے قرآن بجا طور پر قرآن حکیم کہلاتا ہے۔ جب یہ نسخہ کیمیا عرب کے ''اُمیوں'' کے ہاتھ لگا تو انہوں نے علم کی مشعل یونانیوں کے ہاتھ سے لے کر اس کو مزید منور کیا اور ایران اور ہندوستان وغیرہ کے علمی وادبی خزائن سمیٹ لیے۔پھر جب تک وہ اس نسخہ کیمیا کو استعمال کرتے رہے ان کے ہاتھ سے علم وحکمت کو بھی نمایاں فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس کے برعکس دوسری قوموں میں علم وحکمت کی تحریک ان کے مذاہب کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ بعض حالات میں تو ان کے مذہبی رہنماؤں نے سائنس دانوں کو خوفناک اذیتیں بھی دیں۔ گیلی لیو نے جب یہ کہا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو پادریوں نے اس بنا پر اسے لا مذہب قرار دے کر جیل میں ڈال دیا تھا۔پس تاریخ شاہد ہے کہ قرآن ہی واحد ایسی دینی کتاب ہے جس نے اپنے پیروؤں کو علم اور سائنس کی راہ پر ڈالا۔

سائنس کی مصنوعات کو استعمال کرنے کے متعلق بھی قرآن کی راہنمائی باقی سب مذاہب یا فلسفوں سے مختلف ہے۔ چاہے حالت جنگ ہو یا دور امن ،قومی سطح پر دیکھا جائے یا انفرادی سطح پر قرآن فلاح انسانیت کو مقصود بناتا ہے۔خصوصیت سے یہ دیکھیں کہ موجودہ دور کی جنگوں میں سائنس کی مدد سے بنے ہوئے مہلک ہتھیار شہری آبادیوں کو آن واحد میں فنا کر ڈالتے ہیں۔مگر اسلامی جنگوں کے لیے قرآن کا حکم صریح ہر زمان ومکان کے لیے یہ ہے کہ نہ تو بوڑھے اور معذور قتل ہوں، نہ عورتیں اور بچے۔ نیز ایسے لوگوں کو جنگی کارروائی کی زد سے مستثنیٰ رکھا جائے جو دوسرے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کر صرف مذہبی مناصب پر ہوں یا گوشتہ راہب!

قومی اور معاشرتی سطح پر سائنس کی ایجادات کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ یہ نظام اگر قرآن کی رہنمائی میں چلایا جائے تو بنی نوع انسان کے لیے عین رحمت بن جاتا ہے۔نہ تو سرمایہ داروں یا کارخانہ داروں کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ غریبوں اور

مزدوروں کا خون چوس لیں اور نہ مظلوم مزدوروں کو ضرورت پڑتی ہے کہ بے دلی سے کام کر کے قومی دولت میں اضافے کی رفتار کی کمی کا باعث بنیں، نیز موقع ملنے پر انتقامی جذبات کو بروئے کار لا کر سرمایہ دار کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے نظام صنعت و پیداآوری کو تہس نہس کر ڈالیں۔

انفرادی زندگی میں قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے والا سائنس دان جوں جوں قوانین فطرت کی گہرائیوں کو سمجھتا جائے گا اتنا ہی اس کا ایمان پختہ ہوتا چلا جائے گا۔

راقم ریاضی کا طالب علم ہے اور تمام عمر انجینئرنگ اور انڈسٹری میں ریاضی کے اطلاق و استعمال پر تحقیق و تدریس میں گزری ہے۔ لہٰذا تفصیلی تاثرات جو نیچے بیان کئے جا رہے ہیں وہ ریاضی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہیں۔ تاہم چونکہ موجودہ سائنس کے تمام علوم کا انحصار تمامتر ریاضی پر ہی ہے اس لیے کسی نہ کسی حد تک یہ تاثرات تمام سائنسی مضامین کی ترجمانی بھی کر سکیں گے۔

علم ریاضی کی بنیاد میں مندرجہ ذیل اجزاء شامل ہیں۔

(ا) اساسی طور پر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمارے ذہن میں کچھ بنیادی تصورات رکھ دیے ہیں۔ مثلاً عدد کا تصور، نقطے اور خط کا تصور، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اشیاء کے نام ہیں جن کی تعریف (Definition) نہیں کی جاسکتی مگر وجدانی طور پر ان کا تصور ہمارے اندر موجود ہے۔ وقت، فاصلہ، قوت وغیرہ بھی اسی قسم کے اسماء ہیں جو وجدانی تصور کے راستے ہمیں ملے ہیں۔ اشیاء کے علاوہ کچھ بنیادی تصورات ایسے بھی ہیں جو زبان کے عام استعمال سے متعلق ہیں جیسے چھوٹا۔ بڑا۔ نیچے۔ اُوپر وغیرہ۔

(ب) ریاضی کے بنیادی اجزاء کی دوسری قسم کو مسلمات یا بدیہیات کہتے ہیں۔ ان سے مراد موجودات سے متعلق بعض ایسے حقائق ہیں جن کو ہم بغیر ثبوت تسلیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دو مختلف نقاط سے ایک اور صرف ایک خط متعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسے میں نے اس لیے تسلیم کر لیا ہے کہ جن اشیاء کو میں نے نقاط یا خطوط مانا تھا ان کے بغور دیکھنے سے مجھے ایسا لگا کہ ان میں اوپر لکھی ہوئی خاصیت پائی جاتی ہے اور مجھ سے پہلے تمام یا بے شمار لوگوں کو بھی ایسا ہی دکھائی دیا تھا مگر ایسا دکھائی دینا

خالص سائنسی معیار پر ثبوت نہیں بن سکتا۔

اس سلسلے میں مجھے یاد آتا ہے کہ ''علم آدما لاسماء'' کی تفسیر میں رازیؒ نے ''اسماء'' سے مراد حقائق الاشیاء کا علم لیا ہے۔ بیضاوی کے نزدیک ''الاسما'' سے مراد الفاظ یا صفات ہیں جن مدرکات، معقولات، محسوسات، مخیلات اور موہومات کا ادراک شامل ہے۔

اسماء بنیادی طور پر تصورات اور چند مسلمات (بلا ثبوت قطعی) یا ایسے مسلمات کے ایک مجموعے SET سے فکر کا آغاز کر کے ہم اُس عقل کی مدد سے جو قدرت نے ہم کو عطا کی ہے، ریاضی کا ایک نظام یا ڈھانچہ Structure تیار کرتے ہیں۔ یہ وہ نتائج ہوتے ہیں جو ہمیں منطقی طور پر ملتے ہیں۔ اگر یہ نتائج ہماری زندگی یا زندگی کے کسی شعبے پر پورے اُترتے ہیں اور یوں عملی طور پر 'درست' ثابت ہوتے ہیں تو ہم ایسی ریاضی یا ایسی سائنس کو سیکھتے ہیں، اس کے استعمال سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے دیئے ہوئے اندازوں اور تخمینوں کے مطابق مستقبل کے لیے لائحہ عمل بناتے ہیں۔

ریاضی کے طالب علم کے لیے ''ایمان بالغیب'' کی تفسیر بھی اسی میں ہے اور ریاضی کے راستے پر اس طرح کے ایمان بالغیب کے بغیر ایک قدم بھی نہیں بڑھایا جا سکتا۔ دُنیا میں جتنے مذاہب یا ادیان یا مسالک آئے ہیں ان میں سے ہر ایک نے ''مسلمات'' کا ایک مجموعہ یا سیٹ پیش کیا ہے جس پر اس کے پیرو ایمان بالغیب لائیں اور اس کو اپنے لیے ضابطہ حیات کی بنیاد بنائیں۔ انہی میں سے ایک ضابطہ حیات قرآن کا پیش کردہ بھی ہے اور اس کے بھی مسلمات و دیہیات ہیں۔ قرآن اول قدم ہی اپنے مخاطب سے مطالبہ کرتا ہے کہ پہلے ان مسلمات پر ایمان لاؤ، اور ان پر قائم شدہ ضابطہ حیات کو اختیار کر کے خود دیکھ لو کہ بنی نوع انسان کے لیے فلاح و بہبود کے دروازے کس طرح کھلتے ہیں۔ اگر ایمان نہیں لاتے تو پھر اس کے مقابلے کا ضابطہ حیات پیش کرو۔ ''فاتوا بسورۃ من مثلہ''۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ ہر وہ نظام جس کے مسلمات قرآن سے اخذ نہ کئے گئے ہوں، دنیا میں فتنہ وفساد لاتا ہے۔ کہیں رنگ ونسل کی برتری مصیبت کا باعث ہے، کہیں جغرافیائی حدود وجہ تصادم ہیں، کہیں طاقت اس کے ہاتھ میں دے دی گئی جس کے ہاتھ میں سرمایہ اور وسائل ہیں، اور کہیں سب اختیار انسان کے ہاتھ سے چھین کر مشین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امن عالم غارت ہو کر رہ گیا ہے اور جنگ، انقلاب اور تشدد کے ہاتھوں لہلہاتی کھیتیاں ویران ہوتی ہیں، شہر کے شہر کھنڈر بن جاتے ہیں، اور انسان تباہی، خوف، بے بسی اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور نکتہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ریاضی میں مسلمات کو بنیادی تسلیم

کیا جاتا ہے جو چند ضروری شرائط پوری کر دیں۔ ان شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمات میں سے کوئی دو اصول ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں اور نہ ایسے نتائج برآمد کریں جو ایک دوسرے کی ضد ثابت ہو جائیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ معاشرے میں ایسے افراد کبھی کبھار نظر آ جاتے ہیں جن کے ایمان و کردار میں متضاد اصول شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسے حکومتی کارکن جو رشوت بھی لیتے ہیں اور علی الصبح تہجد کے بعد وظائف کا دور بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں یا ایسے تاجر جو سمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ بھی کرتے ہیں اور حج پر بھی ہو آتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں جو ان اختیارات کو جو قوم نے امانت کے طور پر ان کے سپرد کئے ہوں اپنی ذاتی صنعت، جائیدادیں بنانے اور کنبہ قبیلہ کی پرورش میں استعمال کرتے ہیں۔ خود اپنے معاشرے میں بھی آپ کو اس طرح کے عناصر ملیں گے جو قومی امانت میں خیانت کرتے ہوں اور پھر بھی اپنی ہر تقریر خدا، رسول اور قرآن کے فرمودات سے شروع کرتے ہیں۔ اور شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دونوں قسم کے عمل اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ریاضی کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم میں جس نے ریاضی کی روح کو اپنے اندر جذب کیا ہو، آپ ایسا تضاد نہیں پائیں گے۔ وہ "چنان کن یا چنیں" کا قائل تو بے شک ہوگا مگر اس کے عمل میں ایسی دو صورتیں نہیں پائی جائیں گی جو ایک دوسری کی ضد ہوں۔

آپ کا دوسرا سوال کہ ریاضی و سائنس کے نصاب میں قرآنی تعلیمات کو کس طرح سمو یا جائے بڑی اہمیت کا حامل اور توجہ کا طالب ہے۔

بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ طالب علم پر یہ تاثر قائم رہے کہ سائنس کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ ایک مذہبی فریضہ ادا کر رہا ہے، قرآن کے احکامات پر عمل کر رہا ہے، حدیث نبویؐ کی پیروی کر رہا ہے۔ بزرگان سلف کی لکھی ہوئی کتابیں، چاہے وہ طب پر ہوں یا علم ہندسہ پر ہمیشہ خدائے بزرگ و برتر کے اسم مبارک سے شروع کی جاتی تھیں اور ان کے دیباچوں میں حمد و ثنا اور درود و سلام اور خدا سے حصول جزا کی دعایں شامل ہوتی تھیں۔ اسی نام اور جذبے کی برکت یہ تاثر پیدا کر دیتی تھی جس کی ضرورت اوپر بیان کی گئی ہے۔ سائنس کی نصابی کتابوں کے دیباچوں میں بھی بہت کچھ وضاحت کی جا سکتی ہے۔ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ سائنس کا مقصد قوانین فطرت یا قوانین الٰہی کا کھوج لگانا ہے۔ قدرت نے انسان میں جتنی دسترس فطرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کی رکھی ہے اس حد تک اس میدان میں کوشش کرنا عین عبادت ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدرت کی عطا کردہ عقل و علم کو منشائے الٰہی، اور صرف منشائے الٰہی کے مطابق استعمال کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ منشائے الٰہی کو سمجھنے کے لیے ہمیں سائنس کے علاوہ دوسرے علوم مثلاً قرآن، حدیث، اخلاقیات وغیرہ بھی سیکھنے چاہئیں۔ اس کے بغیر ایک مسلم سائنس دان کے ذہن و کردار کی صحیح تشکیل و تکمیل

نہیں ہو سکتی۔ ہمارے گذشتہ دور ترقی کے تمام مسلمان سائنسدان اور اطبا بالعموم علم دین اور اخلاق اسلامی سے ہی آراستہ ہوتے تھے۔

سائنس کے نفس مضمون میں قرآن سے تصریحات پیش کرنے کا مسئلہ زیادہ سنجیدگی سے غور طلب ہے۔ قرآن کا طالب علم سائنس کے کئی موضوعات کے متعلق مطالعہ قرآن کے دوران میں اشارات پائے گا۔ مثال کے طور پر سورۂ رحمٰن میں کہاں سورج اور چاند کا ذکر آیا ہے 'وضع المیزان' کا ذکر بھی ہے۔ میکانک (Mechanism) کے طالب علم کے لیے توازن حرکی (Dyanmical Equilibrium) ایک اہم موضوع ہے۔ ایسی تفسیریں موجود ہیں جن میں 'المیزان' سے مراد وہ توازن حرکی (Dynamical Equlibrium) لیا گیا ہے جو متحرک اجرام فلکی کے کسی نظام میں پایا جاتا ہے۔ اس صدی کو شروع شروع میں ہی ''سائنس کی صدی'' کا نام دے دیا گیا تھا۔ اسی لیے اس عہد میں قرآن کی ایسی تفسیریں بھی لکھی گئیں جن میں کوشش کی گئی کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ثابت کیے جائیں۔

ڈارون کے نظریہ ارتقا کا ثبوت بعض مسلمانوں نے قرآن سے پیش کرنے کی کوشش کی ...... ایسے ہی جیسے بعض عیسائیوں نے اپنی انجیل سے اس نظریہ کی حمایت تلاش کی تھی۔ بہت عرصہ نہیں گزرا۔ مصر کے علامہ طنطاوی جوہری نے ایک تفسیر لکھی تھی جو تقریباً تمام کی تمام سائنس کی زبان میں تھی۔ راقم اس بارے میں کوئی رائے پیش کرنے کا اہل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تفسیر کا معاملہ ہے اور اس وادی میں قدم رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر کوئی صاحب بصیرت قرآن کے ان حصوں کو مضمون وار یکجا جمع کر دیں جو مختلف علوم مثلاً ریاضی، فلکیات، طبیعیات، کیمیا، نباتات، زراعت وغیرہ سے متعلق ہوں تو بڑی خدمت ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس قسم کی کاوش پہلے سے موجود ہو مگر راقم کی نظر سے نہیں گزری۔

نصاب کے علاوہ تین سوال اور بھی ہیں جو نظام تعلیم بلکہ پوری قومی زندگی و بقا کے لیے نہایت اہم ہیں۔ ان کے لیے بھی قرآن سے رہنمائی تلاش کرنا نہایت ضروری ہو چکا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کا عام ماحول کیسا ہو۔ قرون رفتہ سے بلاد اسلامیہ میں بڑی بڑی مسجدوں کے لیے ''الجامعہ'' کا لفظ رائج چلا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بڑے تعلیمی اداروں کے لیے بھی اسی لفظ کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ تعلیمی اداروں کو ویسا ہی تقدس حاصل ہونا چاہیے جو مساجد کو ہے اور اس قسم کے احساس تقدس کو پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کی فضا کو ایک مخصوص رنگ دینا ضروری ہے۔ عیسائی دنیا کی بیشتر یونیورسٹیوں میں اب تک یہ دستور ہے کہ ان کے گرجوں کی عمارتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ علم کے سوتے گویا ان کے مذہب سے پھوٹ رہے

ہیں۔ ان کی بعض یونیورسٹیوں میں تو اجلاس تقسیم اسناد (Convocation) میں اب تک یہی شکل پیش کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی بڑی اہم مذہبی رسم (Ritual) ادا کی جا رہی ہو۔

دوسرا سوال استاد کی شخصیت کا ہے۔ طلباء کے لیے استاد کی ذات عموماً ایسا نمونہ ہوتی ہے جس کی وہ پیروی کرنا چاہتے ہیں یا بغیر چاہے اس سے اثر لیتے ہیں۔ لہٰذا استاد کی وضع قطع، اس کا لباس اور سب سے اہم یہ کہ اس کا کردار، قرآن کی روح کے مطابق ہوگا، تب ہی نصاب میں قرآن کی روح شامل ہو سکے گی۔

تیسرا سوال امتحانات کا نظام اور طلبا کی جانچ کا ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں امتحانوں کے کمروں کے اندر ہونے والی بدعنوانیاں اور پھر امتحانی پرچوں کو جانچنے میں جو خامیاں منظر عام پر آ رہی ہیں ان کے پیش نظر قرآن سے اس سوال کا جواب تلاش کرنا بے انتہا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کا جواب تو بڑا عیاں ہے۔ مگر راقم نے دیکھا ہے کہ خود تعلیم و تعلم سے تعلق رکھنے والے بزرگوں میں بھی ایسے صاحب علم و دانش موجود ہیں جو امتحانی پرچوں میں سفارش سے نمبر بڑھوانے کے لیے دوسروں کی مدد اور نیکی سمجھتے ہیں۔ خود میں نے ایک متشرع اور متدین بزرگ کا رقعہ دیکھا تھا جس میں لکھا تھا "میرے بیٹے ...... کے نمبر بڑھوا کر عنداللہ ماجور ہوں۔" اب اگر اس طرح کی مدد کا اجر اللہ کے ہاں موجود ہے تو چند ایسے سر پھرے جو اپنے ہاتھ میں ایسا اختیار رکھتے ہوئے بھی امتحانی پرچوں کو معیار کے ترازو میں تول کر ہی جانچتے ہیں اور سختی سے اس پر کاربند ہیں، کہیں میں تول کر ہی جانچتے ہیں اور سختی سے اس پر کاربند ہیں، کہیں اندھیرے میں بھی تو نہیں کہ خوانخواہ ہر سال اپنی کمائی میں دو چار پرانے دوستوں کا ضیاع اور دو چار نئے دشمنوں کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر آپ کا ادارہ ایک علیحدہ تفصیلی مذاکرے کا انتظام کرائے۔

جناب مختار چوہدری۔ ایٹمی توانائی کمیشن لیبارٹری لاہور

آپ کے خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ تذبذب میں رہا کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ نہ تو سائنسدان پائے کا اور قرآن کی تعلیم بھی ناکافی۔ اپنی کم مائیگی پر بہت شرمسار ہوں خیر جواب حاضر ہیں:

(۱) اِس دور کی سائنسی ترقی کا جہاں تک تعلق ہے، میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کوئی سائنسدان قرآن کو اپنا راہنما سمجھتا ہو۔ یہ میرے علم میں نہیں۔

جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے، میں قرآن سے راہنمائی ضرور حاصل کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ قرآن میں بہت سی حقیقتیں مضمر ہیں۔ اور عملی زندگی کی تگ ودو میں مددگار ہوسکتا ہے اور ہے بھی۔ مگر تجربہ سے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہمارے سائنسدان تو کیا بڑے بڑے تعلیم دان بھی اس طرف دھیان نہیں دیتے۔ دیں بھی کیوں۔ گردش دوراں نے اس کا موقع چھوڑا ہی کہاں ہے۔

اِس سلسلے میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں۔ آج سے چند سال پہلے میں اناج کو محفوظ کرنے کے مختلف طریقوں پر تحقیقات کر رہا تھا اور پچھلے وقتوں میں اناج محفوظ رکھنے سے متعلق کوئی بھی لٹریچر دستیاب نہ ہوسکا۔ اس ضمن میں ایک دوست (ملک مہتاب علی) کی وساطت سے سورہ یوسف میں گندم کے خوشوں کو سات سال تک محفوظ رکھنے کا طریقہ بہت ہی مددگار ثابت ہوا۔ مزید مطالعہ سے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں اس کی آیت کو بھی رقم کیا۔ میرا خیال ہے قرآن میں بہت سی ایسی نشانیاں اور اشارے موجود ہیں جن سے آج کا سائنس دان مدد لے سکتا ہے۔ پھر ایک سائنس دان کو اپنی تحقیقات کے دوران کئی اقسام کی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قرآن سکون قلب۔ تقویٰ۔ قناعت ایسی نعمتیں مہیا کر کے اس کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔

(۲) اِس سوال کا جواب قریباً ساری قوم دے سکتی ہے۔ جس آدمی سے پوچھیں (بشرطیکہ اُس کو نصاب کمیٹی کا چیئرمین بنایا جائے) وہ حاضر ہے۔ اور قرآن سے دلچسپی کیسی، کرسی کا حصول اور تحفظ اصل مقصد ہے۔ وجہ نظام تعلیم کی بے عمل روش ہے۔

ایک دفعہ میرے ایک گہرے دوست (ماہر تعلیم) ایک ایسی کمیٹی کے چیئرمین بن گئے اور اسلامیات کو نصاب تعلیم میں شامل کروانے کی سفارشات حکومت کو پیش کردیں۔ میرا اپنا خیال تھا کہ یہ بے عمل اور قرآن سے بے بہرہ ماہر تعلیم کیا سفارشات پیش کرے گا مگر خدا کے فضل سے وہی کتابیں دھڑا دھڑ چھپ کر نصاب کی وساطت سے قوم کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ اندریں حالات اس سوال کا جواب کوئی ماہر تعلیم ہی دے سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ایڈیٹر اسلامک ایجوکیشن

سائنس کائنات کے اُس علم کا نام ہے جو ہمیں مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے

حاصل ہوتا ہے۔ مظاہر قدرت کی تین بڑی قسمیں ہیں۔ مادی مظاہر قدرت۔ حیاتیاتی مظاہر قدرت اور نفسیاتی یا انسانی مظاہر قدرت ہیں۔ تیسری قسم میں انسان کا شعور یا ذہن اور اس سے پیدا ہونے والے انسانی اعمال وافعال شامل ہیں۔

جو چیز سائنس کو ممکن بناتی ہے وہ یہ ہے کہ مظاہر قدرت کے اندر ایک نظم ORDER پایا جاتا ہے جو ہر وقت اور ہر مقام پر یکساں رہتا ہے۔ سائنسدان جو کام کرتا ہے وہ فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات سے اس نظم کو زیادہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دریافت کر کے ضبط تحریر میں لاتا رہتا ہے۔ دراصل سائنسدان کی تحقیق اس شعور پر مبنی ہوتی ہے کہ قدرت کے مظاہر کے اندر ایک ایسا نظم موجود ہے جو کہیں اور کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اگر سائنسی تحقیق کے کسی راستہ پر نظم کو دریافت نہ کیا جا سکے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس راستہ پر مزید سائنسی تحقیق ممکن تھی۔ اگر مظاہر قدرت میں نظم نہ ہوتا تو نہ تو کوئی شخص سائنسدان ہی بن سکتا اور نہ سائنس ہی ممکن ہوتی۔ اب تک قدرت کی مادی سطح پر سائنسدان معلوم کر چکے ہیں کہ نظم ایک جوہر میں، ایک سالمہ میں، ایک کرسٹل میں اور برف کے ایک گالہ میں اور اجرام فلکی میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں نظم اس پوری کائنات کا مستقل کلیہ ہے۔ سائنسی علم دراصل موجودات کے اندرونی نظم کا ہی علم ہے۔ قدرت کے مادی مظاہر میں جو نظم پایا جاتا ہے وہ اس قدر جچا تلا ہے کہ ہم اسے ریاضیات کی اصطلاحات میں بیان کر سکتے ہیں۔ قدرت کے ایسے مظاہر جنہیں ہم نہایت معمول سمجھتے ہیں...... مثلاً ایک بلند عمارت سے گرنے والی کنکری کی بڑھتی ہوئی رفتار یا لوہے کی گرم کی ہوئی سلاخ کے پھیلنے کی مقدار...... یہ سب مظاہر ٹھوس ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہیں جو اس وقت بھی کائنات میں جاری تھے جب کوئی انسانی ماہر ریاضیات بلکہ کوئی شخص بھی دنیا میں موجود نہیں تھا۔ جدید طبعیات کے مطابق مادہ فنا ہو جاتا ہے لیکن جب مادہ فنا ہو جائے تو اس کے بعد مادی مظاہر قدرت کا جو حصہ باقی بچ رہتا ہے وہ محض اُن کی تعمیر کا نقشہ ہے جسے ہم ریاضیاتی فارمولوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظم، مستقل اور غیر متبدل ریاضیاتی نظم ہی مادی مظاہر قدرت کی حقیقت یا اصل ہے۔ یہی نظم وہ چیز ہے جس نے تمام مادی سائنسی علوم کو اور ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ میں اُن کے عملی اطلاق کو ممکن بنایا ہے۔ اگر یہ نظم نہ ہوتا تو سائنس کی ترقی سے جو لاتعداد سہولتیں اور آسائشیں دور حاضر کے انسان کیلئے ممکن ہوئی ہیں اُن میں سے ایک کا بھی وجود نہ ہوتا۔

اب اگر سائنسدان درحقیقت اس کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے تو مظاہر قدرت کا نظم جس کی طرف سائنس بڑے زور سے اُس کی توجہ مبذول کراتی ہے جسے وہ سرسری طور پر دیکھے سمجھے اور پھر نظر انداز کر کے آگے چل دے کہ مجھے اس سے مزید کیا غرض۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم کسی ذہن کی

کارفرمائی کی ایک ایسی معتبر علامت ہے، جس پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ اگر گندم کے کچھ دانے کسی فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو آپ بجا طور پر خیال کریں گے کہ کوئی شخص گندم کی تھیلی لے جارہا تھا اور اُس سے اتفاقاً گر گئے ہیں۔ لیکن اگر وہی گندم کے دانے اُسی فٹ پاتھ پر ایک ریاضیاتی شکل مثلاً ایک باقاعدہ ہشت پہلو نقش کی صورت میں آراستہ ہوں تو کیا آپ کو اس بات پر ذرا سا بھی شک ہوگا کہ یہ نقش کسی ذہن کی پیداوار ہے۔ آپ فوراً سمجھیں گے کہ یہ عمدہ، باقاعدہ اور خوبصورت نقش کسی ہنرکار کے ذہن کی تخلیق ہے۔ بلکہ آپ اس نقش کو دیکھ کر اُس کے خالق کے ذہن کی کئی صفات معلوم کر سکیں گے۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ چونکہ یہ نقش سوچ بچار کو ظاہر کرتا ہے جو زندگی کی علامت ہے۔ لہٰذا اس کا خالق ذہن ایک زندہ شخصیت ہے۔ چونکہ یہ نقش ایک ریاضیاتی شکل رکھتا ہے اور اس میں علم اور حکمت کام آئے ہیں۔ لہٰذا لازماً وہ دانا، علم اور حکم ہے پھر چونکہ نقش کے اندر گندم کے ہر دانہ نے وہ جگہ لے رکھی ہے جو اس ذہن کے سوچے سمجھے ہوئے مقصد یا منصوبہ کے مطابق ہے لہٰذا وہ ایک مقصد رکھ سکتا ہے اور اُس مقصد کے مطابق کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ چونکہ نقش ایک نظم رکھنے کی وجہ سے کشش کرتا ہے اور حسین اور جمیل ہے لہٰذا اس کا خالق حسن اور جمال سے محبت رکھتا ہے اور حسن و جمال کو پیدا کر سکتا ہے۔ چونکہ نقش کا نظم اعتدال ظاہر کرتا ہے لہٰذا اس کا خالق ذہنی عادل ہے۔ پھر آپ کہیں گے کہ اگر نقش کے اندر بعض ناہمواریاں یا بے قاعدگیاں ہوتیں اور وہ کامل نہ ہوتا تو وہ نظم نہ ہوسکتا۔ لہٰذا اس کا خالق کمال سے محبت رکھتا ہے اور چونکہ کمال کا حصول فوری نہیں ہوتا بلکہ تدریج چاہتا ہے۔ لہٰذا تدریجی تکمیل اور تربیت اس کی صفات میں سے ہیں۔ اسی طرح سے زندگی، خالقیت حکمت، قدرت، علم، محبت، جمال، عدل اور ابوبیت کے علاوہ اس ذہن کی اور بہت سی صفات کو بھی آپ ایسے ہی استدلال کے ساتھ معلوم کر سکیں گے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ پوری کائنات میں بھی جہاں کہیں نظم ہوگا وہاں کسی ایسے ذہن کی کارفرمائی موجود ہوگی جو یہی صفات رکھتا ہو۔ گویا نظم ایک آئینہ ہے جس میں نظم کے خالق کی یہ صفات پوری صفائی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہیں۔

نظم کے یہ آشکار اوصاف قدرت کی حیاتیاتی سطح پر اور بھی زیادہ آشکار ہو جاتے ہیں۔

ایک زندہ جسم حیوانی نظم اور ذہنی کارفرمائی اور اس کی متعلقہ صفات کی آشکارائی کا نہایت ہی حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اُس کے تمام اعضاء و جوارح، اُس کے تمام خلیات، اس کی تمام جھلیں اور اُس کے تمام اعضائے رئیسہ ایک مرکزی مدعا کے ماتحت کام کرتے ہیں جو حیوان کا اپنا قائم کیا ہوا نہیں ہوتا۔ حیوان کے اندرونی حیاتیاتی اعمال و وظائف مثلاً ہضم۔ کیلوس۔ کیموس۔ خون۔ گوشت اور ہڈیوں کی ساخت ضروری کیمیاوی مرکبات کی پیداوار۔ وٹامن اور حیاتین کی تیاری، دوران خون

تنفس، تولد اور تناسل، خودکارانہ نشوونما، اعضائے رئیسہ کی فعلیت، زخموں کا اندمال، اور ہر قسم کے امراض کے خلاف قدرتی صحت بخش ردعمل جو سب مل کر حیوان کی زندگی اور نسل کی بقا کے لیے خود بخود عمل کرتے ہیں، ایک ایسے ذہن کی حکیمانہ اور قادرانہ تخلیقی، اور ترتیبی کارروائی کا پتہ دیتے ہیں جو حیوان کے علاوہ کسی اور کا ذہن ہے۔ اور یہی ذہن ہے جو حیوان کے ان اندرونی اعمال وظائف کے درمیان آپس میں اور ان سب کے علاوہ حیوان کے بیرونی جبلتی کردار کے درمیان ایک مکمل ہم آہنگی اور توافق پیدا کرتا ہے۔ وہ حیوان کی نشوونما اس طرح سے کرتا ہے کہ حیوان زندہ رہنے کے لیے اپنے ماحول کے ساتھ مطابق ہو جائے۔ مچھلی چونکہ پانی میں تیرتی ہے، اس لیے خالق اس کو گلپھڑے دیتا ہے، تاکہ ہوا کی بجائے پانی کو سانس لینے کے لیے استعمال کر سکے۔ اس کا جسم اس طرح سے بناتا ہے کہ تیرتے وقت پانی کی رو کم سے کم مزاحمت کر سکے۔ اس کے جسم کے آخر میں دم پتوار کی طرح پانی میں دھکیلنے کے لیے لگاتا ہے اور جسم کے دونوں طرف حرکت میں چپوؤں کی مانند مدد دینے کے لیے پر پیدا کرتا ہے۔ پرندہ چونکہ ہوا میں اُڑتا ہے اُسے پروں کا ایک نہایت ہی پیچیدہ نظام دیتا ہے جو اُڑنے کے لیے مددگار ہے۔ سے ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے اس کی ہڈیاں اندر سے کھوکھلی رکھ کر ایک ہلکی گیس سے بھر دیتا ہے۔ حیوان کو ماحول کے مطابق بنانے کے لیے اس ذہن سے جو تخلیقی اعمال انجام پاتے ہیں آنکھ اور کان ان کی محیرالعقل مثالیں ہیں۔ دراصل اس ذہن کی تخلیقی فعلیت کی برکت سے ماحول کے ساتھ توافق ہر زندہ جسم کا امتیازی نشان بن گیا ہے جو اس کی جسمانی ساخت اور جبلتی اعمال کی تمام چھوٹی بڑی تفصیلات میں آشکار انظر آتا ہے۔

چونکہ سائنسدان کی اپنی سائنسی تحقیق اُسے اس بات کی طرف راہ نمائی کرتی ہے کہ کائنات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس میں نظم نہ ہو اور جو کسی ذہن کی تخلیقی فعلیت کا ثبوت نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنسدان خود اپنی ہی جستجو کے نتیجہ کے طور پر اس سوال سے دوچار ہوتا ہے کہ آخر یہ ذہن کونسا اور کس کا ہے جس کے کمالات کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ فرما ہیں۔ اور یہ سائنسدان ہی کا فرض ہے کہ جو سوال اس نے پیدا کیا ہے وہ اس کا جواب دے۔ اس سوال کو نظر انداز کرنا یا اس کا جواب دینے سے گریز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راہ چلتے چلتے ایک مقام پر جہاں ایک بورڈ پر موٹا سا تیر سمت منزل کی نشاندہی کر رہا ہو اور بلاوجہ ٹھہر جائے اور پھر آگے جانے کا نام نہ لے۔ سائنس دان کا تو امتیاز ہی ہے کہ وہ ہر بات کی وجہ ڈھونڈتا ہے۔ ہر سوال جو پیدا ہوتا ہے اس کا جواب تلاش کرتا ہے۔ تاکہ اپنے ذہنی عمل کی تکمیل سے اپنے ذوق دریافت کو مطمئن کرے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو علم کی ترقی کا رُک جانا ضروری ہے۔ سائنس دان کو اس سوال کا جواب اس لیے بھی دینا چاہیے کہ ہو سکتا ہے اس کا جواب اُس کے گذشتہ حاصل شدہ سائنسی نتائج

پر مزید روشنی ڈالے اور سائنسی تحقیق کے راستہ پر اُس کی آئندہ کی منزلوں کو آسان بنادے۔ اگر وہ اس سوال کا جواب نہ دے تو اس کی سائنسی تحقیق تشنہ اور ادھوری اور نا تمام رہ جائے گی اور آئندہ کی سائنسی جستجو کی راہوں میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن سائنسدان کو اس سوال کا جواب قرآن حکیم کے سوائے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ قرآن حکیم دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے کہا ہے کہ تمام مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں اور انسان کو چاہیے کہ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے خدا کو پہچانے۔

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن اور رات کے اختلاف میں
عقلمندوں کے لیے خدا کے نشانات ہیں

کہئے اے پیغمبر۔ آسمانوں اور زمین میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرو

اگر آج دُنیا میں کوئی اور بھی ہے جو یہی بات کہتا ہے تو وہ قرآن کی اسی آواز کی بازگشت ہے۔

لہٰذا سائنسدان کے لیے ضروری ہے کہ کائنات کی اسی بنیادی حقیقت، یعنی نظم کی تشریح کے لیے خدا کا تصور قرآن حکیم سے لے کر اپنی سائنس کو مکمل کرے۔ اس کے بغیر سائنس نہ تو مکمل ہو سکتی ہے اور نہ پوری طرح سے معنی خیز بن سکتی ہے۔

لیکن یہ کام مسلمان سائنسدان ہی کر سکتا ہے۔ مغرب کا عیسائی سائنسدان نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید عیسائیت میں خدا کا تصور اسلام کے تصور خدا سے جدا ہے۔ عیسائیت کا خدا دنیا کا خالق تو ہے لیکن دنیا سے الگ تھلگ ہے۔ اس کو پانے یا راضی کرنے کے لیے دنیا کو چھوڑ کر غاروں اور پہاڑوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ عیسائیت دین کو دنیا سے الگ کرتی ہے اور دنیا کو پلید اور نجس اور دین میں رکاوٹ سمجھتی ہے۔ لہٰذا مغرب کا سائنسدان یہ سمجھتا ہے کہ سائنس اس دنیا کی چیز ہے اور اسے خدا کے تصور سے کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مغرب کی بے خدا سائنس، مظاہر قدرت کی بے خدا تشریحات کر کے اتنی مدت تک ان کو صحیح سمجھتی رہی ہے کہ اب مغرب کا سائنس دان غلطی سے یہ سمجھنے لگ گیا ہے کہ سائنس کا بے خدا ہونا خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔ چنانچہ اب وہ لگا تار اس کوشش میں رہتا ہے کہ سائنس کی کتابوں میں خدا کا نام کہیں آنے نہ پائے۔ جہاں کہیں سائنسی حقائق کی تسلی بخش تشریح کے لیے خدا کی صفات رکھنے والا کوئی مابعد الطبیعیاتی تصور ضروری ہو جاتا ہے وہاں وہ کسی من گھڑت تصور کو کام میں لاتا ہے۔ لیکن خدا کے لفظ کو کسی حالت میں بھی اپنی بحث میں آنے نہیں دیتا۔ مثلاً اگر جینز طبیعیاتی اور مادی مظاہر قدرت کی تشریح کے لیے ''ریاضیاتی ذہن'' کا تصور تراشتا ہے تو انڈنگٹن ''ذہن مادہ'' کی

دوہری اصطلاح گھڑ لیتا ہے اور اگر حیاتیاتی مظاہر قدرت کی تشریح کے لیے برگسان کسی قوت حیات کا مفروضہ ایجاد کرتا ہے تو ڈریش ''اینٹیلیچی'' کے بے بنیاد عقیدہ سے کام نکالتا ہے۔ خدا کے یہ قائم مقام فرضی تصورات گویا مغربی سائنسدان کے دیوتا ہیں جنہیں وہ تصور خدا کے خود پیدا کردہ خلاء کو پر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تاکہ خدا کے وجود کے خلاف اس کا اور معاشرے کا تعصب بحال رہے۔ لیکن کیا کارخانہ قدرت میں خدا کی ہر صفت کے ظہور کی تشریح کے لیے ایک نیا مابعد الطبیعیاتی تصور ایجاد کرنے سے یہ بہتر نہیں کہ ایک ہی خدا کو مان لیا جائے جس میں یہ تمام صفات موجود ہیں اور جو بیک قوت ریاضیاتی ذہن بھی ہے اور قوت حیات بھی ہے؟

کیا بہت سے خدا بہتر ہیں یا ایک ہی خدا جو سب پہ غالب ہے۔ تم اس خدا کو چھوڑ کر فقط کچھ ناموں کی عبادت کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے گھڑ لیے ہیں

مادی اور حیاتیاتی سطح قدرت پر نظم کا انکار کرنے سے یا اعتراف کرنے کے بعد اس بات کو نہ ماننے سے کہ وہ خالق کائنات خدا کی فعلیت اور تخلیقی کارروائی کا نتیجہ ہے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ مغرب کا سائنسدان اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہ گیا ہے جو انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے یعنی کہ ''انسان کیا ہے۔'' چنانچہ انسانی علوم میں اس کی لاعلمی اور جہالت پوری دُنیا پر مسلط ہو کر انسانیت کو گمراہ کر رہی ہے اور طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر رہی ہے۔

انسان کے اندر کئی فطرتی خواہشات ہیں لیکن ان میں سے ایک خواہش جو دوسری تمام خواہشات سے زیادہ طاقتور اور سب پر حکمران ہے وہ خدا کی محبت کے جذبہ پر مشتمل ہے۔ اور یہی جذبہ محبت انسانی کے تمام اعمال و افعال کا منبع یا سرچشمہ ہے۔ لیکن اگر انسان کو خدا کی صفات و کمال کا ذاتی احساس نہ ہو تو یہ جذبہ بھٹک کر کسی اور تصور کے ذریعہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور اس طرح سے انسان اس غلط تصور کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ لیکن مغرب کا بے خدا سائنس دان اپنے اس مفروضہ کو بلا دلیل صحیح سمجھنے کی وجہ سے کہ ''وہ علم کو بے خدا ہونا چاہیے'' اس عظیم جذبہ کو نہیں سمجھ سکا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ جذبہ بھی انسان کی کسی حیوانی جبلت کی پیداوار ہے اور اسی کا خدمت گزار ہے۔ لیکن وہ اپنی رائے کو علمی طور پر معقول اور مدلل ثابت کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں نشوونما پانے والے تمام انسانی اور سماجی علوم، مثلاً فلسفہ سیاست، اخلاق، فلسفہ تعلیم، فلسفہ قانون، فلسفہ اقتصادیات، فلسفہ تاریخ، فلسفہ علم، فلسفہ فن، انفرادی نفسیات اور اجتماعی نفسیات وغیرہ پراگندہ خیالی کا شکار ہیں اور ان میں سے ایک بھی علم ایسا نہیں جو ایک منظم اور معقول کہلانے

کا حقدار ہو۔ مغرب کا دانا اپنی اس بد قسمتی کا بار بار اعتراف کرتا ہے۔

مغربی سائنس کی بے خدائیت کا ایک نہایت ہی خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ دور حاضر کے انسان کی عملی زندگی بگڑ کر رہ گئی ہے اور رفتہ رفتہ تمام اخلاقی قدریں اس سے رخصت ہو گئی ہیں۔ یہ بات جس طرح سے انفرادی سطح پر درست ہے اُسی طرح سے قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر بھی درست ہے۔ بھلا جب اذہان بے خدا ہوں، جب کائنات اور قدرت کو بے خدا مانا جائے۔ جب انسانی اعمال و افعال کے فلسفے اور علوم بے خدا ہوں، تو کیسے ممکن ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں کے افعال و اعمال بے خدا نہ ہوں۔ دور حاضر کے انسان کے بہت سے اُلجھے ہوئے مسائل، مثلاً جنگوں کا غیر متناہی سلسلہ، طفولیتی بے راہ روی، غیر محدود جنسی آزادی، ذہنی بیماریوں کی بڑھتی ہوئی رفتار، دولت مندی، آزادی اور فارغ البالی کے باوجود عام پریشانی اور بے اطمینانی کی موجودگی، بہیمانہ جرائم کی کثرت، خودکشیوں کی شرح میں روز افزوں اضافہ وغیرہ دور حاضر کے بے خدا ذہن کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغرب کے بعض مفکرین بھی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ اور اسی عقیدہ کے تحت اخلاقی قدروں کے ساتھ مربوط ہونا چاہیے۔ یہ قرآن حکیم کی طرف ایک غیر شعوری جھکاؤ ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کا سابق صدر پروفیسر سوادکن لکھتا ہے:۔

> ”مذہب اور سائنس کا موجودہ تضاد خطرناک ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر خدا اور اخلاقی اقدار کا صحیح تصور میسر آ جائے تو اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک ہیں اور ایک ہی مقصد کی پیش برد کے لیے اپنا وجود رکھتے ہیں یعنی یہ کہ تجربات کی اس قریبی دنیا میں خدائے مطلق کی قدرتوں کو بے نقاب کیا جائے تا کہ انسان کی شرافت اور خدا کی عظمت دونوں کا اثبات عمل میں آئے۔“

فیلڈ مارشل سمٹس (فلسفہ کی بلند پایہ کتاب ہولزم **HOLISM** کا مصنف) لکھتا ہے:۔

> ”صداقت کی مخلصانہ جستجو، نظم اور حسن کے ذوق کے اعتبار سے سائنس مذہب اور فن کے اوصاف سے حصہ لیتی ہے...... اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ شائد سائنس ہمارے اس عہد کے لیے خدا کی ہستی کی واضح ترین نقاب کشائی ہے...... سچی بات تو یہ ہے کہ نوع انسانی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو

اخلاقی قدروں کے ساتھ ملحق کرے گی اور اس طرح سے اس بڑے خطرے کا ازالہ کرے گی جو ہمارے مستقبل کو درپیش ہے۔"

حقائق بتا رہے ہیں کہ مسلمان قوم ہی قرآن کی روشنی میں یہ عظیم الشان کام نوع انسانی کے لیے انجام دے کر اسے خطرے سے باہر نکالے گی اور اس کام کی قیادت کا سہرا پاکستان کے سر رہے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دنیا میں قرآن حکیم کی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لیے اپنے ملک سے سائنس کو خدا کے ساتھ ملحق کرنے کی تحریک کا آغاز کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے نمونہ کا ایک کالج قائم کریں جس میں سائنسی علوم کی نصابی کتابیں اس طرح سے لکھی گی ہوں کہ خدا کا تصور اُن کے مدار و محور ہوں۔ یہ تصریح اب ہمیں دوسرے سوال کے قریب لے آتی ہے۔

دراصل اوپر کے سوال کے جواب میں اس سوال کے جواب کا بہت سا حصہ آ چکا ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کی روح یا اصل خدا کا تصور ہے۔ یہ تصور وہ مدار یا محور ہے جس کے ارد گرد قرآن حکیم کی باقی تعلیمات گھوم رہی ہیں اور یہی وہ تصور ہے جو علمی لحاظ سے سائنس کا جزو لاینفک ہے کیونکہ یہی وہ تصور ہے جو سائنس کی بنیاد یعنی نظم کی تسلی بخش تشریح کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور اپنے علمی اور عقلی مقام کے لحاظ سے خود بخود سائنس کے اندر سمویا ہوا موجود ہے۔ اگر ہم سائنس کو اس طرح سے لکھیں کہ اس تصور کو حذف کر دیں تو ہم سائنس کے ساتھ زیادتی کریں گے اور اسے ادھورا اور تشنہ اور نا تمام رکھیں گے اور سائنسی علوم کے متعلق ہماری بنیادی تعریفیں ہی غلط ہو جائیں گی۔

جو لوگ خدا کے تصور کو سائنس سے الگ رکھتے ہیں وہ طبیعیات کی تعریف اس طرح سے کرتے ہیں:۔

"طبیعیات مادہ کی سائنس ہے۔"

یہ تعریف فرض کرتی ہے کہ مادہ خود بخود موجود ہے۔ جو صحیح نہیں۔ خدا کے تصور کی روشنی میں طبیعیات کی تعریف یوں ہونی چاہیے:۔

"طبیعیات خدا کی اس تخلیقی فعلیت کی سائنس ہے جو مادی مظاہر قدرت کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔"

جب ہم طبیعیات کی کوئی نصابی کتاب لکھیں تو ہمیں چاہیے کہ نہ صرف طبیعیات کی تعریف اس طرح کریں بلکہ جہاں کہیں ہم اپنے مشاہدات سے نظم کو دریافت کریں یا نظم کی موجودگی کو ثابت کریں، اسے خدا کی تخلیقی فعلیت کی طرف منسوب کریں اور یہ چیز بار بار اس حد تک ہونی چاہیے کہ یہ ایک مستقل معمول بن جائے اور سائنس کا بے خدا نقطہ نظر فراموش ہو

جائے۔ پاسکل نے ایک قانون دریافت کیا تھا۔ اُسے پاسکل کا قانون کہتے ہیں۔ اس کی بجائے ہمیں کہنا چاہیے کہ یہ خدا کا قانون ہے جو پاسکل نے دریافت کیا تھا۔ غرض یہ ہے کہ بار بار نظم کے خالق کی حیثیت سے خدا کا نام لے کر طالب علم کے دل میں کائنات کے اندر خدا کی موجودگی اور تخلیقی فعلیت کا گہرا اور نہ مٹنے والا احساس پیدا کیا جائے۔

بے خدا سائنس حیاتیات کی تعریف یوں کرتی ہے:۔

"حیاتیات زندگی کی سائنس ہے۔"

لیکن جب خدا کا تصور سائنس میں اپنے صحیح مقام پر آ جائے تو حیاتیات کی تعریف اس طرح سے کی جائے گی:۔

"حیاتیات خدا کی اس تخلیقی فعلیت کی سائنس ہے جو حیاتیاتی مظاہر قدرت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔"

حیاتیات کی نصابی کتابوں میں بھی جہاں کہیں ہم نظم اور مقصد اور توافق کو ثابت کریں ہمیں ان کو خدا کی تخلیقی فعلیت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔

اسی طرح سے نفسیات کی صحیح تعریف یوں ہوگی:۔

"نفسیات خدا کی اُس تخلیقی فعلیت کی سائنس ہے جو ذہن انسانی اور اُس کے مظاہر یعنی انسانی افکار و اعمال کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔"

تمام انسانی سماجی علوم، نفسیاتی سماجی علوم، نفسیاتی علوم ہیں۔ کیونکہ اُن کا سرچشمہ انسانی ذہن یا انسانی نفسیات ہے۔ ان علوم میں فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تاریخ، فلسفہ تعلیم، فلسفہ قانون، فلسفہ اقتصادیات، فلسفہ علم، فلسفہ فن، انفرادی نفسیات اور اجتماعی نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔

چونکہ انسان کی نفسیات میں صرف ایک بڑی خواہش موجود ہے اور باقی تمام خواہشات اس ایک خواہش کی خدمت گذار اور تابع ہیں، اور وہ بڑی خواہش خدا کی محبت ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان علوم میں سے ہر ایک کی نصابی کتاب لکھتے ہوئے اس علم کے حقائق کی تشریح اس طرح سے کریں کہ وہ اس اعلیٰ خواہش کے اظہار کے ذرائع اور طریقے ثابت ہوں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ تاکہ ہم ان علوم کی تدوین میں اُن منطقی اور عقلی خامیوں اور غلطیوں سے بچ جائیں۔ جس کا ارتکاب مغرب کے بے خدا سائنسدان کر رہے ہیں، اور جن کی وجہ سے یہ علوم بدنظمی اور انتشار کی حالت میں ہیں۔

صحیح سائنسی علم، اسلام کا ہم نوا ہوتا ہے!

ریاض الحسن نوری

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل علیہ السلام کو ان کے زمانی حالات اور ضرورت کے مطابق مختلف معجزات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادوگروں کا زور تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی مناسبت سے معجزات عطا فرمائے تا کہ آپؑ جادوگروں کو زیر کرسکیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں اگر علم طب عروج پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایسے معجزات عطا فرمائے کہ آپؑ اس وقت کے تمام حکیموں اور طبیبوں پر سکہ جما سکیں۔ چنانچہ آپؑ مادر زاد اندھوں اور کوڑھ کے مریضوں کو بحکم الٰہی تندرست فرما دیتے جب کہ کوئی اور حکیم یا طبیب اس کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر انبیا کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا۔

البتہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم النبیین (اللہ کے آخری نبی) ہونے کے ناطے قیامت تک کے لیے نبی ورسول بنا کر بھیجے گئے، اس لیے ضروری تھا کہ آپ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی آپؐ کے معجزات قیامت تک لیے سامنے آتے رہتے۔ ویسے تو آپ کو اپنی زندگی ہی میں بہت سے معجزات (مثلاً شق قمر، اسراء و معراج وغیرہ) سے نوازا گیا تاہم اس کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث میں بہت سے ایسے دعوے اور حقائق بھی پیش کیے گئے جنہیں اس دور میں محدود آلات اور معلومات کی بنا پر جاننا کسی کے لیے ممکن نہ تھا، آج کی محیر العقول ترقی میں جب بہت سے انکشافات ہوئے تو ان سے قرآن وحدیث کی حقانیت کا اٹل ثبوت میسر آیا کہ قرآن کریم نے انہیں کس طرح مکمل صورت میں آج سے صدیاں قبل پیش کیا تھا۔ سر دست انہی میں سے چند ایک ایسے حقائق کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جنہیں سائنسی تحقیقات کے بعد دور حاضر میں مسلمہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے جبکہ ۱۴۰۰ سال پہلے ہی قرآن وسنت میں ان کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔

ا۔علم جنین (الأجنة) اور تخلیقی مراحل واطوار

انسانی بچے کی پیدائش اور اس کے مختلف مراحل کے حوالہ سے سائنس دانوں نے بیسویں صدی میں بہت سے حقائق دریافت کیے جن میں مزید پیش رفت تا حال جاری ہے خلیہ (Cell)، جینز (Genes) اور ان سے متعلقہ معلومات کی فراہمی نے نہ صرف علم الاجنہ (Embryology) میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کیا بلکہ اس کے ساتھ تخلیقی مراحل کی بہت سی پیچیدگیوں اور مشکلات کو دور کرنے اور بانجھ پن کی مختلف صورتوں پر قابو پانے میں بھی مدد حاصل ہوئی۔ علم الجنہ اور علم الطب سے متعلقہ کسی صورت کو زیر بحث لانا یہاں مقصود نہیں، تاہم علم الاجنہ کے حوالہ سے بیسویں صدی کی ان دریافتوں کی مناسبت سے ہم عرض کرنا چاہیں گے کہ قرآن وسنت نے چودہ سو سال پہلے ہی ان چیزوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ مثلاً

قرآن مجید میں ہے کہ

"اور بلاشبہ اللہ نے جوڑا یعنی نر و مادہ پیدا کیا ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکائی جاتی ہے۔" (النجم:۴۵،۴۶)

اس آیت میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ نر یا مادہ کی پیدائش کا انحصار نطفہ پر ہے۔ جدید سائنس بھی قرآن مجید کی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ انسانی پیدائش کا عمل نطفے سے شروع ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں ہے کہ

"وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل پر تخلیق کرتا ہے۔" (الزمر:٦)

یعنی اللہ تعالیٰ انسانی تخلیق کو رحم مادر میں مختلف مراحل واطوار سے گزارتا ہے۔ یہ مراحل کتنے اور کون کون سے ہیں، اس کی تفصیل قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمائی:

"اے لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو سوچو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر خون بستہ سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جو صورت دیا گیا تھا اور بے نقشہ تھا۔ یہ تم پر ظاہر کر دیتے ہیں اور ہم جسے چاہیں ایک ٹھہرائے ہوئے وقت تک رحم مادر میں رکھتے ہیں۔ پھر تمہیں بچپن کی حالت میں دنیا میں لاتے ہیں تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔" (الحج:۵)

تخلیقی مراحل کو قرآن مجید ہی کے ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''پھر ہم نے اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا، پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنا دیا پھر گوشت کو ہڈیوں میں بدل دیا پھر (ان) ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنا دیا پھر ایک اور بناوٹ میں اسے پیدا کر دیا۔ برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔'' (المومنون: ۱۳ تا ۱۴)

یہی مراحل صحیح احادیث میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ نطفہ چالیس دن کے بعد عَلَقَة (یعنی گاڑھا خون) بن جاتا ہے پھر چالیس دن کے بعد یہ مُضغَة (یعنی لوتھڑا یا گوشت کی بوٹی) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ آتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ یعنی چار مہینے کے بعد نفخ روح ہوتا ہے اور بچہ ایک واضح شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: بخاری: کتاب الانبیاء اور مسلم: کتاب القدر، وغیرہ)

دور حاضر میں تخلیق کے مذکورہ مراحل سائنسی تحقیقات کے بعد متفقہ طور پر تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ جبکہ ۱۴۰۰ سال پہلے جب اسلام نے ان مخفی امور کی نشاندہی کی تھی، اس وقت یہ معلومات کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھیں۔

۲۔ پہاڑوں کو میخیں قرار دینا

قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر یہ بات بیان ہوئی کہ پہاڑ میخوں کی حیثیت سے زمین میں گاڑے گئے ہیں۔ بطور مثال چند آیات درج کی جاتی ہے:

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے تاکہ وہ (زمین) انہیں (مخلوق) لے کر ڈھلک نہ جائیں۔'' (الانبیاء: ۳۱)

''اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے تاکہ زمین تمہیں ہلا نہ سکے۔''

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (لقمان: ۱۰)

''کیا ایسا نہیں کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح (اس میں) گاڑ دیا؟'' (النباء: ۶، ۷)

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ زمین پر پہاڑوں کو نصب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زمین ڈھلکنے اور جھٹکے لگنے سے محفوظ رہے۔ اگرچہ نزول قرآن سے پہلے دنیا اس حقیقت سے ناواقف تھی، تاہم اب جدید سائنسی تحقیقات نے بھی قرآن مجید کی اس بات کی تائید کر دی ہے۔

جدید علم طبقات الارض کے مطابق ''پہاڑ قشر زمین (Earth's Crust) بنانے والی عظیم پلیٹوں کی حرکت اور ان کی باہمی رگڑ اور مسلسل ٹکراؤ کے نتیجے میں تشکیل پاتے ہیں۔ جب وہ پلیٹیں آپس میں متصادم ہوتی ہیں تو ان میں سے جو مضبوط تر ہوتی ہے، وہ دوسری کے نیچے گھس جاتی ہے اور اوپر والی خم کھا کر بلندی اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح پہاڑ وجود میں آجاتا ہے۔ جبکہ نیچے والی تہہ زمین کے نشیب میں زیریں جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ایک گہرائی عمل میں آنے لگتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑوں کا ایک حصہ نیچے کی جانب بھی ہوتا ہے جو سطح زمین سے نظر آنے والے حصہ کے تقریباً مساوی ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہاڑ سطح زمین کے نیچے اور اوپر سے آگے کی طرف بڑھتے ہوئے قشر ارض کی پلیٹوں کو آپس میں بھینچ دیتے ہیں جس سے زمین کی مضبوطی بڑھتی ہے۔ مختصر طور پر ہم پہاڑوں کو میخوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جو زمین کے مختلف حصوں کو اسی طرح جوڑتے ہیں جیسے میخیں لکڑی کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑتی ہیں۔''
(قرآن رہنمائے سائنس از ہارون یحییٰ، ص ۱۲۲)

۱۹۸۷ء میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک امریکی سائنسدان نے قرآن مجید کی ان چند (مذکورہ) آیات (جن میں پہاڑوں کو میخیں کہا گیا) کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۱۰۰ سال پہلے تک سائنس دانوں کا یہی خیال تھا کہ پہاڑ ایسے ہی ٹیلے ہیں جیسے ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں یا قدرتی طور پر مسلسل آندھی وطوفان کے نتیجے میں کسی جگہ مٹی، ریت اور پتھروں کا ڈھیر لگ جاتا ہے مگر اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پہاڑ اگر میل اونچا ہو تو اس کی جڑ کئی میل تک گہری ہوتی ہے۔ جس طرح میخ کا کچھ حصہ اوپر نظر آتا ہے جبکہ اس کا بڑا حصہ زمین میں ہوتا ہے۔

المختصر یہ کہ اس امریکی سائنس دان نے قرآن مجید کی ان آیات کو معجزاتی آیات قرار دیا کیونکہ ان آیات میں جن حقائق کو ۱۴۰۰ سال پہلے بیان کیا گیا ہے، سائنس دان ان حقائق تک پہنچنے میں اب کامیاب ہوئے ہیں۔

۳۔ تخلیق کائنات کے سائنسی مشاہدے

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں قرآن مجید ہمیں جن حقائق سے آگاہ کرتا ہے، ان کا تذکرہ مندرجہ آیات میں موجود ہے:

''کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور ہم نے پانی کے ساتھ ہر زندہ چیز کو پیدا کیا۔ کیا یہ

لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔" (سورۃ الانبیاء:۳۰)

"پھر (اللہ تعالیٰ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور (آسمان) دھواں سا تھا۔ پس اسے اور زمین سے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ تم دونوں خواہ خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم بخوشی حاضر ہیں۔" (حٰمٓ السجدۃ:۱۱)

"آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور یقیناً ہم اس میں کشادگی کرنے والے ہیں۔" (الذاریات)

مندرجہ بالا آیت میں سے پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جدا جدا کر دیا۔ اب یہی بات جدید سائنس بھی تسلیم کر چکی ہے کہ کرۂ ارض ایک خوفناک حادثے کے ساتھ وجود میں آئی اور اسی حادثہ عظیمہ کو بگ بینگ (Big Bang) یا "انفجار عظیم" بھی کہا جاتا ہے۔

دوسری آیت میں جس چیز کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ شروع میں آسمان مکمل طور پر دھوئیں یا گیس کی شکل میں تھا جیسا کہ مشہور ایٹمی سائنسدان جارج گیمو لکھتا ہے کہ

"کائناتی مکان (فضا) کثیر توانائی والی گاما شعاعوں (High Enrgy Gama Radiation) سے پر تھا...... لیکن اس میں موجود مادہ کا وزن مخصوص زمین سے بالا تر فضا کی ہوا کے برابر ہماری کائنات کی تخلیق تاریخ کے پہلے گھنٹے کے بعد کائنات میں ۳۰ ملین سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ (اسی زمانے کے متعلق قرآن نے کہا کہ تمام آسمان دھوئیں یا گیس کی شکل میں تھا) یہی مصنف مزید لکھتا ہے کہ "بنیادی چیز جس سے کائنات بنی، وہ ہائیڈروجن گیس تھی۔"

(The Creation of the Universe, p.135)

تیسری آیت میں یہ نشاندہی کی گئی ہے کہ کائنات میں مسلسل توسیع کا عمل جاری ہے اور اکثر سائنس دان بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر آن یہ کائنات پھیلتی اور وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ ہارون یحییٰ اپنی تصنیف 'قرآن رہنمائے سائنس' میں لکھتے ہیں کہ

"۲۰ ویں صدی کی آمد تک دنیائے سائنس میں ایک ہی نظریہ مروج تھا کہ کائنات بالکل غیر متغیر اور مستقل نوعیت رکھتی ہے اور لامتناہی عرصہ سے ایسی ہی چلی آ رہی ہے۔ تاہم تحقیق و مشاہدہ اور ریاضیاتی جانچ پڑتال

جو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے جاری تھی، اس سے انکشاف ہوا کہ اس کائنات کا ایک نکتہ آغاز بھی تھا اور اس وقت سے یہ مسلسل پھیل رہی ہے۔ ۲۰ صدی کے شروع میں روسی ماہر طبیعیات الیگزنڈر فرائیڈ مین اور بلجیم کے ماہر علم تکوین عالم (Cosmologist) جارجز لیمٹر کے جمع کردہ نظری حساب کتاب سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کائنات مسلسل حرکت کر رہی ہے اور وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔ اس انکشاف کی ۱۹۲۹ء کے مشاہدات سے تصدیق ہوگئی۔ امریکی ماہر فلکیات ایڈوین ہبل نے اپنی دور بین سے آسمان کا مشاہدہ کرنے کے بعد انکشاف کیا کہ ستارے اور کہکشائیں ایک دوسری سے مسلسل دور ہٹ رہی ہیں۔ ایک ایسی کائنات جس میں ہر چیز، دوسری چیز سے پرے ہٹتی جا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلسل پھیل رہی ہے۔ بعد میں برسوں کی تحقیق بھی اس مشاہدے کی تصدیق کرتی رہی ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت اس وقت بیان کر دی تھی کہ جب کسی کو اس کا وہم وگمان تک نہ تھا۔ یہ اس لیے کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک اور حکمران حقیقی ہے۔'' (ص ۱۱۰، ۱۱۱)

۴۔ بشرط صحت آسمان اور زمین کے گول ہونے کا ثبوت

اگرچہ جدید سائنس نے تحقیقی و سائنسی مشاہدات کے بعد یہ بات تسلیم کی ہے کہ اور زمین گول ہے جبکہ قرآن مجید نے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی اس حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا وجہ ہے کہ مسلم سائنسدانوں کا شروع سے یہ موقف رہا کہ زمین گول ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام نے ۱۴۰۰ سال پہلے کیا نشاندہی کی تھی، اس کا تذکرہ ہم آٹھویں صدی ہجری کے عظیم یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ کی روشنی میں کریں گے۔ شیخ الاسلام نے اس موضوع پر اپنے فتاویٰ میں جا بجا بحث کی ہے۔ چنانچہ مجموع الفتاویٰ کی چھٹی جلد میں ایسے ہی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ رقم طراز ہیں کہ

''مسلمان اہل علم کا موقف یہ ہے کہ آسمان گول ہیں اور بہت سے کبار علمائے مسلمین نے اس بات پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق نقل کیا ہے۔

مثلاً احمد بن جعفر بن المناوی جو امام احمد کے اصحاب میں سے طبقہ ثانیہ کے کبیر عالم خیال کئے جاتے ہیں اور وہ تقریباً ۴۰۰ کتب کے مصنف بھی ہیں، نے اسی طرح ابن حزم اور ابن جوزی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اہل علم نے اس سلسلہ میں اپنی معروف اسناد کے ساتھ یہ بات صحابہ کرام اور تابعین عظام سے بھی ثابت کی ہے اور کتاب وسنت سے بھی اس کے دلائل فراہم کئے ہیں۔ اس مسئلے پر اہل علم نے نہ صرف دلائل نقلیہ سے استشہا کیا ہے بلکہ دلائل عقلیہ سے بھی اسے ثابت کیا ہے۔''

(مجموع الفتاویٰ، ج۶ ص: ۵۸۶)

اس کے بعد شیخ الاسلام قرآن وسنت کے چند نصوص سے استشہاد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا اور یہ سب اپنے اپنے فلک (مدار) میں محو گردش ہیں۔''

(سورۃ الانبیاء: ۳۳)

سلف صالحین میں سے حضرت ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں کہ

''فلک چرخ کے تکلہ کے محور کی طرح گول ہوتا ہے اور یہ (آسمان وزمین کے) گول ہونے کی صریح دلیل ہے اور ویسے بھی لغت میں ہر گول چیز کے لیے لفظ فلک استعمال کیا جاتا ہے۔''

(مجموع فتاویٰ، ج۲ ص ۵۸۷)

شیخ الاسلام ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں کہ

واضح رہے کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کی شکل گولائی نما ہے اور زمین کا اکثر حصہ پانی پر مشتمل ہے۔'' (ایضاً ص ۱۵۰/۵)

اس پر مزید بحث شیخ الاسلام نے مجموع الفتاویٰ کی ۲۵ ویں جلد (ص ۱۹۵) میں بھی کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے مجموعہ فتاویٰ کے مذکورہ اجزاء ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

قرآن اور عصری تحقیقات

ریاض الحسن نوری

قرآن اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل سائنس اس کائنات کے اصولوں کو مادی طور پر سمجھنے کی کوشش کا نام ہے۔ سائنس کی صحیح اور مسلمہ چیزوں اور قرآن کی صحیح تفسیر میں تضاد کا کوئی سوال نہیں کیونکہ خدا کے فعل اور قول میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ تضاد اور غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ خود ہمارا علم ناقص ہو۔

قرآن کے فہم میں ہمارے علم کا نقص کئی وجوہ سے ہوتا ہے۔ کبھی سلف صالحین کے اقوال سے روگردانی کرنے یا ان کی تمام آرا پر محیط نہ ہونے کی وجہ سے کبھی صحیح، ضعیف اور موضوع روایات میں ٹھیک طور پر تمیز نہ کرنے اور اس جانچ میں درایت سے کام نہ لینے سے ہم قرآنی حقائق کا مکمل اور صحیح شعور نہیں کر پاتے۔ بعض اوقات ہٹ دھرمی اور تعصب یا اباحت پسندی کی وجہ سے بھی کچھ لوگ الٹی پلٹی تفسیریں کرنے لگتے ہیں۔

ایک سائنسی تحقیق کی فقہی افادیت:

بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی فن سے ناواقفیت یا کسی حقیقت کے متعلق انسانی علم کی کمی کی وجہ سے بھی تسامح ہو جاتا ہے۔ مثلاً خمر، سے حضرت امام ابو یوسف صرف انگوری شراب مراد لیتے تھے۔ اس کے برعکس دوسرے آئمہ، حتیٰ کہ امام محمد بھی انگور کے علاوہ اثمار و اجناس کی شرابوں کو بھی خمر میں داخل سمجھتے تھے۔ آخر کار موجودہ سائنس نے اس بحث کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے۔ تمام پھلوں اور اجناس سے بننے والی شراب جن میں نشہ آور جزء ایتھائل الکوحل (Ethyl Alcohol) ہوتا ہے وہ خمر کے ذیل میں آئے گی۔ لیکن دوسری منشیات جن میں نشہ آور جزء الکوحل نہیں ہوتا، ان کا مسئلہ مختلف ہوگا۔ مثلاً بھنگ افیم وغیرہ کا محض ایک قطرہ یا اس کے مثل (یعنی غیر نشہ آور مقدار) حرام نہ ہوگا۔ بلکہ حرمت اور حد صرف نشہ کے صورت میں واجب ہو

گی۔ لیکن الکوحل کے ایک قطرہ کا استعمال بھی ناجائز ہے۔ خواہ وہ عملاً نشہ طاری نہ کر سکے۔ یہ ایک مثال ایسی ہے جس میں سائنس کی ایک تحقیقات اہل فقہ کے لیے معاون ثابت ہوئی۔

لیکن جو حضرات سائنس باقاعدہ نہیں پڑھتے یا صرف سنی سنائی سطحی اور ادھوری معلومات رکھتے ہیں وہ بعض امور میں حکم لگاتے ہوئے غلطی کر جاتے ہیں۔

ایک سعی ناتمام

سائنس بجائے خود مادی حقیقتوں کی تلاش کی ایک سعی ناتمام اور ایک سفر مسلسل ہے۔ سائنس کے سامنے جب کسی مسئلے پر کافی مواد جمع ہو جاتا ہے اور کسی حقیقت کی جھلک محسوس ہونے لگتی ہے تو قیاس یا مفروضہ (Hypothesis) نمودار ہوتا ہے۔ پھر جب بہت سے سائنس دان اس کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے مزید ثبوت مل جاتے ہیں تو اس کو نظریہ (Theory) کا مقام دے دیا جاتا ہے پھر جب ایک لمبے عرصے تک اس نظریے کے پے در پے ثبوت دنیا بھر میں بہم پہنچتے رہتے ہیں اور سب سائنس دان اس سے متفق ہو جاتے ہیں تو اس نظریے کو قانون Law کا رتبہ دے دیا جاتا ہے۔ اصولی طور پر قانون بننے کے بعد اس نظریے میں تبدیلی یا ترمیم نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن کیا کیجئے کہ انسانی علم ہے ہی اتنا ناقص کہ قانون بنانے کے بعد بھی ترمیمات ہونے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک زمانے میں قانون Gravitational Law کو ترمیم سے بالا سمجھا جاتا تھا لیکن آئن شائین نے آ کر اس کو بھی ناقص قرار دیکر اس میں ترمیم کر ڈالی۔ سر جیمز جین کے نزدیک بیسویں صدی کی سب سے بڑی دریافت بھی آئن شائن کی تھیوری ہے۔ لطف یہ ہے کہ قانون کو ایک تھیوری نے توڑ ڈالا۔ حالانکہ تھیوری قانون سے کم درجہ پر ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ نظریہ ارضافیت کو ابھی تک قانون کا مقام نہیں دیا جا سکا۔ اس طرح سائنس آہستہ آہستہ بھٹک بھٹک کر تلاش حقیقت کے راستے پر رینگ رہی ہے۔

غیر سائنس دانوں کی سائنس پرستی

جو لوگ سائنس کے اس پورے نشوو ارتقا سے واقف ہیں، وہ جب آرٹس کی ڈگریاں لینے والے اصحاب کو سائنس کی تھیوریوں (مثلاً ڈارون تھیوری) کو قرآن پر ٹھونسنے کے لیے کوشاں دیکھتے ہیں تو اس طفلانہ مشغلے پر ان کو ہنسی آ جاتی ہے۔ قرآن کو مغربی نظریات کے تابع بنانے کے لیے جن حضرات نے پچاس برس میں سرگرمی دکھائی اور ان میں جو ٹیم آج میدان میں معرکہ آرا ہے، یہ سب لوگ سائنس کی تسبیح پڑھتے ہیں مگر اپنے زمانہ تعلیم میں سائنس سے فرار کر کے انہوں نے آرٹس میں ڈگریاں لیں۔ پس یہ حضرات نہ تو اسلام سے کماحقہ واقف ہیں اور نہ

سائنس سے (البتہ سائنس سے مرعوب ضرور ہیں) اور رٹ دونوں کی لگاتے ہیں۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

ایک چھوٹا سا اہم انکشاف

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یونانی سائنس کے بانی تھے۔ لیکن جدید کھدائیوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ بابل اور اس کے اردگرد کے لوگ (جس علاقے میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے) Euclid کے مشہور تکونی مسئلہ کو Eculid سے سترہ سو سال پہلے جانتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تکونی شکلیں جو مٹی کی تختیوں پر دستیاب ہوئی ہیں، اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

قدیم بیٹری سیل

مزید سنئے کہ ہمارے پیغمبروں کی سرزمین مشہور شہر بغداد کے قریب سے بجلی کا ایک سیل (Cell) کھدائی میں نکلا ہے، جس کا حال جارج گیمو (GEORGE GAMOW) مشہور ایٹمی سائنس دان نے لکھا ہے۔ اور یہ رائے قائم کی ہے کہ بجلی کے سیل اس زمانے میں زیورات پر سونے کا پالش چڑھانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں یہ علم دنیا سے ناپید ہو گیا اور پھر زمانہ قریب میں Dottore Galvani نے اس کو دوبارہ دریافت کیا۔

انبیاء کے متعلق شواہد

تھوڑا عرصہ پہلے تک تاریخ کے ماہرین حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسفؑ علیہ السلام وغیرہ کے واقعات کو محض افسانہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان شخصیتوں کے وجود کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ لیکن زمانہ حال کی کھدائیوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ پیغمبر تھے اور ان جلیل القدر حضرات نے تبلیغ کے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بین الاقوامی پیغمبر تھے اور انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے براعظموں میں بہت سے تبلیغی سفر کیے۔ امریکہ کے رسالہ لائف نے اپریل ۱۹۶۵ء میں جو بائبل نمبر نکالا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس کا ثبوت بہم پہنچ چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سفر کسی تجارتی یا دنیوی مقصد کے لیے نہ تھے، بلکہ صرف مذہبی مقاصد کے لیے تھے۔

موجودہ دور میں خود بائبل کے علمبرداروں نے بائبل کے بہت سے مندرجات کو غیر صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا۔ لیکن اب آپ کے معاشرہ کے قومی قوانین کی جو تختیاں برآمد ہوئی

ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے قبیلہ میں قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز سردار بوڑھا ہو جاتا تھا تو وہ اپنی بیوی کو بہن کا لقب دے دیتا تھا اور ان معروف روایت کو باعث اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ پس جب مصر میں آپ نے اپنی بیوی کو بہن کہا تو اس کا مطلب حقیقی معنوں میں بہن قرار دینا نہ تھا، اور نہ مقصد جان بچانا تھا، بلکہ انہوں نے اہل مصر پر اپنا خاندانی مرتبہ واضح کیا کہ وہ قبیلہ کے شیوخ میں سے ہیں۔ لیکن جب سینکڑوں سال بعد لوگوں نے بائبل لکھنا شروع کی، اس وقت پچھلی روایات و اصطلاحات ختم ہو چکی تھیں اور قانون بدل چکے تھے۔ پس حضرت ابراہیم کے متعلق جو روایات تورات میں چلی آ رہی تھی، اس کی انہوں نے قیاساً ایک غلط توجیہہ کر ڈالی۔

رسالہ لائف کے خاص نمبر میں اس واقعہ کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق بائبل کی اُس روایت کو بھی غلط قرار دیا گیا ہے کہ انہوں نے (نعوذ باللہ) اپنے باپ کو دھوکہ دے کر نبوت حاصل کی اور جدید تحقیقات سے حاصل شدہ ثبوت فراہم کر کے آپ کو اور آپ کی والدہ کو فریب دہی کے الزاموں سے بری ثابت کیا ہے۔ جو بائبل میں لگائے گئے تھے۔

ایک روسی سائنس دان کے مطالعات

مغربی سائنسدان کے انکشافات اور ان پر مبنی قیاسات سے اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی کہ بعض نئے روسی سائنسدانوں کی دریافت سے ہوتی ہے۔ اب روسی سائنسدان بھی خدا اور بائبل کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلہ میں پراگریس پبلشرز ماسکو کی شائع کردہ ایک کتاب بڑی دلچسپ ہے جس کا نام "بہ جادۂ انکشاف" (On the Track of Discovery) ہے۔

اس کتاب میں روسی ماہر طبیعیات میٹسٹ اگریسٹ (Mstest Agrest.) لکھتا ہے کہ نیچر کے دائرے میں بہت سے ناقابل عجائبات ہیں اور ان کی تعداد سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

قدیم باتوں کی نئی توجیہات

اس کی مثال دیتے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ دنیا کے بعض حصوں میں شیشہ نما عجیب چیزیں پائی گئی ہیں جن کو Tektites کہا جاتا ہے۔ ان میں ریڈیائی الومنیم اور بریلیم پائی جاتی ہے۔ ان کے متعلق اب تک کے قائم کردہ نظریات تسلی بخش نہیں ہیں اور Tektites کا وجود آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔ پھر یہ خالص مادیت پرست اور عقلیت زدہ معاشرے کا سائنس دان پرانی مذہبی اور روایتی داستانوں (Legend) کو اہمیت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ بہت سی پرانی کہانیاں ہم کو ملتی ہیں جن میں لوگوں کے آسمان پر جانے اور آسمان سے لوگوں کے زمین پر آنے کا ذکر ملتا

ہے۔ اسی طرح بائبل میں جو کہ سب سے پرانی لکھی ہوئی ہے چیزوں میں سے ہے، ہم یہ درج پاتے ہیں کہ قدیم زمانے میں زمین پر جن دیو رہتے تھے۔

ایسی ہی ایک اور مثال پر بحث کرتے ہوئے روسی طبعیات داں کہتا ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگ بہت سی ایسی باتیں جانتے تھے جو ہمارے موجود علم کے مطابق صرف پچھلے سو سال کے عرصے میں ایجاد ہونے والے جدید آلات سے ہی ثابت کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک قابل غور بات یہ ہے کہ مشتری کے گرد جو چاند گھوم رہے ہیں ان کا ذکر ہم کو جدید سائنسی دریافت سے بہت پہلے کی روایات میں ملتا ہے۔ یہ سائنسی دریافت ۱۸۷۷ء میں Asaph Hall نے کی۔ حقیقت میں فرانسیسی ماہر فلکیات بیلے (Baily) نے اس روایت کو بنیاد بنا کر یہ رائے دی ہے کہ قدیم زمانے میں ایک قوم ایسی گزر چکی ہے جو فلکیات کے علم میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ یہ قوم اب ناپید ہو چکی ہے۔ یہی نظریہ مشہور جرمن ماہر فلکیات و ریاضی دان کارل گاس Carl Gauss نے اپنے لیکچروں میں ۱۸۱۹ء میں بیان کیا تھا جو اس نے نظریاتی فلکیات (Theroetical Astronomy) کے موضوع پر دیئے تھے۔

سنگین معمے

بڑی بڑی جسامت (Structures) کے قدیم کھنڈرات دنیا کے مختلف حصوں میں ملتے ہیں جو عقل انسانی کے لیے معمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور تاریخی ہیکل Trillthow جو بعلبک میں Anti-Lebnon پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے وہ بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہے جو ذرا بھدے طور سے تراشے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض ۲۰ میٹر (۷۰ فٹ) لمبے ہیں اور جن وزن ایک ہزار ٹن ہے۔

یہ بھاری پتھر ایک کان سے کاٹے گئے تھے، اور زمین سے ۷ میٹر (قریباً ۲۵ فٹ) اوپر اٹھائے گئے تھے۔ یہ ایسا کام ہے جو کہ موجودہ دور کے سائنس دانوں کے لیے اپنے تمام آلات کی مدد سے بھی کٹھن ہے۔ ایک ایسا ہی بڑا پتھر جو ۲۱ میٹر (۷۰ فٹ) لمبا اور ۴۸ میٹر (۱۶ فٹ) چوڑا اور ۴.۲ میٹر (۱۴ فٹ) اونچا ہے۔ یہ پتھر تراشا تو گیا ہے، لیکن چٹان سے کاٹ کر بالکل علیحدہ نہیں کیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کو تراشا وہ اسے یونہی کان میں چھوڑ کر چلے گئے۔ روسی مصنف کا اندازہ ہے کہ چالیس ہزار آدمی مل کر اس کو اپنی جگہ سے بمشکل کھسکا سکتے ہیں۔ وہ سوال یہ اٹھاتا ہے کہ ان جناتی چٹانوں کو کس نے کاٹا؟ کب اور کس مقصد کے لیے؟ یہ ایک حل

طلب معمہ ہے۔ آج بہت سی ایسی باتیں جو ناقابل یقین اور بناوٹی سمجھی جاتی تھیں، سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ اور پھر یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ تہذیب کی ترقی نے بار بار ہمیں اپنی تاریخی سمجھ بوجھ (Historical Commonsense) پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس لیے ان معموں اور دیگر معموں پر ہمارے مرتب کردہ نظریات کی روشنی میں دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور ان سوالات کے جوابات تک پہنچنے کے لیے نئے طریقوں سے کاوش کرنا لازم ہے۔ آخر کن لوگوں نے یہ بڑی بڑی عمارات بنائیں؟

چالیس فٹ لمبے انسان

اس بحث کو چھیڑ کر روسی ماہر طبیعیات نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ بڑے بڑے پتھر ان لوگوں نے کاٹے ہیں جو کسی زمانے میں مشتری سے زمین پر آئے تھے۔ یہ کچھ عرصہ یہاں ٹھہرے اور محیر العقول کام کیے۔ خوش قسمتی سے سائنس دان مذکور کو ایک غار میں ایک ڈرائنگ بھی مل گئی جو مصنف کی رائے میں خلا بازوں (Spaceman) کے لباس میں ملبوس شخص سے ملتی جلتی ہے اور ۶ میٹر (۲۰ فٹ) لمبی ہے۔ تصویر چونکہ آدھے بالائی حصہ جسم کی ہے، اس لیے اندازہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا قد تقریباً ۴۰ فٹ تھا۔

مسلمان کے نقطہ نظر سے

لیکن اس کے برعکس جب مسلمان کے سامنے جناتی چٹانوں کا متذکرہ معمہ آتا ہے، جن کو روسی سائنس دان خود بھی جناتی چٹانوں کا نام دیتا ہے، تو قرآن کا علم رکھنے والا شخص فوراً پکار اٹھے گا کہ یہ کام تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے جنوں کا ہے۔

(چاہے وہ مشتری سے آئے ہوں یا زمین پر رہنے والے ہوں) ذرا سورۂ سبا کی متعلقہ آیات کے ترجمے پر غور فرمایئے:

> اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس (ہوا) کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی (راہ) ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی (راہ) ہوتی۔ اور ہم نے اس کے لیے تانبہ کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں بعضے وہ تھے جو ان کے رب کے حکم سے ان کے آگے کام کرتے تھے۔ اور (ہمارا فیصلہ تھا کہ) ان میں سے جو شخص ہمارے (اس) حکم سے سرتابی کریگا ہم اس کو (آخرت میں) دوزخ کا عذاب چکھا

دیں گے۔ وہ جنات ان کے لیے وہ وہ چیزیں بناتے ہیں جو ان کو (بنوانا) منظور ہوتا۔ بڑی بڑی عمارتیں اور پیکر اور لگن (ایسے بڑے) جیسے حوض اور (بڑی بڑی) دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے داؤد کے خاندان والو! تم سب شکر (ادا کرنے) کے لیے نیک کام کیا کرو۔ اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔ پھر جب ہم نے ان پر موت کا حکم جاری کر دیا تو کسی چیز نے ان کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے عصا کو کھاتا تھا۔ سو جب وہ گر پڑے تب جنات کو حقیقت معلوم ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔

تفسیری روایات میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک لمبے عرصہ تک لکڑی کے عصا کا سہارا لیے رہے اور جن آپ کو زندہ سلامت سمجھ کر عمارتیں بنانے کا کام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب دیمک نے عصا کو کھا لیا اور عصا کے ٹوٹنے سے آپ کا جسد مبارک گر پڑا تو اس وقت جنوں کو اندازہ ہوا کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔ ان کی وفات کا علم ہوتے ہی سارے جن کام چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔

راقم کی رائے میں یہ چٹان اسی زمانے سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے ادھوری کان کے اندر رہ گئی ہے۔ ورنہ اس کام کو نامکمل چھوڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ دیگر یہ کہ پتھر تراشنے کا کام قدرے بھدے طریقے سے کیا گیا ہے، اس میں بہت اعلیٰ درجہ کی صفائی نہیں ہے۔ اس سے بھی یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کام کو ماہر سنگ تراشوں نے نہیں، بلکہ جنوں نے سرانجام دیا ہے۔

مسئلہ کا ایک اور پہلو

بعلبک کے متعلق ثابت ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قلمرو میں شامل تھا۔ لیکن ہیکل سلیمانی کی طرح بعلبک میں آپ کا کوئی بلڈنگ بنوانا عام طور سے مشہور نہیں۔ لیکن اس مسئلے پر مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم نے یاقوت حموی کی معجم البلدان اٹھائی تو ملعوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بعلبک میں ملکہ بلقیس کے لیے محل بنوایا تھا۔ ان کے خاص الفاظ یہ ہیں:

غالباً ہیکل سلیمان کی تعمیر سے فراغت کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو بعلبک میں محل بنانے کا حکم دیا ہوگا۔ یا ممکن ہے کہ ساتھ ساتھ دونوں جگہ تعمیر چل رہی ہو۔ غرضیکہ

قرآنی آیات سے اس ادھورے جناتی پتھر کا معمہ صحیح طور پر حل ہو جاتا ہے۔ پھر قرآن میں (سورہ ص) حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے "اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی اور کو نہ مل سکے" پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہوا، اور جنوں وغیرہ پر ایسی حکومت دی کہ اس کے اثرات آج بھی روسی و دیگر سائنسدانوں کے لیے معما بنے ہوئے ہیں۔ اور سب لوگ انگشت بدنداں ہیں۔ رہا ۲۰ فٹ لمبی تصویر کا معمہ۔ تو یہ تصویر ایک جن کی خیالی تصویر سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ تصویر تو خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن نامکمل چٹان تو حقیقت ہے۔ اس لیے اصل معما جناتی چٹانوں کا ہے جو قرآنی آیات سے بہترین طور پر حل ہو جاتا ہے۔

زرتشت کے متعلق تاریخی تحقیقات

موجودہ زمانے میں اسلام اور قرآن کی تائید میں جو باتیں سامنے آرہی ہیں وہ واقعی بہت حیران کن ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کچھ متجددین پانچ نمازوں کا انکار کر کے صرف تین پر گزارا کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر جدید تاریخی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ زرتشت کے مذہب میں بھی پانچ نمازیں تھیں۔ T.R.Sethina اپنی کتاب "ایرانی پیغمبر زرتشت "Zarthushtra the prophet of Iran میں صفحہ ۶۲ پر لکھتے ہیں کہ دن کو پانچ Gahs میں تقسیم کیا گیا تھا اور پانچ مرتبہ عبادات واجب تھی۔ اوقات حسب ذیل تھے:

1. From sun rise to noon (چاشت)
2. From noon to 3 p.m. (ظہر)
3. From 3 p.m. to sunset (عصر)
4. From sunset to midnight (مغرب وعشا)
5. From midnight to sunreise (تہجد وفجر)

علم کا نامعلوم دروازہ

بہت سی باتوں میں موجودہ زمانے کی سائنس اور اس کے پیدا کردہ فلسفی، مذہبی اور روحانی علوم کے مقابلے میں بری طرح پیچھے ہیں۔ مثلاً عمل انتقال خیالی (Telepathy) کے متعلق فرائڈ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا یہ حقیقت ہے یا نہیں ولیم جیمز نے بھی تذبذب کا موقف اختیار کیا ہے۔ لیکن آج کل نفسیاتی سائنس کے عالم ٹیلی پیتھی کو تسلیم کر چکے ہیں اور اس پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ جس حقیقت کی کہیں اب جا کر ایک جھلک سائنس دانوں کو نظر آئی ہے، الہامی معلمین اور

روحانی عالم ہزاروں سال سے اسے جانتے، برتتے اور پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ہمارے علم کلام میں انتقال خیالی، اور علم پیشین سے لے کر الہام والقا اور وحی تک ایک متفقہ حقیقت ہے۔

ابتدا عقیدہ توحید سے ہوئی!

اسی طرح اسلام، قرآن اور توریت کا نظریہ یہ ہے کہ وحدانیت کو بنی نوع انسان شروع ہی سے تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن بعض سائنس دان اور جدید عقلیت پرست فلسفی اس کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ انسان پہلے پہل جس جس چیز سے خوف کھاتا تھا اس کو پوجتا تھا۔ اس طرح اس نے بہت سے خداؤں اور دیوتاؤں کا تصور پیدا کر لیا۔ بعد میں آہستہ آہستہ ذہنی ارتقا کے ذریعے وحدانیت کا ظہور ہوا۔

لیکن موجودہ زمانے میں افریقہ کے بعض محروم علم Pygmy قبائل جو ہمیشہ سے تہذیب وتمدن اور باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رہے ہیں، ان کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ان میں بھی وحدانیت موجود ہے اور شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس سے بعض نئے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان شروع ہی سے ایک خدا کا قائل رہا ہے۔

گویا اسلام کے اس نظریے کی تائید ہو رہی ہے کہ دراصل توحید ہی انسان کا اصلی مذہب تھا اور بعد میں لوگ جب بگاڑ کا شکار ہوئے تو انہوں نے شرک کی راہیں نکالیں۔ ان کی اصلاح کے لیے بار بار پیغمبر آتے رہے اور لوگوں کو توحید کی راہ پر ڈالتے رہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس کے شواہد کثرت سے ملتے ہیں۔

سدومیوں کی تباہی کا واقعہ

قوم لوط کے مسکن Sodom اور گومورا Gommorrah کی تباہی کے جو واقعات بائبل میں درج ہیں، ان کے بارے میں روسی سائنسدان پروفیسر اگریسٹ نے اپنی تصنیف میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کی نوعیت ایٹمی دھماکے کی سی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے واقعہ کی تفصیلات بیان کر کے اس میں سے ایسے پہلو اجاگر کیے ہیں جو ایٹمی دھماکے کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے کہ یہ اس مادہ پرست اور ملحد سرزمین کا سائنس دان ہے جہاں مذہب دشمنی ایک اصول کی حیثیت سے نافذ چلی آ رہی ہے، اور پھر اس کا دائرہ تحقیق بھی خاص طور پر طبعیات ہے اور طبعیات کا موضوع مادہ ہے۔ اب اسی سرزمین سے بائبل کی مذہبی روایات (جو صحیح ترین شکل میں قرآن میں مندرج ہیں) کی توثیق ہونے لگی ہے اور وہ بھی مادی سائنس کے ذرائع سے۔

ع یہاں تک تو پہنچے، یہاں تک تو آئے

ہواؤں کی بارآوری

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم نے بارآور کرنے والی ہوائیں بھیجیں" اب علم نباتات والے جانتے ہیں کہ کس طرح ہواؤں کے ذریعے نر درختوں کے Pollens مادہ درختوں تک پہنچتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسی احسان کی طرف اشارہ ہے کہ ہوائیں کس طرح چل کر پھلوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن کا بیان کردہ قانون زوجیت (کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا) بھی ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے قرآن حدیث اور سائنس کی مختلف شاخوں کا علم ضروری ہے جو آجکل بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ جس طرح کسی زمانے میں منطق وغیرہ کو درس کا جزو بنایا گیا تھا، اسی طرح آج سائنس کو بھی درس نظامی کا جزو بنایا جانا چاہیے۔

"قانون زوجیت" کا ایک اہم اطلاق

قرآن نے قانون زوجیت (جس کی ایک شاخ قانون اضداد بھی ہے) کو بیان کرتے ہوئے۔ بعض جگہ لطیف اشاروں سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ جہاں دنیا بھی تنہا نہیں ہو سکتی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا ہونا قانون زوجیت کا تقاضا ہے۔

اس بحث کے حق میں حال ہی میں "کاروانِ سائنس" (ج ۴۔ شمارہ ۴،۳) میں ایک اچھا معلوماتی مقالہ شائع ہوا ہے۔ جسے مدیر مجلہ جناب عظمت علی خان نے قلمبند کیا ہے۔ عنوان ہے "مادہ اور ضد مادہ۔" اس مضمون میں ایک دلچسپ اور اہم نظریے کی مختلف کڑیوں کی دریافت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ دریافت ہوا کہ مادہ کے ساتھ ذرات کے ساتھ "ضد ذرات (Anti-Particles) بھی پائے جاتے ہیں، پھر الیکٹران کے بالمقابل ضد الکٹران (Anti Electron) انکشاف ہوا۔ پھر ضد نیوٹران (Anti Neutron) اور ضد ڈیوٹران (Anti Veutron) کا علم ہوا۔ پھر آگے چلے تو وحدت نظر کائنات کے اصول کے تحت بات یہاں تک پہنچی کہ مادہ کے بالمقابل ضد مادہ (Anti Metter) کا وجود بھی ہے پھر کہکشائی نظام کی ضد کا تصور (Anti Galaxies) پیدا ہوا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ:

"......آج کے بیشتر ماہرین طبیعیات و ریاضی کا خیال ہے کہ خلا میں کسی نہ کسی ہماری اس کائنات کا بھی آئینوی توام (Looking Glass Twin) یا عکس موجود ہے ان کو یہ بھی یقین ہے کہ کائنات کے اس توام کا وجود لازمی طور پر ہونا چاہیے۔"

یعنی اس نظریے کا ایک سرا تو مسئلہ اعیان سے جا ملتا ہے اور دوسرا سرا اسلام کے تصور آخرت سے، کوئی اور دنیا بھی ہے جس کا نظام اس دنیا کے ساتھ شدید مماثلتیں رکھنے کے باوجود مختلف بھی ہے۔ اس نظریے کے حاملین بھی یہ کہتے ہیں کہ ایک طرف یہ دونوں دنیا باہم دگر ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہ ان میں ''تشاکل'' موجود ہے۔

مسلمانوں کی تباہی

افسوس اس بات کا ہے کہ جو تحقیقات موجودہ زمانے میں ہو رہی ہیں، ان میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے۔ اور تو چھوڑیے، حال ہی میں بحیرہ مردار سے برآمد شدہ طوماروں اور پلندوں (Dead Sea Scrolls) تک سے مسلمانوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، حالانکہ تاریخی و مذہبی ریکارڈ کے اس دفینہ کی برآمدگی ان کے گھر کا معاملہ تھی۔ تحقیقاتی سرگرمیوں سے مسلمانوں کی یہ بے تعلقی غیر مسلم محققین کو موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے لادینی یا مذہبی نقطہ ہائے نظر یا سیاسی اور سامراجی مفاد کے مطابق جس طرح چاہیں کسی دریافت شدہ چیز کی توجیہہ کریں۔ اور جن نامطلوب اجزاء کو چاہیں، بالکل نظر انداز کر جائیں۔ ذرا سوچیے کہ اب جبکہ غیر مسلم بلکہ بسا اوقات اسلام دشمن اور مذہب دشمن محققین کے اخذ کردہ نتائج بھی قرآن کی صداقت کو واضح کرنے میں معاون ہوتے ہیں، اگر خود مسلمان آگے بڑھ کر سائنسی اور تاریخی تحقیق کے میدانوں میں اُتریں تو وہ زیادہ صحیح علمی نقطہ نظر اور جذبہ ایمانی سے کام لے کر مطالعات و مشاہدات کو ''قرآنی حقائق'' کے تابع ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ اگر خود براہ راست ابھی کسی وسیع تحقیقی مہم کا آغاز نہیں کر سکتے تو کم از کم دوسروں کے فراہم کردہ مواد اور معلومات کا جائزہ تو لیں، دوسروں سے مل کر کام کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر استعمال کریں اور ان کی غلطیوں پر گرفت کریں۔

لیکن مشکل یہ بھی تو ہے کہ جہاں موجودہ زمانے کے عام مسلمان، سائنس کو دوسروں کی جاگیر سمجھے ہوئے ہیں، وہاں مسلمان سائنس دانوں کو ذہنی غلامی کا روگ لگا ہوا ہے، اور وہ ہر مفروضے، نظریئے اور قانون پر بے چون وچرا ایمان لے آتے ہیں جو غیر مسلم دماغوں نے مرتب کر کے ان کے سامنے رکھ دیا ہو۔ بلکہ بسا اوقات وہ اُن باطل فلسفوں کے بھی پرجوش وکیل بن جاتے ہیں جو مغرب کی ملحدانہ ذہنیت نے قیاس سے کام لے کر سائنس کی تحقیقاتوں کی اساس پر کھڑے کیے ہیں، اور پھر اُن کے حق میں اُونچی علمی سطح پر نہایت زبردست پروپیگنڈا کیا ہے۔

یہ کیفیت قرون اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ کے سائنسدانوں میں بہت ہی کم دیکھی جاتی ہے۔ اس کے لیے ایک سادہ سی مثال سامنے آتی ہے جو اُن کی ذہنی آزادی کی دلیل ہے۔ جب عربوں

نے جالینوس کے یونانی طریق علاج کو اپنایا تو انہوں نے دواؤں کے یونانی سسٹم سے کھچروں کو بالکل خارج کر دیا۔ جڑی بوٹیوں کے کھچروں کے بجائے انہوں نے معجونیں، چٹنیاں، مربے اور شربت وغیرہ تیار کر کے نئی راہیں نکالیں۔ ان میں سے بعض چیزیں زمانہ حال کے جدید ایلوپیتھک فارما کو پیا اور کوڈیکس میں موجود ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے مسلمانوں نے مغربی طب کو اپنایا تو ان میں کوئی ادنیٰ ترمیم کرنے کی جرأت موجود نہ تھی۔ انہوں نے عیسائیوں کی طرح متروک کھچروں کو چپ چاپ قبول کر لیا۔ ہمارے ڈاکٹر اور دواساز ابھی تک الکوحل تک کو ترک کرنے کا اقدام نہیں کر سکے، حالانکہ الکوحل کے مقاصد پورے کرنے کے لیے مسلمان اطبا قرنوں پہلے دوسری موثر تدبیریں پیش کر چکے ہیں۔
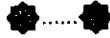
اسلام عصری علوم کا مخالف نہیں ہے

عمر فاروق التیمی

اسلام ایک عالم گیر مذہب اور نظام حیات ہے جو ملت کو نہ صرف دینی کامیابی و کامرانی کے وسائل فراہم کرتا ہے بلکہ دنیوی ترقی و سر بلندی بھی عطا کرتا ہے۔ دین اسلام دوسرے ادیان و مذاہب سے اسی لیے ممتاز ہے کہ اس کے اصول وضوابط ہر دور کے مطابق جامع و مانع ہیں۔ وہ جس طرح دین کے فرائض و واجبات کے احکام بتلاتا ہے اسی طرح اخلاق کریمہ وحسن معاملہ پر بھی زور دیتا ہے حتیٰ کہ دنیوی اعتبار سے فرائض و واجبات کی ادائیگی اسی وجہ سے ہوتی ہے جبکہ برائیوں کا قلع قمع ہو، ملکوتی صفات اجاگر ہوں۔ فواحش ومنکرات سے پرہیز واجتناب کیا جائے اور سماج ومعاشرہ پر دینی نظام کا سکہ جمایا جاسکے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ''آپ نماز قائم کیجئے بلاشبہ نماز غلط حرکات اور لغویات کے لیے سم قاتل ہے۔'' معلم کائنات صادق المصدوق ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ جس شخص کی نماز اس کو غلط اعمال و کردار اور فواحش ومنکرات سے نہ روکے نیز جس کا روزہ بدگوئی، خیانت، بدعہدی اور بے وفائی سے باز نہ رکھے اس کی نماز نہ قبولیت کے درجہ کو پہنچتی ہے اور نہ ایسے روزہ دار کی بھوک پیاس اللہ کو مطلوب ہے۔ الغرض اسلام کے اصول وضوابط انسان کو اخلاق کریمہ کے اعلیٰ مراتب پر فائز کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اندر ایسی اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کائنات میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ دنیا کا بھی معائنہ ومشاہدہ کرے خود رب العالمین نے بنی نوع انسان کو دعاء کرنے کا طریقہ اسی طرح سکھایا:

> اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں خیر عطا فرما اور آخرت میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر اور عذاب نار سے محفوظ رکھ۔ (سورۃ بقرہ:۲۰۱)

مذکورہ آیت سے انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ پہلے دنیوی بھلائی کی دعا مانگے پھر آخرت کی کامیابی کی التجا کرے، اسی طرح اگر ایک طرف اقیموا الصلوٰۃ فرمایا گیا ہے تو دوسری

طرف اس امر کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ:

یعنی مخالفین و معاندین اسلام کے لیے اپنی مدافعت وحفاظت کی خاطر قوت بناؤ جس قدر تم سے ممکن ہو۔ (سورۃ انفال)

عصر حاضر کے اس عروجی دور میں جب کہ تمام قومیں ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں ہم اب تک بے دست و پا محتاج و مفلوک الحال ہو کر ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری قومیں اس زمین سے بے بہا خزانے پیدا کر کے چاند ستاروں کی سیر کر چکیں۔ لیکن ہم اب تک زمین میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ ان کی ترقی کے اسباب کیا ہیں ہم نے انہیں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علاوہ ازیں ہم آپس میں مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ اگر کسی نے زمانے کی رفتار دیکھ کر عصری علوم کو فرض قرار دیا اور صرف انھی کو اپنی نجات کا ضامن تصور کر لیا۔ تو دوسرے نے فتویٰ دے دیا کہ مسلمان کو اپنے مذہب پر کار بند رہنے کے لیے صرف اسلامیات کی تعلیم دی جانی چاہیے، علوم عصریہ اس کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ الحاد و دہریت کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے انسان دینی اعتبار سے مریض ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسے ہلاکت و بربادی کی نظر ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ لیکن یہ دونوں قسم کے خیالات و نظریات افراط و تفریط سے خالی نہیں ان میں ایک اعتدال کی راہ ہے قرآن میں فرمایا گیا: میں نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ (سورۃ بقرہ) تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کو فلاح و کامرانی کی راہ دکھانے کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ (سورۃ آل عمران) غلبہ و نصرت صرف اللہ اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بے شمار آیتیں ملیں گی جن میں اہل اسلام کی فوقیت و برتری ساری دنیا پر ظاہر کی گئی ہے۔ اسی طرح معلم کائنات ﷺ کی متعدد حدیثیں بھی اس بات پر ذکر کی جا سکتی ہیں کہ اسلام کو تمام مذاہب پر اور مسلمانوں کو جملہ بنی نوع انسان پر برتری و سربلندی حاصل ہے۔

آئیے ذرا سوچیں کہ ہماری رفعت و ترقی اور تفوق و برتری کس منزل میں ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج دنیا میں سب سے پسماندہ قوم مسلمان ہے اسلام کا نقش آئے دن دھندلا پڑتا جا رہا ہے اور ہم جس تعلیم کو لے کر اس دنیا میں آئے تھے انہیں طاق نسیان کر کے ہم نے غربت و پسماندگی کی زندگی کو ترجیح دی ہے؟

ہمیں خالق کائنات نے اپنا خلیفہ بنایا لیکن ہم نے اپنے طرز عمل سے اس معزز عہدے کو ٹھکرا دیا اور در در کی ٹھوکریں کھانے لگے ہمیں صراط مستقیم کی تعلیم دی گئی تھی۔ لیکن آج ہم ضلالت و بے راہ روی میں پیش پیش ہیں، ہمیں خیر امت کے لقب سے سرفراز کیا گیا تھا لیکن ہم نے اس کی

کوئی پرواہ نہ کی۔ ہمیں مخالفین کے لیے مدافعانہ طریق پر تیار رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

جس طرح تاریخ اس حقیقت کی گواہ اور شاہد عدل ہے کہ دنیا میں جس قوم نے علوم و فنون میں ترقی کی اور اسے اپنا شیوہ بنایا وہ تمام دنیا پر فائق و ممتاز رہی بالکل اسی طرح یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے لیکن علوم عصریہ جدیدہ میں کوئی ایسا علم نہیں ہے جس کی نشان دہی قرآن میں نہ فرمائی گئی ہو اور مسلمانان عالم اس پر پروانہ وار جا گرے ہوں۔ علم الکیمیا، علم الحیات، علم الحساب، علم السیاسۃ، علم الافلاک غرضیکہ کوئی ایسا علم عقلی نہیں ہے جس میں مسلمانوں نے مہارت نہ حاصل کی ہو اور ان علوم پر ہزار ہا تصانیف نہ چھوڑی ہوں آج جن کو اپنا کر اہل یورپ دنیوی کامرانی کی منزلیں طے کر رہے ہیں اگر ان سب کا مطالعہ کریں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان جملہ علوم وفنون کے بانی اہل اسلام تھے لیکن آہ۔

لے اڑی طرزِ فغاں بلبل نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے

کاش مسلمان سوچیں اور غور کریں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فطرت کی تمام قوتوں کو ختم کیا جائے اور ان کو مسخر کر کے اپنے کام میں لایا جائے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے: آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

علوم عصریہ کی بنیاد تجارت اور نظریات دونوں پر ہے اور قرآن نے بھی عقل و تجربہ دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے ایک جگہ فرمایا: آسمان اور زمین کی تخلیق میں دن رات کے الٹ پھیر میں ان جہازوں میں جو سمندروں میں سے گزرتے ہیں بارش میں جسے اللہ آسمان سے نیچے پھینکتا ہے اور جس سے وہ زمین کو موت کے بعد کی زندگی عطا کرتا ہے اور ہر قسم کے جانور روئے زمین پر زندہ رکھتا ہے۔ ہواؤں کی تبدیلی میں اور بادلوں میں جو آسمان وزمین کے درمیان مسخر ہیں ان تمام چیزوں میں عقلمندوں کے لیے کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن اعلان کرتا ہے: وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ علم وبصیرت سے کام لینے والوں کے لیے ہم نے اپنی نشانیاں بڑی تفصیل سے بیان کیں ہیں۔

قرآن بار بار مشاہدہ اور تفکر وتدبر پر زور دیتا ہے۔ مشاہدہ کرو آسمان وزمین کیا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کیا غور وفکر نہیں کرتے کیا نظر وبصیرت سے کام نہیں لیتے؟

اور اسی قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو غور وفکر اور مشاہدہ وتدبر کی دعوت دی گئی ہے ان آیات کی روشنی میں کیا یہ حقیقت منکشف ہو کر سامنے نہیں

آ جاتی ہے کہ اسلام کے مطالبہ کے مطابق مسلمانوں کو علوم جدیدہ عصریہ میں بھی مہارت حاصل کرنی چاہیے۔

قرآن کی یہ تعلیم محض لفظی نہیں ہے بلکہ خلفاء راشدین، صحابہ عظام اور اسلاف کرام نے اس پر عمل کر کے ساری دنیا پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا اور "ولاتنس نصیبک من الدنین" کے پیش نظر انہوں نے خلیفہ فی الارض کا حقیقی کردار ادا کیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں صحابہ کرام عربی کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھتے تھے اور معلم کائنات نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ باہر سے آئے ہوئے وفود کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو تبلیغ اسلام کی راہ میں نہ صرف رکاوٹوں کی خلیج حائل ہوتی بلکہ ہم اور آپ آج اسلام سے فیض یاب نہ ہوتے۔

اس زمانے میں تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی خاطر دوسری زبانیں سیکھی جاتی ہیں لیکن آج مسئلہ محض اشاعت اسلام کا نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں عربی و اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں اسلام کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔ یہودیت و عیسائیت نے اسلام کے خلاف اپنی تجوریاں کھول رکھی ہیں اور انگریزی لٹریچر کے ذریعہ ہمارے خلاف غلط بیانیوں کا ایک طوفان کھڑا کر رکھا ہے۔ لیکن ہماری سادہ لوحی تو دیکھئے کہ ہم ان زبانوں کو نہ سیکھنے کا فتویٰ داغ رہے ہیں۔ کیونکہ ان سے "دہریت" و "لادینیت" کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ آج جو عربی مدارس کے علماء و فضلاء سند فراغت لے کر عملی میدان میں اترتے ہیں تو ان کی کیفیت موجودہ حالات میں بالکل اسی طرح ہوتی ہے۔

بے رحیم سوالات کی بارش میں کھڑے ہیں۔
اوراق لیے فلسفہ و علم کے سادے

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر تبلیغ دین، اشاعت اسلام اور دفاع عن الحق کا فریضہ انجام دے سکیں؟

اپنے ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب تک ہمارے اسلاف نے اپنے اوپر اعتماد کرتے ہوئے تمام علوم حاصل کیے اور کسی کے محتاج نہ رہے اس وقت تک وہ ترقی و برتری کے قطب مینار نصب کرتے رہے لیکن جب انہوں نے دوسرے علوم سے غفلت برتی اور فنون جدیدہ سے لاپرواہ رہے تو عروج و ترقی ان کا حصہ بن گئی جو علوم عصریہ میں آ گئے تھے۔

تاریخ کی اس تلخ حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم واعدوا لھم ما استطعتم کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان نہ صرف آلات حرب تیار کریں بلکہ وہ ہر قسم کی استعداد و صلاحیت کے

مالک ہوں، بلاشبہ قوت کا ناجائز استعمال انسانیت پر اور دنیا کے امن وامان پر بدترین ظلم ہے۔ لیکن اپنی خودداروباوقار زندگی کے لیے قوت کا تحفظ ایک دینی وملی فریضہ ہے۔ اس لیے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے متبعین ہر لحاظ سے تفوق و برتری حاصل کریں تاکہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسانوں کی قیادت کرسکیں۔ اپنی صلاحیت واستعداد کو بروئے کار لاکر دنیا کی زمام اقتدار سنبھالنے کے لائق بنیں اور خدائی فرمان: کنتم خیر امة اخرجت للناس (سورۃ آل عمران:۱۱۰) کے مصداق بن کر دنیا والوں کو دکھادیں گے۔ وللہ العزة ولرسولہ وللمؤمنین یعنی غلبہ و بزرگی اللہ، اس کے رسول اور مومنوں ہی کے لیے ہے۔

دنیا طلبی کے لیے حصول علم کی مذمت

اسلام میں علم کا مقام ومرتبہ چونکہ بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے اس لیے اس کی تحصیل میں محض دنیوی مقاصد کوملحوظ رکھنے کی مذمت کی گئی ہے۔ کیونکہ علم کو دنیوی مقاصد کے تابع قرار دینے کے نتیجہ علم کی تحقیر اوراس کی ناقدری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ چونکہ تمام مخلوقات کا خالق، رازق، مالک اور پروردگار ہے، ہادی ورہنما ہے لہٰذا ہر دور میں وہ اپنی اشرف المخلوقات کی ہدایت کے لیے اپنے چند منتخب ومخصوص بندوں (رسل و انبیاء) کے ذریعہ اپنے احکام، اوامر، قوانین ودساتیر بھیجتا رہا ہے جو علم شریعت کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ علم نوع انسانی کے لیے رشد وہدایت کا ضامن ہے اس لیے نہ صرف اس کا خالص وبے آمیز رہنا ضروری ہے، بلکہ خود خلوص وللّٰہیت کے جذبے سے سرشار ہوکر اس کی نشرو اشاعت بھی ضروری ہے۔ اس اعتبار سے جو شخص حصول علم کو حصول زر کا ذریعہ بنائے گا وہ اللہ کے نزدیک مبغوض و مذموم اور قابل ملامت ہے۔ اگر دل میں اخلاص ہے تو دنیا خود بخود قدموں تلے سمٹی چلی آئے گی۔ مگر حصول دنیا ہدف اساسی نہ ہو بلکہ دین کی خدمت اولین مقصد اور منتہائے مطلوب ہو۔ موجودہ دور میں علم کی ناقدری کا جو سماں ہے وہ اس عدم اخلاص وللّٰہیت اور دنیوی مفاد کے تقدم ہی کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ہمارے عزائم میں خلوص نیت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے اسلام کا فلسفہ تعلیم دیگر تمام فلسفوں سے ممتاز نظر آتا ہے ارشاد نبوی ہے:

> جس نے حصول علم رضاء الٰہی کے سوا دنیا طلبی کے لیے کیا وہ جنت کی بو تک نہیں پائے گا۔ (ابوداؤد کتاب العلم ۴/۷۱، ابن ماجہ ۱/۹۳)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حصول علم کے لیے مقصد کا تعین ضروری ہے اور یہ مقصد رضائے الٰہی اور اخروی نجات ہے۔ اگر یہ مقصد پیش نظر نہ رہے تو علم بجائے افادہ کے نقصان دہ ثابت

ہوگا۔علماء چونکہ انبیاء کرام کے وارث ہوتے ہیں اس لیے ہر قسم کی نفاست سے پاک وصاف ہوکر کام کریں۔

علم کے بغیر نہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کے احکام وفرامین کی جانکاری ہوسکتی ہے نہ اللہ ورسول کی اطاعت ہوسکتی ہے نہ دنیوی واخروی کامیابی وکامرانی مل سکتی ہے۔لہٰذا انسان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ حصول علم اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

یہ اہمیت وفضیلت اس وقت ہے جب علم کے مطابق عمل کیا جائے اگر علم حاصل کرلیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو وہ علم فائدے کے بجائے نقصان دہ ہوگا۔اسی طرح بغیر علم کے عمل خطرات سے خالی نہیں ہوتا۔لہٰذا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔چنانچہ ابوداؤد شریف کی حدیث ہے صادق المصدوق ﷺ نے فرمایا:(ابوداود:۴/۶۵)تھوڑا سا عمل علم کے ساتھ نفع بخش ہے۔مگر بہت زیادہ عمل بغیر علم کے بے فائدہ ہے۔(کنز العمال:۱۰/ ۸۸)اس شخص کی مثال جو قرآن شریف پڑھتا ہے مگر فرائض ٹھیک سے ادا نہیں کرتا ہے ایسی ٹوپی کی طرح ہے جس کا کوئی سر نہ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:(کنز العمال:۱۰/۱۰۲)کتنے ہی عالم ایسے ہیں جو بے سمجھے ہیں اور جس شخص کو اس کا علم نفع نہ پہنچائے اس کا جہل اسے نقصان پہنچائے گا۔

اگر آپ علم کے بحر ذخار ہوں، سارے علوم وفنون پر دسترس حاصل ہو مگر عمل کے میدان میں کورے ہیں تو آپ کے پند ونصائح رائیگاں اور آپ **لم تقولون مالا تفعلون** کے مصداق ہوجائیں گے۔

تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ جب تک دس آیتیں سیکھتے پھر اس پر عمل پیرا نہیں ہوجاتے تب تک دوسری آیت حفظ نہیں کرتے۔

خلاصہ کلام کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے بغیر عمل کے علم بے کار اور رائیگاں ہے لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ علم کے ساتھ عمل بھی کرنے کی کوشش کرے۔اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو علم کے مطابق عمل کرنے کی توفیق دے۔آمین

سائنس شیطانی علم نہیں

ثناء اللہ

عہد حاضر کو بلا مبالغہ عہد سائنس کہا جاسکتا ہے۔ اگر چہ اس مشینی دور نے مادیت کو تقویت دی ہے مگر اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سائنس ہی نے انسانی سوچ کو وسیع کیا اور احاطۂ تخیل کو بڑھایا۔

آج کے دور میں امت محمدیہ کو جہاد کی سخت ضرورت ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ جذبۂ ایمانی کے ساتھ ساتھ آلاتِ حرب و ضرب کی بھی فراوانی ہو۔ تیرھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ہمارے یہ عظیم اسلاف نہ صرف اعلیٰ پائے کے سائنسدان تھے، بلکہ دینی علوم پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ابن سینا، رازی، فارابی، ابن الہیثم، الخوارزمی، امام غزالی اور اسی طرح کے اور بہت سے نام لیے جاسکتے ہیں۔

علم حاصل کرنے کا تو خود قرآن حکیم میں حکم فرمایا گیا۔ قرآن پاک میں ایسی بیسیوں آیات ہیں جو براہ راست سائنس کے متعلق ہیں۔ ایک بات یاد رکھیے، سائنس درحقیقت علوم دینیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ قدیم یونانی صرف نظریات ہی پر اکتفا کرتے تھے، مگر قرآن حکیم نے پہلی بار نہ صرف حیران کن اور سچائی پر مبنی نئے نظریات متعارف کرائے بلکہ تجربات و مشاہدات پر بھی زور دیا۔

کائنات کے مسلسل پھیلاؤ، بچے کی پیدائش کے درجہ بدرجہ مراحل کا بیان، حتیٰ کہ ہر انسان کے جدا جدا فنگر پرنٹس تک کا اشارہ قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل دیا تھا۔ یہ وہ اسرار ہیں جنہیں دریافت کرنے پر آج سائنس فخر کرتی ہے۔ صرف ایک مثال یہ ثابت کرتی ہے کہ سائنس قرآن کریم کے مقابل نہیں، بلکہ اسی سے پیدا شدہ ایک علم ہے۔

سورۂ یٰسین آیت ۳۸ میں ارشاد ہوا ''اور سورج اپنے مقرر کردہ راستوں پر چل رہا ہے،

یہ حکم ہے زبردست علم والے کا۔" لیکن سائنس نے کہا کہ سورج اپنی جگہ رکا ہوا ہے، اور زمین اس کے گرد حرکت کر رہی ہے۔ جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین تو سورج کے گرد گھوم ہی رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ سورج خود بھی حرکت کر رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ نظام شمسی کو بھی لے جا رہا ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی اٹل باتیں اور کئی صدیوں بعد سائنس کا ان کو سمجھنا۔

المیہ یہ ہے کہ سائنس کو نہ صرف برا سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے شیطانی علم کہا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعی شیطانی علم ہوتا تو فارابی، ابن سینا، رازی، جابر بن حیان، ابن الہیثم اور دیگر سائنسدان اسے کیوں حاصل کرتے؟ مشہور زمانہ جرنیل خیر الدین باربروسہ آبدوز کیوں ایجاد کرتا؟ دوستو! ان کے پاس بھی جذبہ ایمان فراواں تھا مگر انہوں نے زمینی حقائق کو بھی مدنظر رکھا، اس لیے سائنس کو بھی زمینی حقائق کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس قوم کا ساتھ دیں گے جو اپنی حالت بدلنے کی کوشش کرے گی، اور یہ حالت بدلنا ایمان لانے اور نیک عمل کرنے تک محدود نہیں بلکہ یہ تبدیلی دنیاوی نوعیت کی بھی ہونی چاہیے، کیونکہ قرآن نے ہمیں یہی دعا سکھائی ہے کہ ہماری دنیا بھی اچھی ہو اور آخرت بھی۔ اگر ہم نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کو فرض سمجھتے ہیں تو علم کا حصول بھی فرض ہے۔ آج ہم بندوقیں، رائفلیں اور دھماکہ خیز مواد لے کر اور سائنسی کتب کو پیروں تلے روند کر جب جہاد کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اسلحہ ہمارے باپ دادا نے نہیں بنایا بلکہ یہ تو کافروں کی ایجاد ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے لڑنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی وجہ وہ کارتوس اور رائفلیں تھیں جن میں سور کی چربی اور گائے کی ہڈی استعمال کی گئی تھی۔

یہ بہت افسوسناک بات ہے کہ ۵۷ اسلامی ممالک میں سے صرف پاکستان کی اپنی اسلحہ ساز فیکٹری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاد کے لیے جذبہ ایمانی ضروری ہے مگر اسلحہ بھی لازم ہے۔ جبھی تو اللہ رب العزت گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں کی قسم کھاتے ہیں (سورہ عادیات) سامانِ حرب کفار سے مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رکھنے کو کہا جاتا ہے (سورہ توبہ) حدیث مبارک میں تلوار کو ہر وقت تیز رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

یہ تلخ حقیقت ہے کہ امریکہ نے افغانستان کی اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھیر دیا، اگرچہ عارضی طور پر ہی سہی۔ طالبان کا جذبہ ایمانی تو قابل رشک تھا مگر یہ ہم پر قدرت کا تازیانہ ہے کہ ہم زمینی حقائق کو مسلسل نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔

آج ہم مسلمانوں میں ماشاء اللہ جذبہ ایمانی کی فراوانی ہے، ہماری نوجوان نسل

جذبے اور بہادری میں ماضی کے عظیم مسلم جرنیلوں سے کسی طور کم نہیں، مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں ہر لحاظ سے مضبوط کیا جائے۔ حکمت تو مومن کی گمشدہ میراث ہے، جہاں سے ملے، لے لینی چاہیے، چاہے امریکیوں سے ملے، روسیوں سے ملے، یا انگریزوں سے۔

میری گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ سائنس پر شیطانی علم ہونے کی بلاوجہ چھاپ نہ لگائی جائے۔ سائنس کا کوئی گھر اور کوئی ملک نہیں، اور ہر ملک اس کا ہے جو اسے حاصل کرے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کی جائے جو اس علم کے خلاف ہیں، اور دینی مدارس میں اس مضمون کو بھی جگہ دی جائے تا کہ ہمارے نوجوان علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم دنیوی پر بھی دسترس حاصل کر سکیں۔ سائنس کو اپنی زندگی پر حاوی کرنا ہمارا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ صرف ضرورت کے تحت استعمال کریں۔

اسلام میں سائنسی علوم کی اہمیت

مولانا محمد امجد سعید

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق شریعت کے ساتھ ہے اور دوسرے کا تعلق فطرت، یعنی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کا علم (دوسرے لفظوں میں آپ اسے سائنس اور جدید علوم وفنون کا علم بھی کہہ سکتے ہیں) کے ساتھ ہے۔ اور یہ دونوں علم مکمل وحدت کے دو بازو ہیں۔ آپ انہیں یوں سمجھ لیجئے کہ علم کا دایاں بازو اگر شریعت ہے تو بایاں بازو فطرت ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے صحیح تعاون اور ہم نوائی ہی سے یہ علوم ترقی کرتے ہوئے کامیابی کی منزلوں کو چھو سکتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ علم فطرت کو میں نے ''علم'' میں ہی شمار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کے ذریعے جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی صنعت خلاقی کا اظہار اور اس کی ربوبیت کی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے وہاں دوسری طرف کائنات اور نظام کائنات کے متعلق طرح طرح کے انکشافات اور سربستہ راز بھی آشکار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے شریعت کی ہمنوائی اور قرآن حکیم کے مضامین کی تصدیق وتائید ہوتی ہے۔ نیز اس طرح قرآن کریم کا معجزہ ہونا کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف دینی وشرعی امور سے متعلق معلومات کو علم سے تعبیر کیا ہے تو دوسری طرف اسی قرآن حکیم کے اندر مظاہر کائنات سے متعلق معلومات کو بھی علم ہی کا نام دیا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ان دونوں علوم کے متعلق ارشادات ربانی ملاحظہ کیجئے:

ترجمہ: اور ہم نے (بنی اسرائیل) دین کے بارے میں کھلے کھلے دلائل دیئے تھے مگر انہوں نے اپنے ضد کی وجہ سے اختلاف باہمی کا ارتکاب کیا حالانکہ علم (صحیح) ان کے پاس آ چکا تھا۔ (جاثیہ)...... یہ ارشاد تو تھا دینی وشرعی امور کے متعلق جس میں علم کا ذکر صراحتاً مل رہا ہے اور اب اس ارشاد کی طرف آیئے جس میں مظاہر کائنات اور علم فطرت کا بیان ہے، چنانچہ ارشاد ربانی

ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان و زمین کی تخلیق اور تمہارے لب و لہجے اختلاف اس میں علم والوں کے لیے بہت سے دلائل ہیں۔" (سورۃ الروم)

اس آیت کے ملاحظے سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے شریعت کو "علم" سے موسوم کیا ہے اسی طرح میدان فطرت کی ساخت و پرداخت اور ان اصول وضوابط پر بھی علم ہی کا اطلاق کیا گیا ہے۔ لہٰذا علم فطرت یا سائنسی علوم کی مخالفت کرنا علوم کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کرنا درست اقدام نہیں۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ قرآن مجید میں مجرد علم سائنس یا محض مظاہر کائنات سے متعلق تفصیلی علم رکھنے والوں کی تعریف و توصیف نہیں بلکہ اس سے اصل میں باکمال ہستیاں مراد لی ہیں جو علم سائنس کے ساتھ علم شریعت سے بھی مزین و آراستہ ہوں ورنہ مجرد علم سائنس یا علم فطرت کی کوئی اہمیت نہیں، جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے "ان فی خلق السموت والارض اختلاف اللیل والنھار لایت الاولی الباب" (آل عمران) کے بعد آیتوں میں کائنات میں غور وفکر کرنے والوں کی جو صفات ذکر فرمائی ہیں محض ماہر علم پر ہی چسپاں نہیں ہوتیں بلکہ ماہر علم سائنس کے ساتھ ساتھ شرعی علوم سے واقف و عامل ہونے پر بھی صادق آتی ہیں، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ بیشک عقل والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے (اس کائنات میں) کوئی چیز بے کار اور بے فائدہ پیدا نہیں کی، تو پاک ہے لہٰذا ہمیں آگ سے بچالے۔

تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم سائنس یا علم فطرت کے حصول کے ساتھ ساتھ علم شریعت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر ہم نے محض علم فطرت یا سائنس کی طرف ہی اپنی توجہ مبذول رکھی تو یہ بھی نقصان دہ ہے۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ سائنس دان اور انگریزی تعلیم کے دلدادہ قرآن وسنت کی تعلیم سے بالکل ہی نا آشنا ہوتے ہیں اور اگر ہم صرف علم شریعت کی طرف ہی اپنی تمام تر توجہ رکھتے ہیں اور علم فطرت یعنی سائنسی علوم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تو یہ بھی ہمارے لیے نقصان سے خالی نہیں۔

اس دعوے کو آپ اس طرح سمجھیں کہ سائنسی علم "شریعت" کا "دفاعی" شعبہ ہے۔ جس کے بغیر نہ تو شریعت آزادانہ طور پر باقی رہ سکتی ہے اور نہ ہی علمی و مادی میدان میں مقابلہ آرائی کی تاب لا سکتی ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ اس علم سائنس میں اصل مقصود دین و شریعت ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ شریعت ہر حال میں مطلوب مقصود ہے اور کسی حالت میں بھی انسان سے جدا نہیں ہو سکتی لیکن اس کے برعکس فطرت کا مطالعہ نہ تو سب کے لیے لازمی ہے اور نہ سب کے لیے ممکن ہے۔ لہٰذا علم سائنس کی حیثیت فقط شریعت کے مددگار و معاون کی سی ہے نہ کہ اصل مطلوب و مقصود کی۔ چونکہ دفاعی نقطہ نظر سے سائنس کی حیثیت ایک محافظ و سپاہی کی سی ہے جس کے بغیر شریعت زندہ نہیں رہ سکتی خواہ علمی واستدلالی میدان ہو یا مادی وسیاسی میدان۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت پر زور دیا ہے اور فطرت کو ہمیشہ کے لیے اپنے آخری دین متین سے وابستہ کر کے مسلمانوں کو دفاعی میدانوں میں اس سے خوب کام لینے کی تاکید کی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید نے دونوں علم سائنس اور علم شریعت کے حصول پر زور دیتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ دین و دنیا کے فوائد دونوں علموں کی تحصیل پر موقوف ہیں۔ اب ان دونوں علموں کو پھیلانے اور نسل تو نسل تک پہنچانے کا کام امت مسلمہ کے مذہبی زعماء کے فرائض منصبی میں داخل ہوتا ہے۔ لہٰذا علمائے ربانی کو چاہیے کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ان علوم وفنون کی طرف بھرپور توجہ دیں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ علم فطرت کے طلباء کا بھی روحانی اصلاح کا انتظام ہوتا رہے گا، جس سے ان کے بہکنے یا بھٹکنے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ صحیح راستے پر چلتے ہوئے ایک ایماندار سائنسدان اور انجینئر بن کر دین اسلام کی خدمت میں مگن ہو جائیں گے اور اس بات کو آپ موجودہ حالات کے تناظر میں اس طرح سمجھیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وہ طلباء جو دیندار قیادت کے قریب گئے اور ان کا اٹھنا بیٹھنا علمائے حق کے ساتھ ہوا وہ دنیا کے دھندوں سے نکل کر دین حق کے شیدائی بن گئے اور ان کی دنیا دین کے تابع بن گئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہیں نیک لوگوں کی صحبت میسر آئی۔ اگر ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کو دینی و اسلامی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کریں اور ان میں مدارس کی تعلیم کی طرح سائنس اور جدید علوم وفنون کو اسلامی نقطۂ نظر سے طالب علموں کے ذہن میں منتقل کرنے کی کوشش کریں تو یہ بات یقیناً دین اسلام اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے فائدہ مند ہوگی۔

❁......❁

اسلامی سائنس کیوں؟

اسلامی سائنس کیوں یا جدید دور میں اس کا کیا جواز ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے مباحث کا انحصار ایک حد تک اس بات پر ہے کہ مسلمان مفکرین سائنس اسلامی سائنس کی ضرورت اور اس کی افادیت کے ضمن میں کتنے جامع اور وزنی دلائل پیش کرتے ہیں یقیناً عملی افادیت بھی بجائے خود ایک اہم دلیل کا درجہ رکھتی ہے لیکن فی الوقت بعض نظری مسائل کا حل انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں میں نے ایک ایسی معاصر اسلامی سائنس کے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو سائنس ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار اور تہذیب کی بھی نمائندہ ہوگی۔

میرا مقصد اس نکتے کو آشکار کرنا ہے کہ ہر تمدن سے وابستہ سائنس کا اپنا ایک مخصوص تشخص ہوتا ہے اور ہر تمدن میں سائنس نے ایک مخصوص فریضہ انجام دیا ہے۔ اس نکتے کا اطلاق تمدن اسلامی پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا یہ بھی نقطۂ نظر ہے کہ دورِ حاضر میں رائج مغربی سائنس بنیادی طور پر تباہ کن ہے اور وہ مسلم معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ درج ذیل چار دلائل معاصر اسلامی سائنس کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ہر تمدن کے تحت ایک منفرد سائنس کا فروغ ہوا

کسی معاشرے کے تمام روحانی اور ثقافتی پہلوؤں کو ہم اس کے تمدن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر تمدن اپنے معاشرے کے مخصوص تصور کائنات، اس سے وابستہ اقدار و روایات اور فرد کے مابین تعامل کے بے شمار شیونوں کا مظہر ہوتا ہے۔ تاریخ عالم میں متعدد تمدنوں کا ذکر ملتا ہے اور ہر دور میں اپنے تصور کائنات سے وابستہ اقدار کے نفاذ کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح ہر تمدن کے پس پشت کائنات میں انسان کے مقام سے متعلق بھی ایک مخصوص تصور پایا جاتا ہے اور اسی تصور کی روشنی میں کائنات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور درپیش مسائل وضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ وہائٹ ہیڈ (Whitehead) کے بقول یہ تصور کائنات ہی کسی تمدن کا کلیدی عنصر ہوتا ہے

اور اسی کے باعث یہ تمدن کے خدوخال اور خصوصیات متعین کرتا ہے:

ہر دور میں فکری سرگرمیوں اور ان سرگرمیوں کو انجام دینے والے اداروں کے پس پشت ایک مقبول عام اور عمیق کو نیاتی نظریہ ہوتا ہے اور تمام سرگرمیوں پر اس نظریے کی بڑی گہری چھاپ لگی ہوئی ہوتی ہے۔

تصور کائنات ہی معاشرے کی اقدار کو متعین کرتا ہے اور تمدن کی سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کو ایک مخصوص شکل عطا کرتا ہے۔

غرض کہ ہر تمدن کے بطن میں ایک تصور کائنات پایا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر کوئی معاشرہ ترقی یا انحطاط کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ تمدن کے تمام شیون خواہ ثقافت ہو یا اقدار یا سیاسی و معاشرتی ادارے سب اسی تصور کائنات کے رہین منت ہوتے ہیں جیسا کہ درج ذیل شکل سے ظاہر ہوتا ہے۔
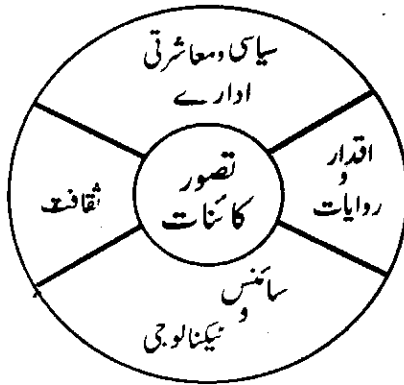
معاشرے کی تنظیم، سیاسی و معاشرتی اداروں میں کارفرما اقدار اور فرد و معاشرے کی سرگرمیوں کا ماخذ و منبع یہی تصور کائنات ہوتا ہے۔

مختلف تمدنوں میں کائنات سے متعلق مختلف تصورات مقبول رہے ہیں اور اسی بنا پر تمدن کے شیونوں میں بھی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چینی تصور کائنات کنفیوشش Confucious کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ چین میں تقریباً ڈھائی ہزار سال تک کنفیوشش کی تعلیمات کا دور دورہ رہا اور ان ہی تعلیمات کے زیر اثر چینی تمدن معرض وجود میں آیا۔ لہٰذا یہ امر ہرگز حیرت انگیز نہیں کہ چینی تمدن یونانی تمدن سے یکسر مختلف ہے۔ کنفیوشش کے نظریات میں

انسانیت دوستی کو نمایاں مقام حاصل ہے اور اسی تناظر میں انسانی رشتوں اور اقدار کو متعین کیا گیا ہے۔ کنفیوشش کی وجودیاتی مباحث اور مافوق الفطری موضوعات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کنفیوشش کے ان نظریات کو Menicus اور HSUN TZU نے مزید فروغ دیا ہے۔ چینی تصور کائنات کی اساس نظریہ Jen یعنی انسانیت ہے نظریہ TAO یعنی ہم آہنگی اور عقیدہ YIN اور YANG یعنی نر و مادہ کے کائناتی اصول پر ہے۔ چینی فکر کا مرکزی نکتہ نظر JEN یعنی انسانیت ہو اور چینی تمدن کے تمام سیاسی اخلاقی اور معاشرتی تصورات اسی نظریے سے ماخوذ ہیں۔

JEN کو صفت کامل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اسی نظریے کی روشنی میں انسانی رشتوں، فرد کی شخصیت کی اکملیت اور انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق تصورات کو مرتب کیا گیا۔ اس کی ابتدائی منزل والدین اور بھائیوں کے حقوق اور بجا آوری ہے۔ ایک تصنیف ANALETS میں اسی نظریے کے ذیل میں HSIAO اور TI جیسے تصورات کا بھی تذکرہ ہے جو بالترتیب پدرانہ اور برادرانہ محبت کے مترادف ہے۔ HSIAO اور TI علی الترتیب لابدی زماں و مکاں سے روحانی رفاقت کی کیفیت کے بھی آئینہ دار ہیں۔ غرض کہ اس طرح مذکورہ اقدار چینی تمدن کا جزو ہیں۔ MENICUS کے مطابق درجہ کمال کے حصول کے لیے بیک وقت TEN اور YI دونوں درکار ہیں۔ جس شے کو انسان دل سے اچھا سمجھتا ہے وہ JEN ہے اور جسے وہ اپنے کردار کے ذریعے پیش کرتا ہے وہ YI ہے۔ بالفاظ دیگر YI وہ اصول ہے جو فرد کو باکردار بناتا ہے۔ HSUNTZU کے خیال میں LI معاشرتی رویے کی اساس ہونا چاہیے۔ قدیم چینی تمدن میں LI معاشرتی آداب کے مجموعے کے طور پر بھی معروف تھا اور یہ مجموعہ آداب معاشرے کی بہتر کارکردگی میں بڑا معین ثابت ہوتا تھا۔ LI کی اصطلاح کا ترجمہ "سماجی تنظیم" "سماجی ادارے در سوم" اور "افراد کے مابین تعلقات سے متعلق قوانین" کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔

JEN سے ماخوذ تصور کائنات نے چینی عوام کو رشتہ اتحاد میں منسلک رکھنے اور چینی تہذیب و تمدن کے خدوخال متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ چینی عوام خواہ امیر ہوں یا غریب، عورت ہو یا مرد، عالم ہو یا جاہل سب زندگی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چینی تمدن میں اس نکتے پر اصرار ملتا ہے کہ بہتر اور پرمسرت زندگی بسر کرنے کے لیے انسان کو ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ زندگی سے محبت و تعلق چینی قومی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ مسرت سے متعلق چینی تصور بھی اسی طرح عقلی بنیادوں پر استوار ہے۔ JEN کا ایک امتیازی نکتہ عقلی مسرت کا نظریہ ہے۔ یہاں مسرت اسے مراد دنیاوی مال و دولت نہیں بلکہ فرد کی صفات عالیہ ہیں۔ کنفیوشش کا قول ہے "دانا افراد شکوک و شبہات سے" "باکردار افراد مصائب سے اور جری افراد

خوف سے مبرا ہوتے ہیں۔ انسان میں یہ صفات عالیہ مطلوب ہیں تا کہ وہ صبر و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرے، انصاف اور ایمان داری کو اپنا شعار بنائے۔ برداشت کا عادی ہو، صلح و صفائی کرنے پر ہمہ وقت آمادہ رہے اور خود غرضی و بے نفسی دونوں کے خلاف مزاحم ہو۔ ان صفات میں افراط و تفریط معاشرتی نظم میں انتشار کا سبب بنتی ہے۔ خود غرضی و بے نفسی دونوں اپنی اپنی جگہ انتہا پسندی کی آئینہ دار ہیں اور اسی لیے یہ فرد کے لیے باعث زحمت ہو سکتی ہیں۔ JEN راہ اعتدال کی تلقین کرتا ہے۔ اس تصور میں فکر و جذبے کی متناسب موجودگی ترقی اور مسرت کی ضمانت ہے۔ صرف اعتدال ہی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اپنے اور اپنے خاندان اپنی ملت اپنی قوم اور دنیا کے حقوق کی انجام دہی کے ذریعے ہی سکون و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ Hsuntzu کے مطابق LI پانچ کرداروں سے عبارت ہے فلک ''زمین'' شہنشاہ آباد و اجداد اور اساتذہ YI Jen اور LI کے نظریات باہمی سیاسی تعلقات کے اخلاقی پہلو کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ حرف آخر کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا مقصود و منتہا اپنے آپ کو صفات عالیہ سے آراستہ کرنا ہے۔ اس کے برخلاف تصور کائنات کے مطابق انسان کا مقصود علوم عقلیہ کی تحصیل کرنا ہے۔ یونانی مذہب اولمپایائی دیوتاؤں کی کثرت سے عبارت ہے۔ ان دیوتاؤں میں Zeus کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس برتری کے باوصف Zeus خالق کائنات نہیں بلکہ محض حاکم کے درجے پر فائز ہے اور دیگر دیوتا بھی خود مختار تصور کیے جاتے تھے۔ Apollo شہر اور فنون لطیفہ کی سربراہ تھی Aphrodite عشق کی دیوی Dionsus نباتات کا دیوتا اور رسوم و رواج کا مرجع تھا۔ ان دیوتاؤں میں بالعموم آپس میں جنگ رہتی تھی یہ دیوتا Titans (شر کے دیوتاؤں سے) برسر پیکار رہتے تھے۔ یونانی مذہب ذاتی عقیدے پر مبنی تھا اور Dionysus کی عبادت کی جاتی تھی۔ چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں آرفیت CRPHISM کی تحریک کو قبول عام ہونے کے باعث Dionysus سے پراسرار قوتیں بھی منسوب کی جانے لگیں اور باضابطہ طور پر اس کی پوجا شروع ہوگئی۔ یہ عقیدہ عام تھا کہ Dionysus کا دوسرا نام Zagreus ہے اور وہ Zeus کا بیٹا ہے اور اس کی ماں زمین کی دیوی Semle ہے۔ اس کو Titans نے قتل کر کے کھا ڈالا۔ غیظ و غضب کے عالم میں Zeus نے Titans کو نذر آتش کر دیا اور اسی راکھ سے بنی نوع انسان کا خمیر اٹھا۔ غرضیکہ انسان، خیر و شر کا مجموعہ ہے کیونکہ اس کے وجود میں Titans کا شر اور Zagrens کا خیر دونوں یکجا ہیں۔ آرفیوں کا عقیدہ تھا کہ جسم انسانی ایک ایسا مقبرہ ہے جس میں روح بسی رہتی ہے۔ آرفی عقیدہ تجسیم پر بھی یقین رکھتے تھے۔ ان ہی عقائد کی بازگشت افلاطون اور دیگر فلسفی سائنس دانوں کے ہاں بھی سنائی دیتی ہے۔

یونان کی شہری ریاستوں کے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب وہاں کی مدنی اور سیاسی زندگی کا جزو بنتا گیا۔ اسی طرح ہر شہری ریاست کے ایک ہیرو یا سرپرست کے عقیدے کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سارا انتظام قبائلی یا خاندانی نظام کی توسیع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دیگر یونانی مذاہب میں آرفیوں کے پراسرار کے طریقہ عبادت سے گریز کیا جاتا ہے۔ یونانی تصور کائنات کے مطابق مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نگراں متصور کیے جاتے تھے۔ اسی نظریے کے زیر اثر شہری ریاستوں کے مرکزی سیاسی نظریے کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یونانی تمدن متعدد شہری ریاستوں کو محیط تھا۔ دیوتاؤں کی مانند یہ شہری ریاستیں بھی الگ الگ فکر کی حامل تھیں اور کسی نکتے پر سب ہی یونانیوں کا شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا۔

یونان تصور کائنات کا مرکزی نکتہ نظم و ضبط ہے۔ معاشرے میں مناسب اور متعین قوتیں منظم ریاست کی تشکیل کرتی ہیں۔ نظم و ضبط سے یہ مراد تھی کہ ہر شخص اپنے مقام سے واقف ہو اور اپنے فرائض کو انجام دے۔ نظم و ضبط اور عقل و ہوش میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اخلاقیات کی رو سے بھی خیر کا صدور عقل کی مدد سے ہی ممکن ہے کیونکہ جہالت شر کا منبع ہے۔ یونانی طرز زندگی اس اعتبار سے بڑی حد تک سیکولر تھا کہ مختلف امور مختلف شعبوں کے زیر بحث تھے۔ درحقیقت Reductionum (نظریہ تقلیل) یونانی تصور کائنات اور یونانی تمدن کا اصل اصول تھا۔

مثال کے طور پر بابائے فلسفہ سقراط کا یہ خیال تھا کہ انسانی روح کے تین اجزاء ہیں۔ عقلی، جذباتی، اور اکتسابی۔ صالح روح میں ان تینوں اجزاء میں مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے اور ہر جزو دوسرے جزو سے تعاون کرتا ہے۔ عقل سر بلند مقام پر فائز ہونے کے باعث جذبات کی نگرانی کرتی ہے۔ جذبات کی مدد سے وہ تمام افعال و اعمال وقوع پذیر ہوتے ہیں جن کو عقل حکم دیتی ہے۔ ان اجزاء میں اشتراک عمل کے فقدان کے باعث روح مریض ہو جاتی ہے۔ روح عقل کے ماتحت ہونے کے باعث مادے سے مماثل ہے۔ علم کے تمام ابدی اور ظاہر معروض پر خیر کی حکمرانی رہتی ہے۔ سقراط کے بقول شہری ریاست میں ان تین اقسام کے باشندے ہونے چاہیے: اول عوام الناس، مزدور، اور اہل حرفہ اور تاجر، دوم: فوجی جن کی ذمہ داری خارجی حملوں سے ریاست کی حفاظت اور ریاست کے اندر نظم و ضبط برقرار رکھنا ہو۔ سوم: حکمراں جنہیں حکومت کرنا اور قانون وضع کرنا چاہیے۔ مستحکم نظام کے لیے ان تینوں اقسام کے باشندوں میں حد فاضل ہونا ضروری ہے۔ فرائض کی مناسبت سے ہر طبقے کی تربیت ہونی چاہیے یعنی عوام کی صنعت و حرفت، فوجیوں کی

جنگی امور اور حکمرانوں کو امور جہانبانی کی تربیت ملنا چاہیے۔ چینی تصور کائنات کی مانند یونانی بھی اس نکتے کے قائل تھے کہ انسان اپنے مقصد وجود کے حصول کے ذریعے ہی حقیقی مسرت سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ البتہ یونانیوں کے مقصد وجود سے متعلق تصور میں JEN، YE اور LI کے نظریات نہیں پائے جاتے۔ ان کے ہاں محض عقل ہی سے سروکار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ارسطو کے نزدیک حیات انسانی کا مقصود عقل کا بہتر سے بہتر استعمال ہے۔ عقل ہی درحقیقت مسرت کی کیفیت کا نام ہے۔ اگر مسرت مطلوب ہے تو یہ ضروری ہے کہ مسرت خیر سے عبارت ہو۔ یہ تصور ہمارے مفاد میں ہے۔ اس عنصر کو خواہ عقل کہیں یا کسی اور نام سے موسوم کریں یہی عنصر فطری انداز میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور علوی اور الوہی امور تک رسائی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عنصر فی نفسہٖ الوہی ہو یا ہمارے وجود کا الوہی عنصر ہو بہرکیف یہ عنصر ہمارے مفاد میں ہے اور کامل مسرت کا باعث بنتا ہے۔

اس مختصر تذکرے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ چینی اور یونانی تصور کائنات بین طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یونانیوں کے نزدیک عقل عظیم ترین مقام کی اہل ہے اور اسے تقریباً الوہی صفت کا درجہ حاصل ہے جب کہ چینیوں کے ہاں نظریہ JEN کی رو سے انسانی تعلقات اور افراد کی صفات کا فروغ، فرد کا درجہ کمال حاصل کرنا اور انسانی حقوق کا تحفظ و بقا صفات عالیہ ہیں۔ یونانیوں کے مطابق انفرادیت، سماج میں افراد کے مابین فرائض کی تقسیم اور مذہبی و دنیاوی امور میں تفریق جیسے تصورات کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے برخلاف چینی تصور کائنات امتزاج و ہم آہنگی اور خارجی و باطنی زندگی میں اعتدال جیسے نکات پر مشتمل ہے۔ یونانی تصور کائنات میں نظم وضبط کا ماخذ افراد اور سیاسی سماجی زندگی میں تقسیم کا اصول ہے۔ چینی فکر کی رو سے تمام افراد ایک دوسرے سے متعلق اور منسلک ہیں اور اس طرح نظم وضبط قائم ہوتا ہے۔ یہ کہنا غالباً ضروری ہے کہ ان دو تصورات کائنات کے زیر اثر دو بالکل مختلف تمدن ظہور میں آئے۔ یہ دونوں تمدن اقدار و روایات اور سیاسی و معاشرتی اداروں کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔

یہ سوال اہم ہے کہ کیا ان دونوں تمدنوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کے بھی دو مختلف نظام پیش کیے؟ عام طور سے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی ایسے غیر جانبدار شعبہ حیات ہیں جو اقدار سے ماوراء اور آفاقیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا چینی اور یونانی سائنس مشابہ ہیں؟

چینی اور یونانی سائنس پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تحصیل علم اور مسائل کا حل دریافت کرنے کے لیے یہ دو قطعاً جدا جدا طریقے ہیں۔ چینی سائنس میں نظریہ JEN سے ماخوذ تصور کائنات کی رو سے انسان اور فطرت میں اتحاد ایک نمایاں مثبت صفت ہے۔ چینی طرز فکر اور طریقہ علم بنیادی طور پر نامیاتی ہے اور اس میں مادی حقیقت کے مختلف پہلوؤں اور روحانی تقاضوں کے مابین باہمی تعلق خاصا نمایاں ہے۔ چینی سائنس کے بنیادی افکار نظریہ عناصر خمسہ Wuhsing اور دو بنیادی قوتوں، Yin Yang سے ماخوذ ہیں۔ چینی سائنسی فکر کے بانی Tsou Yen نے نظریہ عناصر خمسہ کی بنیاد ڈالی۔ عناصر خمسہ کا نظریہ سائنسی اور فطرت پسند ہونے کے علاوہ اس اعتبار سے سیاسی خصوصیت کا بھی حامل ہے کہ اس کی مدد سے امراء کو خوفزدہ کر کے قابو میں رکھا جاتا تھا۔ اس نظریے کو Tsou Yen نے درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> عناصر خمسہ یکے بعد دیگرے غالب ہوتے ہیں۔ ہر بادشاہ غیبی ہدایت کے مطابق اپنی شاہی پوشاک کے رنگ کا انتخاب کرتا ہے تاکہ یہ رنگ اور غالب عنصر مماثل ہوں عناصر خمسہ کا ہر عنصر ناقابل تسخیر ہے Shun کی سلطنت خاک Hsia کی سلطنت چوب Shang کی سلطنت معدن اور Chou کی سلطنت آگ کی رہین منت تھی۔
>
> جب کسی نئی سلطنت کا قیام ظہور میں آنے والا ہوتا ہے فلک عوام کو سعد علامات سے مطلع کر دیتا ہے۔ Hvangti کے دور حکومت میں ہر طرف کینچوے اور عظیم الجثہ چیونٹیاں نظر آئیں۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ اس امر کی علامت ہے کہ خاک کا عنصر غالب ہے لہٰذا ہمارا شاہی رنگ پیلا ہو گا اور ہمارے تمام امور خاک کی علامت کے تحت انجام پائیں گے۔
>
> Yu The Great کے دور حکومت میں ایسے پیڑ و پودے نمودار ہوئے جو خزاں و سرما کے موسم میں بھی نہیں مرجھائے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ اس امر کی علامت ہے کہ چوب کا عنصر غالب ہے لہٰذا ہمارا شاہی رنگ ہرا ہو گا اور ہمارے تمام امور چوب کی علامت کے تحت انجام پائیں گے
>
> High King Wen of the Chon کے دور حکومت میں ہر طرف آگ نظر آئی اور سرخ دستاویز لئے ہوئے متعدد سرخ پرندے تخت

> شاہی پر نمودار ہوئے بادشاہ نے کہا کہ یہ اس امر کی علامت ہے کہ آگ کا عنصر غالب ہے لہٰذا ہمارا شاہی رنگ سرخ ہوگا اور ہمارے تمام امور آگ کی علامت کے تحت انجام پائیں گے۔ اب آگ کے بعد پانی کا عنصر غالب ہوگا۔ فلک ہی اس امر کا ظاہر کرے گا کہ پانی کا عنصر کب غالب ہو گا اس طرح یہ سلسلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا اور وقت معینہ پر تمام اشیاء زمین کی جانب مراجعت کریں گی۔ لیکن ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں کہ یہ وقت کب آئے گا۔

عناصر کے بارے میں یہ چینی نظریہ مادہ اولی کی بہ نسبت بنیادی طریقہ ہائے کار سے زیادہ علاقہ رکھتا ہے۔ اس نظریے کی مدد سے مادی اشیاء کی ان خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی جو کسی تبدیلی کے دوران واقع ہوتی ہیں۔ یہ نکتہ بہر حال اہم ہے کہ اس نظریے میں مادے کے بجائے نسبت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اسی باعث انسان و کائنات اور فرد و معاشرے کے مابین تعلق کو نمایاں درجہ حاصل ہوا۔ مثال کے طور پر Tataiichi کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے یہ تصنیف ۸۵ء اور ۱۰۵ء کے درمیان تحریر ہوئی تھی۔ اس اقتباس سے انسان و کائنات کے مابین اتحاد و اتصال کا اظہار ہوتا ہے:

> Tseng Tzn کہتے ہیں کہ فلک جو بھی ذی حیات پیدا کرتا ہے اس کا سر اوپری حصے میں ہوتا ہے اور جو شے زمین پیدا کرتی ہے اس کا سر نچلے حصے میں واقع ہوتا ہے۔ اول الذکر کی شکل گول اور موخر الذکر کی مربع ہوتی ہے۔ اگر فلک اور زمین واقعتہ گول اور مربع شکل کے ہوتے تو زمین کے چاروں کونے ڈھنگ سے محیط ہو پاتے۔ میرے قریب آؤ میں تمہیں وہ علم دوں جو میں نے استاد (کنفیوشش) سے حاصل کیا ہے۔ استاد کا قول ہے کہ فلک کا TAO گول اور زمین کا مربع ہے۔ مربع تاریک اور باہر تک روشن ہوجاتی ہے Chhi کو تاریکی جذب کر لیتی ہے اور اس طرح تاریک کا اندرون بھی روشن ہوجاتا ہے۔ غرضیکہ آگ اور سورج میں روشنی خارجی ہوجاتی ہے جبکہ معدن اور پانی میں روشنی باطنی ہوتی ہے۔ روشنی پھیلانے والا فاعل ہے اور روشنی جذب کرنیوالا مفعول یا ردعمل پذیر معروض ہے۔ بالفاظ دیگر Yang فاعل ہے اور YIN ردعمل پذیر معرض

ہے YANG اور YIN کے جوہر کو علی الترتیب Shen اور Ling
کہتے ہیں۔ یہ دونوں توانائیاں ہی تمام ذی حیات مخلوق کا اصل ہیں۔ اسی
طرح یہ رسوم و رواج، موسیقی، نیکی، فراخ دلی، خیر و شر، معاشرتی نظم و ضبط
اور انتشار کا بھی محرک ہیں۔ جب تک Yong اور YIN اپنے مقررہ
مقامات پر رہتے ہیں نظم و ضبط بحال رہتا ہے۔
بال اور جانور پیدائش کے وقت اپنے ہمراہ اپنی پوشاک لاتے ہیں۔ اسی
طرح پرندے اپنے پر حاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں کی تخلیق Yong
کی قوت کی مرہون منت ہے۔ دھاری دار جانور بھی پیدائش کے وقت
اسی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیق YIN کی بدولت ہوتی
ہے۔ صرف انسان ہی دنیا میں بے لباس آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
انسان کے وجود میں YANG اور YIN دونوں جوہر موجود ہوتے
ہیں۔
بال دار جانوروں کی مثال ارنا گھوڑا، پرندوں کی مثال عنقا، دھاری دار
جانوروں کی مثال کچھوا اور دیو مالائی اژدھا ہیں۔ بے لباس مخلوق کا نمونہ
دانا شخص ہے۔

چینی سائنسی فکر کے مطابق YANG اور YING کی یہ دو بنیادی قوتیں انسان اور فلک میں ہمیشہ موجود رہتی ہیں اور موج کی مانند یہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر غالب ہوتی رہتی ہیں۔ شاہکار چینی تصنیف I CHING میں YANG اور YING کے تصورات کا ریاضیاتی ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس تصنیف میں ۶۴ علامتی شش گوشے ہیں۔ ہر شش گوشہ ۶ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط مستقیم بھی ہیں اور شکستہ بھی خط مستقیم YANG اور خط شکستہ YIN کی علامت ہے۔ ہر شش گوشہ یا تو بنیادی طور پر YANG ہے یا YIN۔ ان ۶۴ شش گوشوں کو اس مہارت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر YANG شش گوشے کے مابعد YIN شش گوشہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ YANG اور YIN کسی بھی مرحلے میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے لیکن بظاہر ایک ہی غالب نظر آتا ہے I CHING اس طرح YANG اور YIN کے تصورات کا ریاضیاتی ثبوت فراہم کرتی ہے۔

ان نظریات پر استوار چینی سائنس عرصے تک رائج رہی اور نقطہ عروج بھی حاصل کیا۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس انداز کی سائنس تجربی یا عملی نہ ہوگی یہ گمان گمراہ کن ہے۔ دور حاضر کے نظریات اور مذکوہ بالا چینی کے ان ہی تصورات کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور نظریہ عناصر خمسہ کی بازگشت اس تصور میں ملتی ہے کہ مادے کی بنیادی کیفیات پانچ ہیں:

> یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ پانی تمام رقیق، آگ تمام گیس دار اشیاء، معدن تمام معدنی و نیم معدنی اشیاء خاک تمام اراضی اشیاء اور چوب کاربن کے تمام مرکبات یعنی آرگینک کیمسٹری (Organic Chemistry) کے مترادف ہے۔

البتہ مغربی سائنس کی روشنی میں چینی سائنس کا مطالعہ اس لیے زیادہ سودمند نہ ہوگا کہ چینی سائنس کا مقصود چینی تمدن نہ کہ مغربی تمدن کی مادی نظریات اور روحانی تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔ چینی معاشرے کی ضروریات کی حد تک چینی سائنس تجربی تھی۔ آبی سائنس اور انجینئرنگ کے شعبوں میں بھی چینی علماء وفضلا نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ چینی علماء ریاضیات میں بہت برق تھے۔ شمار آموز علم الحساب کا اولین ذکر HSU YD (۱۵۰ء - ۲۰۰ء) کے ہاں ملتا ہے۔ ممتاز چینی ماہر ریاضیات TS' ANG (متوفی ۱۵۲ ق م) کی شاہکار تصنیف CHIU Chang Suan Shu میں چینی علم الحساب کا مفصل تذکرہ ہے۔ اسی تصنیف میں منفی عدد کا سب سے پہلا ذکر ملتا ہے۔ یہ نظریہ صدیوں تک مقبول رہا کیونکہ اسی کا ذکر Hsia Hou Yang (۶۰۰ء) کی تصانیف میں بھی موجود ہے۔ دوسری صدی عیسوی کی Hsuntzau کی تصنیف میں درجہ اولی کے غیر متعین معاملات اور اعشاری نظام سے متعلق حوالے پائے جاتے ہیں۔ کسر اور معاملات کے موضوع پر تفصیلی ابواب۔ Chang Chio-Chien (۶۵۰ء) کی تصانیف میں بھی موجود ہیں۔ ساتویں صدی عیسویں میں Wang Hsia T' ung نے ثقیل اشیاء کے حجم کے تعین کے ضمن میں مفرد نسبتوں کا حل پیش کیا ہے۔ غیر معین معاملات کے موضوع پر I-HSING (۶۲۳ء - ۷۵۷ء) نے بھی گراں قدر اضافے کے لیے اس طرح Chang Svan Shu کے ذخیرہ تحقیق میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ چینی تمدن کا ایک اہم شعبہ طب تھا۔ Chang Chung Ching کو چین کا بقراط کہا جاتا ہے۔ دوسری صدی کے نصف میں آپ نے تغذیہ اور نجار کے موضوعات پر دو رسائل تصنیف کیے۔ صحت و مرض سے متعلق نظری مطالعات، درازیٔ عمر سے متعلق تحقیق، علم الادویہ، مویشیوں سے متعلق طبی امور ایکو پنکچر (Acupuncture) اور معالجات جیسے موضوعات اس دور کی طب کے چند ذیلی شعبے تھے۔

چونکہ چینی سائنس میں اقدار و روایات کا خاصا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا اس لیے یہ تصور عام ہو گیا ہے کہ چینی سائنل سائنسی لحاظ سے پختہ نہ تھی۔ مثال کے طور پر نیڈھم (Need Ham) نے عمل رمل کو نام نہاد سائنس کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ عمل رمل میں آب و ہوا، سعد وقت، جمالیاتی خصوصیات سے متناسب گھر کا انتخاب جیسے امور میں اقدار و روایات اور جمالیاتی پہلوؤں کو سائنسی تجربے کی بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ چینی سائنس میں تجربے اور نظری مطالعات دونوں کو یکساں اہمیت کا حامل متصور کیا جاتا تھا البتہ ان امور کو ایسی اہمیت حاصل نہ تھی جو آج مغربی سائنس میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ گمان کرنا بالکل غلط ہے کہ بغیر کسی تجربے یا متعین نظریے کے انسانی جسم میں ایکوپنکچر کے لیے سوئیاں لگائی جاتی تھیں۔ درحقیقت چینی تجربات کے زیر اثر ایسی متعدد ایجادات معرض وجود میں آئیں جنھوں نے مغرب کو تاریکی سے نکال کر صنعتی دور میں داخل ہونے میں مدد دی۔ مثلاً مقناطیسی پرکار، بارود اور مطبع خانہ۔

چینی سائنس کے اس مختصر تذکرے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چینی سائنس کا اپنا ایک منفرد چینی تشخص ہے اور یہ سائنس بڑی حد تک معروضی تھی اور چینی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب رہی۔ اس سائنس کی رو سے جن نکات کو فضیلت اور تقدم حاصل ہے وہ چینی تصور کائنات کو منعکس کرتا ہے۔ غرضیکہ اس سائنس کی ایجادات نے چینی تہذیب کے معیار کو بہت بلند کیا۔

چینی سائنس میں ایسی منطقی جدلیات سے گریز کیا تھا جس میں کسی شے کو 'الف' یا غیر الف' ثابت کرنے پر اصرار کیا جائے۔ اس کے برخلاف یونانی سائنس مستقیمی منطق اور نظریۂ تقلیل پر استوار ہے۔ یونانی سائنس کی اساس ارسطاطالیسی منطق پر ہے جس کی رو سے صرف دو طرح کے ثبوت تسلیم کیے جاتے ہیں یعنی قانون اضداد (کوئی شے بیک وقت دو مفروضہ خصوصیات کی حامل نہیں ہو سکتی) اور انکار اوسط (ہر شے میں کوئی ایک خصوصیت ہونا چاہیے) یونانی اور بالخصوص فیثا غورثی کائنات کو ایک ریاضیاتی اکائی متصور کرتے تھے اور کائنات کی تفہیم و تسخیر کے لیے علم الاعداد میں مہارت کو لازمی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی سائنس میں ریاضیات اور استخراجی منطق کو کلیدی درجہ حاصل ہے۔

ریاضیات کی اہمیت فیثا غورثی فکر میں بہت نمایاں ہے۔ فیثا غورث کے سائنسی افکار اس کے مذہبی تصور کائنات اور سیاسی نظریات کا مجموعہ ہیں۔ فیثا غورثی ایک مذہبی گروہ کے اراکین

تھے جس کا مقصود رہبانیت اور ریاضی کی تعلیم کا حصول تھا۔ اس گروہ میں نظم و ضبط' پر اسراریت' استاد کی اطاعت و احترام' رسوم کے ذریعہ تزکیے' حافظے سے متعلق ریاضتوں' محاسبۂ ضمیر اور متعدد اشیائے خورد و نوش سے پرہیز وغیرہ کا سختی سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ فیثا غورثی نظریۂ کونیات میں اعداد کو خصوصی مقام حاصل ہے اور ان کو مربع' مثلث اور مستطیل کی شکلوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا تھا۔ فیثا غورث کا قول ہے: ''اشیاء اعداد ہیں'' فیثا غورث نے مفرد اعداد کے مابین نسبتوں (مثلاً ۲/۱' ۳/۲ اور ۴/۳ وغیرہ) کو دریافت کیا اور اس نکتے کو پیش کیا کہ ان نسبتوں کی مدد سے موسیقی کے وقفوں اور اجرام فلکی کے مابین فاصلوں کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ متعدد یونانی فلسفی سائنسدانوں نے حیات و اخلاق کے موضوع پر خیال آرائی کی ہے۔ فطرت اور حیات انسانی سے اس گہرے شغف کے باعث ارسطو نے حیاتیات اور فطرت کی تقسیم و ترتیب جیسے موضوعات کا بھی مطالعہ کیا۔ ارسطو کے مطابق ریاضی کائناتی حقیقت کی تجرید ہے جب کہ کائناتی حقیقت فی نفسہٖ ایک پیچیدہ اور خود مکتفی نظام ہے علت و معلول کے تصور کی مدد سے ارسطو نے فطری کائنات کی تفہیم و تشریح کی اور فلسفہ غائیت بھی پیش کیا۔ اسی باعث ارسطو کے حیاتیاتی مطالعات مختلف اجسام کے توالد و تناسل جیسے نکات سے بھی علاقہ رکھتے ہیں۔ ارسطو نے اس امر کی وضاحت کی کہ حیوانات و نباتات اپنے مقصود کے لحاظ سے نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ طبعیات اور فلکیات پر مباحث میں ارسطو نے علت اولیٰ اور فلکی دائروں کے مقصد کو واضح کیا۔

ارسطو کا یہ نظریہ کہ علوم عقلیہ کی علت اولیٰ لازمی ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے Phrrhon of Elin جیسے متشکک فلسفیوں کو قابل قبول نہ تھا۔ ان فلسفیوں کے ہاں مرکزی نکتہ تشکیک ہے Pyrrhon کے شاگرد Timon نے منطقیوں کے استخراجات کے بنیادی مقدمات صحیح نہ ہونے پر سخت گرفت کی۔ Empiricus نے نظریۂ قیاس منطقی کو بے بنیاد بتاتے ہوئے مسترد کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منطقیوں کے ہاں مقدمات ہی کی بناء پر نتائج کو فرض کرلیا جاتا ہے۔ انہوں نے نظریۂ علتیت کو بھی اس لیے رد کیا کہ بیک وقت وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں تو کوئی ربط تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن اسباب معلول سے قبل واقع ہوتے ہیں۔ ان کے بقول

سائنس اپنے مزاج کے اعتبار سے سیکولر ہے اور عقلی استکبار کی غماز ہے۔ یونانی بالعموم بے ادب اور مغرور ہوتے تھے۔ وہ اپنی شہری ریاستوں کے باشندوں کے سوا تمام افراد کو وحشی متصور کرتے تھے۔ وہ مصری اہرام کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانی سائنس دانوں کو اصل دلچسپی نظری علوم اور ریاضیات سے تھی اور وہ تجربے سے بالعموم گریز کرتے تھے۔ ان کی زندگی خوشحال تھی۔ سادہ سیاسی نظام کے باعث ان کے معاشرے کو استحکام حاصل تھا۔ ان کو درپیش معاشرتی مسائل کی جھلک ہمیں ان کے سائنسی افکار میں بھی ملتی ہے۔ یونان میں فقیروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر Isocrates نے اس مسئلے پر خصوصی توجہ کی اور یہ تجویز پیش کی کہ فقیروں کو جبری طور پر عجمی سلطنت میں دھکیل دیا جائے۔ چونکہ یونانی عجمی سلطنت پر فتح یاب ہونے کے اہل نہ تھے اس لیے اس ترکیب کے ذریعے وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ علاقہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہ تھا۔ Isocrates لکھتے ہیں کہ اگر ہم ان بدمعاش فقیروں کو طرح دیتے رہے تو ایک دن ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ وحشیوں کی مانند یہ بھی یونانیوں کے لیے ایک خطرہ بن جائیں گے۔ معاشرتی معاملات میں Isocrates کے اس اندازِ فکر کی جھلک ان کے معاصر افلاطون کے سائنسی افکار میں بھی ملتی ہے۔ جس طرح Isocrates فقیروں کو نیست و نابود کرنے کے درپے تھے اسی طرح افلاطون پانچ غیر منظم سیاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر مصر تھے۔ انہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فلکیات کے تمام علماء کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ وہ کون سی ایسی منظم گردشیں ہیں جن کی مدد سے سیاروں کی ظاہری گردش کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کا حل اس لیے بھی ضروری تھا کہ ان ہی افکار کی بنیاد پر ارسطو نے ایسی دینیات مرتب کی تھی جس کی روشنی میں وہ اپنے معاشرے کی تشکیل کے خواہش مند تھے۔

یونانی سائنس کے مذکورہ بالا تذکرے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ یونانی سائنس چینی سائنس سے قطعاً مختلف تھی۔ ان دو مختلف تمدنوں کے سائنسی افکار میں نہ صرف نکات کی تقدیم و تاخیر میں فرق ہے بلکہ مزاج، خصوصیات، منطق اور طریقہ ہائے کار کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ غرضیکہ اس نتیجے کو بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر تمدن منفرد انداز کی

شکل نمبر ۲ میں دو مختلف الف اور ب کا ایک نقشہ پیش ہے جس میں P.V.C.W اور S بالترتیب تصور کائنات' ثقافت' اقدار اور روایات' سیاسی وسماجی اداروں اور سائنس کی علامت ہیں۔
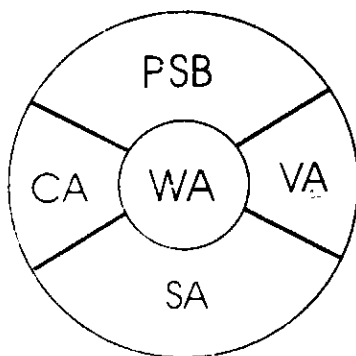
(الف) (ب)
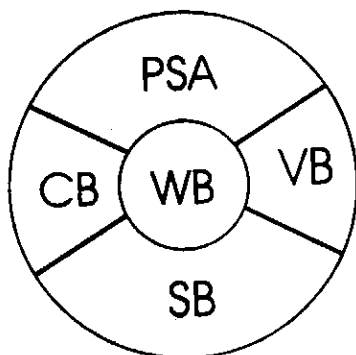
مار یہ

اگر WA مساوی نہیں ہے	WB کے
CA	CB کے
VA	VB کے
PBI	PA کے

توکس کی منطق کی رو سے SA کو SB کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے؟

چینی اور یونانی سائنس کے مذکورہ بالا تعارف کی مدد سے میں نے اس نکتے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے یہ دونوں تمدن اپنی اپنی جگہ حقیقت کا ادراک کرنے اور مسائل کا حل پیش کرنے کے جائز اور صحیح طریقہ ہائے کار پر مشتمل تھے۔ اسی طرح رومی' میکسیکن' ہندو اور میکن تمدنوں کے مطالعے سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب تمدنوں کا تحصیل علم اور مسائل حل کرنے کا اپنا ایک مخصوص طریقہ تھا۔ سائنس بہرکیف ایک انسانی فعل ہے جو زمان ومکاں میں واقع ہوتا ہے اور اس فعل کو انجام دینے والے کردار انسان ہی ہوتے ہیں اور ہر تمدن کی سائنس کے مزاج' انداز اور مواد پر اس تمدن کے مخصوص تصور کائنات کی بڑی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

اسی نکتے کی بنیاد پر دوسری دلیل یہ پیش ہے کہ آج ہمیں اسلامی سائنس کا احیاء کرنا چاہیے کیونکہ اسی اسلامی سائنس نے مسلم تمدن کے کردار اور مواد کو متعین کرتے ہوئے اپنا مخصوص فریضہ

انجام دیا تھا۔اس نکتے کی مزید وضاحت اسلامی سائنس کی تاریخ کے مطالعے سے بھی ہوتی ہے۔

اسلامی سائنس کا ایک اپنا منفرد تشخص تھا جس کا مظہر اس کا مزاج اور مخصوص انداز ہے مسلم تمدن کے دور عروج کے سات سو سالوں میں یعنی ۷۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک اسلامی سائنس نے زبردست ترقی کی۔ اس دور میں فروغ پانے والی سائنس کا ایک مخصوص اسلامی تشخص تھا۔ اس تشخص کا بہترین اظہار ہمیں اسلامی علمیات (Epistemology) میں ملتا ہے۔ کیونکہ علمیات ہی نے سائنس کے مقاصد' طرز فکر اور طریقہ کار کو متعین کیا۔

اسلامی علمیات (Islamic Epistemology) حقیقت اور تجربے کی کلیت پر اصرار کرتی ہے اور اس کے زیر اثر صرف ایک نہیں بلکہ متعدد طریقوں سے فطرت کا مطالعہ ممکن ہے۔ اسلامی تصور علم میں مطلق مشاہدے سے لے کر مابعد الطبیعیات تک ہر ذریعہ علم شامل ہے۔ علم کے ماخذ میں وحی الٰہی بھی ہے اور عقل انسانی بھی' مشاہدہ بھی ہے اور وجدان بھی' روایت بھی ہے اور قیاس بھی۔ یہ تمام ذرائع علم صالح اور جائز ہونے کے ساتھ ساتھ احکام قرآن کے تابع بھی ہیں۔ بالفاظ دیگر اسلامی علمیات کی رو سے آفاقی اقدار کے تناظر میں ہر ذریعۂ علم کا استعمال جائز ہے اور یہی تمدن اسلامی کی خصوصیت ہے۔

اس رنگا رنگی کے علاوہ اسلامی علمیات کی ایک امتیازی صفت باہمی ارتباط کی موجودگی ہے۔ تمام ذرائع علم باہم منسلک اور مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے زندہ جاوید پیغام سے بھی متعلق ہیں۔ غرض کہ اسلام نہ صرف تحصیل علم کو ضروری قرار دیتا ہے بلکہ اسے طریقۂ عبادت سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ علم اس اعتبار سے طریقۂ عبادت ہے کہ علم کا مقصود اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور اس کی رضا جوئی ہے۔ علم محض ایک طریقۂ عبادت ہی نہیں بلکہ متعدد قرآنی تصورات مثلاً خلافت' عدل اور استصلاح وغیرہ کا بھی لازمی عنصر ہے۔ البتہ علم کا عبادت ہونے کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ علم کے ذریعے اللہ کے احکام سے انحراف نہ کیا جائے۔ علم اور خلافت کے باہمی تعلق کے باعث کائنات ایک مقدس کردار کی حامل قرار پاتی ہے۔ انسان امین ہونے کے سبب ایسے علوم کی تحصیل نہیں کر سکتا جو کائنات کی بقاء کے لیے مضر ہوں کیونکہ کائنات انسان کے لیے ایک خدائی تحفے اور نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ بحیثیت امین انسان کا فرض محض تسخیر کائنات ہی نہیں بلکہ آیات الٰہی کی تصدیق بھی کرنا ہے۔ غرضیکہ مطالعۂ فطرت سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مادی کائنات کی تسخیر و تفہیم اور روحانی حقائق کی تنویر اور اثبات' علم اور استصلاح کے تعلق کے باعث انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ علم کے ذریعے مساوات عدل اجتماعی

اور اقدار کو فروغ دے تاکہ مسلم معاشرہ اور مسلم ثقافت پروان چڑھیں۔ رنگارنگی اور باہمی ارتباط کی ان خصوصیات کے باعث علمیات اسلامی اپنے ایک مخصوص کردار کی حامل ہے۔ اسلامی علمیت تحصیل علم کے لیے اعتدال کی راہ تجویز کرتی ہے۔ اس کی رو سے کوئی واحد ذریعہ علم مطلق صحیح یا غلط نہیں قرار پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمدن اسلامی میں علماء کو علوم کی درجہ بندی سے بڑا گہرا شغف تھا۔ اس عہد میں متعدد مسلمان علماء فضلاء نے علوم کی درجہ بندی کی جس سے علمی وفکری سرگرمیوں کے فروغ میں بہت مدد ملی اور مسلمانوں کی علمی وفکری ثمرآور ہوئیں اسلامی عملیات میں ہر شعبہ علم کی یکساں اہمیت کے تصور کے زیر اثر مسلمان اپنے پیش رؤں کے ذخیرہ علم سے استفادہ کرنے کے اہل ہوئے۔ ہر شعبہ علم کو اسلامی اقدار کے زیر تحت مرتب کر کے اسے ایک بالکل نئی شکل دی گئی حالانکہ چینی اور یونانی تمدن کی مانند اسلامی تمدن کا بھی اپنا ایک منفرد تشخص ہے لیکن مذکورہ تمدنوں کے برخلاف تمدن اسلامی میں اس لیے بھی آفاقیت پائی جاتی ہے کہ تمدن اسلامی کی زیر نگیں مختلف اور معتدد جغرافیائی علاقے تھے۔

علوم کی درجہ بندی کے باعث مسلم علماء نے دیگر تمدن کے ذخیرہ علم سے خوشہ چینی کی اور اسے اسلامی نظام اقدار کے تحت مرتب و مدون کیا۔ ابتداء میں مسلم علماء علوم کو عربی علوم میں منقسم کرتے تھے لیکن جیسے جیسے اخذ واکتساب کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا، اسلامی تصور کائنات کے زیر اثر علوم کی درجہ بندی کے پیمانے بھی بدلتے گئے۔ الفارابی (م ۹۵۰) کی درجہ بندی علوم کم وبیش ارسطا طالیسی خطوط پر ہے لیکن اس کی رو سے علوم لغت اور فقہ وکلام کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ الفارابی کے معاصر اخلوارزمی (سنہ تصنیف غالباً ۹۷۶ء) کے ہاں بھی علوم دینیہ کو مرکزی مقام حاصل ہے اور دیگر علوم وفنون اسلامی نظام اقدار کے تحت ہیں۔ دسویں صدی میں علماء کے ایک گروہ نے علم کا ایک قاموس ''رسائل اخوان الصفاء'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا۔ اس تصنیف میں ریاضی، منطق اور علوم طبیعی کے شانہ بشانہ مابعدالطبیعیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ابن حزم کے رسالے مراتب العلوم، میں علوم اور اقدار کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ ابن حزم کے بقول تمام علوم باہمی طور پر منسلک ہیں اور علم تیقن کے مترادف ہے۔ ان کے مطابق علم چار صفات عالیہ یعنی عدل ''فہم'' ہمت اور جود وسخا سے عبارت ہے۔ غرض کہ اس تصنیف میں ہمیں صفات محمودہ، عقل اور علم میں مکمل ہم آہنگی اور امتزاج ملتا ہے۔ علم کے شیون بلاشبہ بے شمار ہیں لیکن علم عالیہ وہ ہے جو ہمیں معرفت باری سے ہم کنار کرے۔ A.G Chein نے ابن حزم کے تصور علم کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ایمان کی مانند علم بھی دنیا وآخرت میں مسرت کا ضامن ہے۔ حالانکہ عقیدہ

اور عقل اپنے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ابن حزم کی رائے میں دونوں کا مقصود یکساں ہے اور یہ مقصود تحصیل علم کو حاصل کرنا چاہیے البتہ طالب علم کو اپنے پر غرہ کرنا چاہیے علم اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ طالب علم کو منکسر المزاج ہونا چاہیے خواہ اس کا ذخیرہ علم کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اس سے زیادہ علم کا حامل ہو۔ علم پر عمل کرنا لازمی ہے ورنہ جاہل عالم سے بہتر ہے در حقیقت علم اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ بالخصوص دینی امور میں عمل کی اہمیت اور زیادہ ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ آدمی خیر کی تلقین کرے اور اپنے علم پر عمل پیرا ہو۔

تحصیل علم کے لیے ابن حزم نے اعتدال کی راہ تجویز کی ہے۔ ان کے یہ افکار ان کی تصنیف ''اخلاق'' میں جا بجا ملتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

علم کا حریص دولت کے حریص سے زیادہ قابل مذمت ہے۔

دین اور دنیاوی علوم کے بغیر تحقیق کرنا بے سود ہے۔

دشوار علم زود اثر ادویہ کی مانند ہیں۔ مضبوط جسم والے ہی ان کو برداشت کر پاتے ہیں۔ جب کہ کمزور اشخاص کو الٹا نقصان ہی ہوتا ہے۔ غرضیکہ دشوار علم کی تحصیل صرف ذی عقل افراد ہی کر سکتے ہیں۔

حقیقی علم صفات الٰہیہ کے بارے میں لاعلمی کو دور کرتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ صفات عالیہ سے آراستہ ہونے کے لیے علم کی بہت زیادہ اہمیت ہے کیونکہ علم کے ذریعے ہی کسی شے کے بہتر ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اس طرح انسان اس شے سے غافل نہیں ہو سکتا۔ علم کے ذریعہ شر کی قباحتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس طرح انسان ان سے حتی الامکان گریز کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ علم کے ذریعے انسان خیر سے واقف ہوتا ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے گا۔ وہ انجام بد سے بھی واقف ہوتا ہے اور اس سے محفوظ رہنے کی کوشش کرے گا۔ غرضیکہ تحصیل علم اشد ضروری ہے جبکہ جہالت برائیوں کا منبع ہے۔ تحصیل علم کے بغیر امور خیر سے واقفیت نہیں ہو سکتی۔ صالح اور افراد علم سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ اس صف میں پیغمبر بھی شامل ہیں کیونکہ بغیر کسی انسانی

واسطے کے اللہ تعالیٰ نے انہیں خیر کی تعلیم دی۔

ابن حزم جیسے مسلم علماء کی یہ کوشش رہی کہ علم اور اقدار کو ہم آہنگ کیا جائے اور اسی تصور کے زیر اثر علوم کی درجہ بندی کے ذیل میں بعض علوم کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ عہد زریں کے ان مسلمان علماء وسائنسدانوں پر یہ نکتہ خوب عیاں تھا کہ ہر قسم کا علم لازمی طور پر مفید نہیں ہوتا اور بعض علوم ایسے ہیں جن کا عبادت یا رضائے الٰہی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہجویری نے علوم کے مابین فرق کو اس طرح واضح کیا ہے:

> وہی علم واجب ہے جس کا مقصود خیر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کی مذمت کی ہے جو بے سود علوم کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں۔ حدیث نبوی ہے کہ میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جس سے مجھے نفع نہ حاصل ہو۔ محض سرسری علم کی مدد سے بھی بہت کچھ انجام دیا جا سکتا ہے۔ علم بغیر عمل کے نہ ہونا چاہیے۔ فرمان نبوی ہے کہ الوہیت سے عاری عابد وزاہد ایسے گدھے کی مانند ہے جو چکی کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور باوجود مشقت کے کوئی پیش رفت نہیں کرتا۔

• مستشرقین اور معاصر مسلم علماء نے اس نکتے کو خوب اچھالا ہے کہ اس انداز کی تفریق علمی تحقیق پر قدغن عائد کرنے کے مترادف ہے۔ عقل کی برتری کے قائل اور دوسرے پیمانوں سے تمدن اسلامی جائزہ لینے والے افراد علوم کی درجہ بندی کے ضمن میں مسلمان مفکرین کی کوششوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ ایسے علوم میں تفریق بے جا استعمال اور ناانصافی واستحصال کا آلہ کار رہتے ہیں امتزاج وہم آہنگی کی خصوصیت اور عقل ووحی کے مابین تعلق جیسے تصورات سے آشنا افراد ہی علم سے متعلق ہجویری اور دیگر مسلم فلسفیوں کے افکار کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ الغزالی کی درجہ بندی علوم میں پسندیدہ ناپسندیدہ اور انفرادی واجتماعی علوم کی تفریق ملتی ہے۔ اس نظریے کے پس پشت معاشرے میں ہم آہنگی اور اسلامی تصور کائنات سے وابستہ اقدار کا فروغ کارفرما ہے۔ مسلم علماء کا خیال تھا کہ تحصیل علم اور معاشرے کی ضروریات میں تناسب ہونا چاہیے اور علم کے باعث ناپسندیدہ معاشرتی نتائج نہیں برآمد نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ علم اس حد تک مجرد نہ ہونا چاہیے کہ فرد اور معاشرے کے مابین کوئی ربط ہی باقی نہ رہے۔ یا روشن خیال کے بجائے انتشار ذہنی پیدا ہو اس تصور کی رو سے سائنس کے لیے اعتدال کی راہ تجویز کی گئی۔ سائنس کو معاشرے کے حسب حال ہونا چاہیے۔ اس دور میں نری افادی سائنس کے تصور کو بھی رد کیا گیا۔ سائنسی

مطالعات محض تحصیل سائنس کے لیے نہ تھے۔ بلکہ ان کا مقصود انسان کو درجہ کمال پر فائز کرنا تھا۔ سائنس بالذات مقصود نہ تھی بلکہ وہ مقاصد عالیہ کے حصول کا ایک وسیلہ تھی۔

اسلامی علمیات کی ان امتیازی خصوصیات کے پیش نظر ایک نئی سائنسی روایت کی داغ بیل پڑی۔ کلاسیکی مسلم سائنس داں تمام تجربات کو حقیقی متصور کرتے تھے اور انہیں تحقیق و تجزیہ کا اہل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک کسی تجربے کا انکار حقیقت کے انکار کے مترادف تھا بالفاظ دیگر مسلم سائنس داں کسی واحد طریقہ تحقیق کے قائل نہ تھے۔ بلکہ مطالعے کی مناسبت سے وہ متعدد طریقہ ہائے کار استعمال کرتے تھے۔ یہ اسلامی سائنس کا ایک اور امتیازی پہلو ہے۔ اس دور میں متعدد طریقہ تحقیق مستعمل تھے اور تمام طریقوں کو بیک وقت اہم اور بیش قیمت سمجھا جاتا تھا۔ ہر شعبہ علم کا اپنا ایک مخصوص طریق کار تھا اور مختلف طریقوں کو ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ معاون متصور کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں بے شک اختلاف رائے بھی ہوتا تھا۔ علمائے دین اور فلسفی دونوں ایک دوسرے کے طریقہ کار کو نا قابل اعتبار بھی قرار دیتے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اسلامی علمیات کے نظریات کے زیر اثر طریقہ کار میں اختلاف کو گوارا کیا جاتا تھا۔ غرضیکہ ایک ہی موضوع کا مختلف طریقہ ہائے کار کی مدد سے مختلف انداز میں مطالعہ کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر علم نباتات کی روشنی میں ایک پیڑ کا مطالعہ کیا جاتا تھا اور علم نباتات کے تحت اس کی تفصیل بیان کی جاتی تھی لیکن اسی پیڑ کے پھل اور پھول کو بہ طور ادویہ استعمال کیا جاتا تھا اور یہ شعبہ علم طب سے متعلق تھا۔ پیڑ کی شکل اور اس کے مواد کا تجزیہ علم طبیعیات کے تحت تھا اور بسا اوقات اس پیڑ سے متعلق غور وفکر اور عمیق مشاہدات تصوف کے ذیل میں آتے تھے۔ غرض کہ البیرونی جیسے سائنس داں کے لیے یہ عین ممکن تھا کہ وہ مختلف طریقہ ہائے کار کو استعمال کرتے ہوئے حقیقت کی مفصل اور مربوط تعبیر و تشریح پیش کر سکیں۔ ایسے انداز کے مطالعے کے دوران تصور کائنات اور اقدار نظروں سے اوجھل نہیں ہوتیں۔ یہ علمیات اسلامی کی افادیت کا عملی ثبوت ہے۔

اسلامی سائنس کی ایک اور نمایاں اور امتیازی خصوصیت حقیقت کے متعدد پہلوؤں کا ادراک ہے۔ مسلم سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ معروضیت کے ذریعے صرف جزوی حقیقت ہی عیاں ہو سکتی ہے۔ اور دیگر طریقہ تحقیق کے ذریعہ بھی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت اسلامی سائنس کے نمائندہ البیرونی کی ایک تصنیف کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔

البیرونی ایک ایسے سائنسداں ہیں جن کے ہاں ایک سے زائد طریقہ تحقیق کا اجتماع ملتا ہے یہاں وہ "دو ثقافتی" نظریہ تقسیم نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ C.P. SNOW کے یہاں پایا جاتا ہے۔ البیرونی جا بجا اپنے قارئین کو بتاتے ہیں کہ حقیقت مطلق تک ایک سے زائد انداز میں رسائی

ممکن ہے۔ ان کے ایک رسالے کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اپنی نعمتوں سے نوازے، مجھے راہ راست پر قائم رکھے، ادراک حقیقت میں میری رہنمائی کرے، تحصیل علم کو میرے لیے آسان بنا دے اور اس اعلیٰ مقصد کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دے، غرضیکہ البیرونی کے بقول حقیقت تک رسائی کے متعدد ذرائع ہیں اور یہ خیال ان کی فکر میں جاری و ساری ہے۔ البیرونی کے ہاں حقیقت پر اصرار کا نکتہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے جابجا قرآن مجید کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں اپنی تصنیف INDIA کے دیباچے میں انہوں نے قرآن کی یہ آیت نقل کی ہے "سچ بولو خواہ وہ تمہارے خلاف ہی ہو" حقیقت کی اسی جستجو کے پیش نظر البیرونی نے ایک سے زائد ذرائع کا استعمال کیا۔

البیرونی کی سائنسی تحقیق میں ریاضی کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے بقول یہ امر بالکل فطری ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کی اشیاء کو شمار کرے اور ان کے مابین عددی نسبت قائم کرے۔ لیکن ان کی تحقیق کا اصل اور اہم محرک اس تحقیق کی افادیت اور علم کا فروغ ہے۔ ایک خالصۃً تکنیکی تصنیف

The Determination of the co-ordinates of Positions for the correction of distances between cities میں انہوں نے تحصیل علم کا ذیل جواز پیش کیا ہے:

> جب ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان صرف روزی کمانے میں مشغول ہے اور اس کے لیے وہ ہر قسم کی مشقت کرتا ہے حالانکہ زندہ رہنے کے لیے اسے دن بھر میں صرف ایک یا دو مرتبہ کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن انسان جہالت و غفلت میں پڑا رہتا ہے اور آخرت کا کوئی سامان نہیں کرتا۔ حالانکہ روزانہ پانچ دفعہ اسے یہ موقع میسر ہوتا ہے کہ وہ اپنے حق میں بہترین شے کے انتخاب کا علم حاصل کرے۔
>
> یہودیوں کو بھی سمت معلوم کرنے کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ اپنی عبادت کے لیے وہ یروشلم کی معبد کی جانب رخ کرتے ہیں۔ اس مقام کا طول البلد اور عرض البلد مشہور و معروف ہے۔ عیسائیوں کو بھی مشرق کی سمت کا تعین کرنا ہوتا ہے کیوں کہ عیسائی راہبوں کے بقول عبادت کے دوران ان کا منہ جنت کی جانب ہونا چاہیے۔

البیرونی محض افادی پہلو کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ان کے بقول حقیقت خود حسین ہے:

انسان تحصیل علم برائے علم کرتا ہے کیونکہ یہ علم باعث مسرت ہوتا ہے۔
دیگر سرگرمیوں کے مقابلے میں تحصیل علم کے ذریعے حاصل ہونے والی
مسرت نا قابل بیان ہوتی ہے۔

البیرونی کی پیش کردہ سائنس کا امتیازی پہلو ان کی راہ اعتدال ہے۔ یہی فکر ان کے اوج خورشید سے متعلق نظریے میں بھی ملتی ہے جو کہ تاریخ سائنس میں ایک زبردست کارنامے کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ تحقیق القانون السعودی میں پیش کی ہے۔ پہلے میدان میں متقدین کی کاوشوں کا جائزہ لیا ہے پھر اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج پیش کیے ہیں۔ ان کے مطابق اوج خورشید "9 '51 '59 '85 پر واقع ہے۔ یہ نتیجہ تین مختلف ذرائع پر مبنی ہے۔ البتہ تینوں طریقوں سے مذکورہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق ارشمیدس کی پیش کردہ ہندسی شکل پر مبنی ہے۔ البیرونی نے اس ہندسی شکل کے بیس ثبوت پیش کیے ہیں۔ اس ہندسی شکل کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے: اگر ایک مدجزر قوس پر خط شکستہ کھینچا جائے اور خط شکستہ پر قوس کو منقطع کرنے والے نقطے سے عمودی خط کھینچا جائے تو یہ عمودی خط خط شکستہ کو بھی منقطع کرے گا۔ البیرونی سے قبل متعدد علماء نے فلکیات سے متعلق نئے نظریات پیش کیے تھے لیکن البیرونی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ قابل ترجیح اور منظم معیار کو پیش کیا۔ اس تحقیق کے مطابق اضافہ پذیر طول البلد کی سمت اوج میں مسلسل حرکت واقع ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے اوج اور قریب ترین نقطے کو ایسے مقامات سے تعبیر کیا ہے جہاں رفتار اپنی انتہا پر ہوتی ہے اور رفتار میں مسلسل کمی یا بیشی کا مشاہدہ ممکن ہے۔ اس طرح انہوں نے ریاضیاتی تجزیے میں تشریحی حرکت کا اولین تصور پیش کیا۔ ان ہی نکات کی بنیاد پر انہوں نے حرکت کی قدر و قیمت کو متعین کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ۶۸ سال اور ۱۱ مہینے میں طول البلد میں ایک ڈگری اضافہ واقع ہوتا ہے۔ اسی نکتے کے بارے میں جدید تحقیق $71^{c}\ 7.5^{m}$ ہے۔

البیرونی اوج خورشید کے نظریے میں مستعمل طریقہ ہائے کار کی نارسائیوں سے واقف تھے۔ ہندوستان سے متعلق تحقیق کے لیے ان طریقہ ہائے کار کا استعمال موزوں نہ تھا۔ ''اپنے مقصد کے حصول کے ہندسی طریقہ قابل عمل نہیں'' اس طریقے کی رو سے صرف اول الذکر بیان ہی سے رجوع کیا جا سکتا ہے اور موخر الذکر بیان کی طرف رجوع ناقابل عمل رہتا ہے۔ اپنی تصنیف INDIA میں انہوں نے فقہاء اور محدثین کے طریقہ کار پر عمل کیا ہے۔ یہاں حقیقت کے ادراک کے لیے ایسا طریقہ کار درکار ہوتا ہے جو ہندسی طریقہ کار کی مانند منظم، سخت اور ناقدانہ

ہو۔ INDIA میں مستعمل طریقہ کار کے اساسی پہلو درج ذیل ہیں: ''روایت چشم دید گواہی سے فروتر ہے'' تحریری شہادت سب سے زیادہ قابل ترجیح ہے۔'' اور منطق یا قوانین طبیعی سے ہم آہنگ روایات کی صحت کا انحصار راویوں کے کردار پر ہوگا۔'' ان اصولوں پر عملی تجربے اور تلاش حقیقت کی انتھک محنت کی مدد سے البیرونی نے ہندوستان کا مفصل ترین معاشرتی تجزیہ سب سے پہلی بار پیش کیا۔ ان کا صرف یہی کارنامہ دنیا کے عظیم علماء کی صف میں ان کی شمولیت کے لیے کافی ہے۔

مختلف طریقہ ہائے کار کا امتزاج صرف البیرونی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس دور میں یہ روایت عام تھی۔ مثال کے طور پر ابن سینا کو بھی منطقی انداز میں مابعد الطبیعیاتی نکات کو مختلف طریقہ کار کی مدد سے پیش کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ''قانون فی الطب'' میں ابن سینا نے اس نکتے کو بیان کیا ہے کہ طب کا مطالعہ قیاسی طریقے اور تجربی مشاہدے و عمل دونوں کے ذریعے ممکن ہے۔'' اتفاق ایک ایسی شاہکار تصنیف ہے جس سے ابن سینا کی قوت مشاہدہ اور تجربی تحقیق کی زبردست صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب اور عمومی تعارف کے علاوہ عضویات، علم تقسیم، امراض علم، علم اسباب الامراض، علم علامت الامراض اور طریقہ علاج کے اصولوں سے متعلق ہے۔ کتاب دوم میں کائنات کے تین جہات کی مثالیں درج ہیں اور ادویہ کی تاثیر اور استعمال کا ذکر ہے۔ کتاب سوم مرضیات کے موضوع پر ہے جس میں جسم انسانی کے تمام امراض کا تذکرہ ملتا ہے۔ پورے جسم کو متاثر کرنے والے امراض مثلاً بخار ''السر'' فریکچر اور سمیات (Poisoning) وغیرہ کو کتاب چہارم میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب پنجم کا موضوع ادویہ ہیں۔ ''القانون'' میں ابن سینا نے دوا کے تاثیری پہلوؤں کو متعین کرنے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔ اس طریقہ کار کی تفصیل ابن سینا کے شاگرد ابو البرکات البغدادی کی تصنیف میں بھی ملتی ہے۔ البغدادی نے ابن سینا کی تحقیقات میں مزید اضافے کیے:

> جہاں تک تجربہ کا معاملہ ہے درج ذیل مثال سے اس نکتے کی وضاحت ہوتی ہے کہ سقمونیا جسم انسانی سے صفراوی مادے کو خارج کرتی ہے۔ اس عمل کے بکثرت واقع ہونے کے باعث ہم اس عمل کو اتفاق پر محمول نہیں کر سکتے حالانکہ اس عمل کی توجیہہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس عمل کا ہمیشہ واقع ہونا اس کا کوئی منطقی ثبوت اب تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ تجربی علوم کی اساس ان ہی نکات پر ہوتی ہے اور مشاہدے کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی عمل مختلف اشخاص، مختلف مقامات اور

مختلف موقعوں پر نہیں رونما ہوتا تو ہم اس عمل کو یقینی عمل سے موسوم نہیں کرتے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ممکنہ عمل کہا جا سکتا ہے۔

حالانکہ اپنی فلسفیانہ تصانیف میں بھی ابن سینا نے کم وبیش اسی عمومی اور مجرد طریقے کا استعمال کیا ہے لیکن وہ اس طریقے کی خامیوں اور نارسائیوں سے بھی واقف تھے۔ تجرباتی طریقہ کار کو وہ صرف طلب کے لیے موزوں سمجھتے تھے اور ہر شعبہ علم کے ذیل میں اس کے استعمال کو صحیح نہیں قرار دیتے تھے۔ تجرباتی مشاہدات اور تجربات بلاشبہ ایک طریقہ تحقیق ہیں لیکن ان کا اطلاق چند مخصوص علوم ہی پر مناسب ہے۔ دیگر علوم کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار درکار ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر اثبات وحی کے بارے میں ابن سینا کا استدلال ملاحظہ کیجئے۔ وحی کے بارے میں تشکیک ذہن کے ایک شخص کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

> اللہ آپ کو راہ راست پر رکھے۔ آپ کے سوال کے جواب میں اس مختصر عرصے کا مقصود وحی کے بارے میں آپ کے شبہات کو رفع کرنا ہے۔
>
> آپ کی تشکیک کی غالباً وجہ یہ ہے کہ یا تو علماء نے نظریہ وحی کو منطقی طور پر مطلق صحیح متصور کرتے ہوئے وحی کے بارے میں دلائل یا جدلیاتی ثبوت فراہم کرنا غیر ضروری سمجھا یا پھر اس ضمن میں انہوں نے ایسے ثبوت پیش کیے جو مافوق الفطری نکات پر مشتمل ہونے کے باعث بظاہر مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔

اثبات وحی کے لیے ابن سینا کے کوئی تجربی یا عملی ثبوت پیش کرنے کے بجائے ایک جامع اور منظم نفسیاتی ثبوت فراہم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابن سینا کے مطابق تجرباتی طریقے کی مانند یہ فلسفیانہ طریقہ کار بھی بالکل جائز اور صحیح ہے گو کہ یہ راہ بڑی پر دشوار ہے۔ لغت، قانون، فلسفہ، فلکیات اور تفسیر قرآن کے موضوعات پر اپنی تصانیف میں ابن سینا نے متعدد طریقے استعمال کیے ہیں اور ہر طریقے کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔

تجربے، مشاہدے اور تجربی تجزیے پر اصرار کے باوجود بھی ابن الہیثم جیسے مسلم سائنسدان فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی تحقیق کے منکر نہ تھے۔ مغربی مورخین سائنس نے الہیثم کو سیکولر ترین مسلم سائنسدان کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ وہ علم برائے علم نظریے کے قائل تھے۔ منہاجی تنقید سے متعلق الہیثم اور دیکارت (DESCARTES) کے نظریات میں موازنہ کیا گیا ہے۔

> حق کی تلاش برائے حق ہونا چاہیے۔ اس تلاش میں حق معروف افراد و دیگر اشیاء سے تعرض نہیں کرتے۔ تلاش حق کی راہ بہت دشوار اور پر خطر ہے کیونکہ عموماً حق پوشیدہ ہوتا ہے۔
>
> سائنسدانوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا ایک بالکل فطری رویہ ہے۔ قارئین عموماً ان پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے نظریات کو صحیح متصور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہرکیف سائنسدانوں کو غلطی سے مبرا اشخاص کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے اگر سائنسدان غلطیوں سے پاک ہوتے ہیں تو ان میں باہمی اختلافات نہ پایا جاتا۔ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے جو شخص آنکھ بند کر کے متقدمین کے افکار پر یقین لے آتا ہے وہ حقیقی معنی میں طالب حق نہیں ہے بلکہ اصلی طالب حق وہ ہے جو متقدمین کے افکار کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان افکار کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے اور افکار کے مقابلے میں عملی ثبوت کو ترجیح دیتا ہے۔ جو بھی شخص سائنسی تصانیف کی مدد سے حقیقت معلوم کرنے کا خواہش مند ہے اس کو چاہیے کہ وہ ہر تصنیف کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کرے اور ہر نکتے اور ہر پہلو کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے اور پرکھے۔ اس بارے میں کوئی اور رعایت نہ کرنا چاہیے اور سہل پسندی سے کام نہ لینا چاہیے اگر کوئی شخص اس طریقہ کار پر کاربند ہو جائے تو اس پر متقدمین کے تسامحات اور حقیقت دونوں آشکار ہو جائیں گے۔

ابن الہیثم کے نظریات کو محض سیکولر کہنا اس عظیم سائنس داں کے حق میں زبردست نا انصافی ہے۔ ابن الہیثم ہی کے ہاں کڑے اور کھرے معیار پر اصرار نہیں ملتا بلکہ یہ معیار دراصل مسلم فقہا اور محدثین کی سخت گیر منہاجی تنقید کا عکاس ہے۔ علم برائے علم کے نظریے کے قائل ہونے کے باوجود ابن الہیثم تحصیل علم کو فلسفے اور دینیات کی قیود میں محدود کرنے کے حامی تھے۔ الہیثم کی شہرت کا بلاشبہ انحصار ریاضت اور طبیعیات کے میدان میں ان کے گراں قدر کارناموں پر ہے۔ بصریات کے شعبہ علم میں ان کی مہتم بالشان تحقیقات کے سامنے نیوٹن (Newton) کے کارنامے بھی گرد ہیں۔ لیکن الہیثم مابعد الطبیعیات، فلسفے، طب اور دینیات جیسے علوم میں بھی طاق

تھے۔ ان کے فلسفے میں سائنس اور دینیات کا سنگم ملتا ہے۔ سائنس پر اعتقاد کے باوجود سائنس کو معاشرے کا خادم ہی متصور کرتے تھے۔ اپنے انتقال سے ۱۳ برس قبل کے ایک مکتوب میں وہ رقم طراز ہیں:

> فلسفے کی اساس تین شعبۂ علوم پر ہے: ریاضیات' علم طبیعی اور دینیات۔ میری تحقیق ہے کہ اختلاف وتنازعہ فطرت انسانی ہے اور انسان بہر کیف بشر ہی ہے۔ دور شباب میں ایک شخص ان علوم پر جس حد تک حاوی ہوسکتا ہے وہ دور ضعیفی میں ممکن نہیں۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے ان علوم کا ممکنہ حد تک مطالعہ کیا اور ان کی ذیلی شاخوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ اور تذکرہ کیا۔ اس فعل کے دوران میرے پیش نظر یہ تین مقاصد تھے' تمام طالبین حق کی مدد کرنا' علوم کی توسیع کرنا اور اس ذخیرۂ علم کو اپنے دور ضعیفی میں وسیلۂ معاش بنانا۔

غرضیکہ الہیثم کے مطابق دینیات بھی ایک حقیقی علم ہے۔ ایک کلی وحدت ہونے کے سبب حقیقت مطلق کا مطالعہ معروضی وموضوعی دونوں انداز میں ممکن ہے۔ ان کے بقول علم اور حکمت ایک دوسرے سے منسلک ہیں: میری یہ ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ علم وحکمت کی تحصیل کے لیے اپنے آپ کو وقف کردوں اور مجھ پر یہ نکتہ بھی آشکارا ہوا کہ علم وحکمت کی تحصیل قرب الٰہی کا وسیلہ ہے۔

الہیثم کے مطابق اخلاقیات کے بغیر تحصیل علم نا قابل تصور ہے اور ان کے بقول اخلاقیات کوئی مجرد فلسفیانہ شے نہیں بلکہ ایک افادی اور عملی شے ہے۔ ہر عمل کا تعلق یوم آخرت کے محاسبے سے ہے۔ الہیثم کا نظام اخلاقیات ان تین نکات سے عبارت ہے: (۱) تحصیل علم کے بغیر اخلاق کی تکمیل وتزئین ممکن نہیں (۲) حقیقت علم اور خود شناسی کا ادراک دینیات کے بھرپور مطالعے' نیک اعمال اور بدی سے گریز پر منحصر ہے (۳) اخلاق کی تکمیل وتزئین کا مقصود آخرت میں جنت کی دائمی مسرت سے لطف اندوز ہونا ہے۔ غرضیکہ مذکورہ اخلاقی نظام الہیثم کی تحقیق و تصنیف کا امتیازی پہلو ہے۔

الہیثم کلاسیکی عہد کے لیے مسلم سائنسداں ہیں جو عقلیت پسندی پر کاربند ہونے کے علاوہ استقرائی طریقہ کار کے بھی بانی ہیں۔ عقلیت پسندی سے تعلق کی بنا پر مستشرقین اور متعدد مغربی مورخین سائنس نے الہیثم کو سیکولر اور دورِ جدید کی روایات پر کاربند سائنسدان کے طور پر تعبیر کیا ہے لیکن الہیثم کی عقلیت پسندی اخلاقیات کی تابع ہے۔ الہیثم دنیائے اسلام کے عقلیت پسند

گروہ یعنی معتزلہ کے مخالف تھے اور ان کی تردید میں الہیثم نے متعدد رسائل تصنیف کئے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ معتزلہ تحریک کے گڑھ بصرہ ہی دنیا کے ایک عظیم ترین مسلم ماہر طبیعیات کی جائے پیدائش تھی جس نے معتزلہ کے عقلیت پسند افکار کی تردید کی۔

الہیثم، ابن سینا اور البیرونی کلاسیکی عہد کے ایسے تین مسلم سائنسداں ہیں جن کی تحقیق و تصنیف میں علم و اقدار کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ جدید مسلم مورخین نے ان سائنسدانوں اور دنیائے اسلام کے دیگر علماء و فضلاء کے کارناموں' افکار اور سائنسی تحقیقات کا جائزہ لیتے ہوئے مغربی مورخین سائنس کے اس فیصلے سے اتفاق کیا ہے کہ مسلم علماء کے کارنامے یونان کی شہری ریاستوں میں سائنسی ترقی سے مماثلت رکھتے ہیں حالانکہ ان سائنس دانوں کے طریقے کار اور فلسفہ سائنس کے سرسری سے مطالعے سے بھی یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہی مختلف اور ایسے نظام سائنس کے قائل تھے جس میں تحقیق کے لیے کوئی ایک واحد طریقہ نہیں بلکہ متعدد طریقے یکساں طور پر جائز اور صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے بھی عقلیت پسندی کو بے شک اہم مقام حاصل ہے لیکن یہاں ایسی عقلیت پسندی پائی جاتی ہے جو اخلاقیات کی تابع ہے۔ اس لیے اس نظام میں تقلیل (Reduction) وعلیحدگی (Isolation) کے بجائے امتزاج واتحاد (Synthesis and Interration) پر اصرار ملتا ہے۔ اس نظام میں مختلف شعبۂ علوم میں اشتراک عمل کو تسلیم کرتے ہوئے علوم کی سخت گیر درجہ بندی کی بھی نفی ہے۔ یہ نظام معاشرتی اور انفرادی احتساب کے عقیدے پر استوار ہے اور اس نظام کا ماخذ قرآنی تصورات اور قرآنی اقدار ہیں۔ اس نظام کا اصل مقصود ہی ان ہی اقدار و روایات کو فروغ دینا تھا۔ ایسے نظام کو سائنس کی مستقیمی ترقی جیسے نظریے سے بھلا کیسے ہم آہنگ اور مماثل قرار دیا جاسکتا ہے؟

امتزاج واتحاد' مختلف شعبۂ علوم میں اشتراک عمل' طریقہ ہائے کار کی کثرت' معاشرتی تقاضوں کا احساس خدا کے سامنے جوابدہی کا عقیدہ جیسے تصورات کے زیر اثر تمدن اسلامی میں ایک ایسا ادارہ پروان چڑھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی اس سے مراد ہمہ دانی یا تجر علمی کی روایات ہے۔ کلاسیکی عہد کے تمدن اسلامی میں متعدد ہمہ داں علماء منظر عام پر آئے۔ یہ مظہر اسلامی سائنس کے مخصوص مزاج کا قدرتی نتیجہ تھا۔ چونکہ مسلم علماء متعدد طریقہ ہائے کار کو جائز سمجھتے تھے اور انہیں استعمال کرتے تھے اسی لیے ان علماء کی تصانیف اپنے دور کے تقریباً سب ہی معروف علوم پر ملتی ہیں۔ ان علماء کا مقصود تمام علوم یا کم از کم کسی شعبۂ علوم کی تمام ذیلی شاخوں پر مکمل عبور حاصل کرنا تھا۔ ان ہمہ داں مسلم علماء کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ محض اس کے اسماء پر مشتمل تصنیف کئی جلدوں پر محیط ہوگی۔ اس دور میں الجاحز (م ۸۶۸ء) الکندی (م ۸۷۳ء) الرازی

(۹۳۵ء) الادریسی (پیدائش ۱۱۶۶ء) ابن ماجۂ (م ۱۱۳۸ء) عمر خیام (م ۱۱۳۲ء) ابن زہر (م ۱۱۶۲ء) ابن طفیل (۱۱۸۵ء) ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) اور السیوطی (م ۱۵۰۵ء) اور ان جیسے ہزاروں معتبر علماء کا منظرِ عام پر آنا محض ایک اتفاقی امر نہیں بلکہ اسلامی سائنس کے مخصوص مزاج کا قدرتی نتیجہ تھا۔

الف لیلہٰ کے دو کرداروں کے حوالے سے کلاسیکی عہد میں ہمہ دانی کی اس روایت اور اس کے زیرِ اثر معاشرتی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''الف لیلہ'' میں ایک کردار حجام کا ہے جو طب' علم الکیمیا' نحو' خطابت' منطق' فلکیات' علم الھندسہ' علم الحساب اور علم الجبرا سے بخوبی واقف تھا۔ اسی طرح ایک دوسرا کردار ایک کنیز کا ہے جس کی تقریباً ہر شعبہ علم سے واقفیت دورِ جدید کے کسی سائنس داں کو شرمندگی سے پانی پانی کر دینے کے لیے کافی ہے۔

کلاسیکی عہد کی دُنیائے اسلام میں ہمہ دانی کی یہ روایت مغربی تمدن اور اسلامی تمدن کے فکری رویوں میں اختلاف کی آئینہ دار ہے۔ M.J.L. Young نے بھی اسی نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے: مغربی تمدن اور ابن سینا کے عہد میں کتنا زبردست تضاد ہے کہ آج ایک شخص محض کسی ایک شعبۂ علم کا ماہر اور دیگر شعبۂ علوم میں بالکل کورا ہوتا ہے لیکن اس دور میں ابن سینا جیسے افراد پیدا ہوتے تھے جنھوں نے دیگر تصانیف کے علاوہ طب کے جائزے پر مشتمل ۱۳۲۶ قطعات کی ایک جامع نظم بھی لکھی ہے۔ یہی تضاد ہمیں عمر خیام کی شخصیت میں بھی نظر آتا ہے۔ لافانی رباعیات کے باعث حاصل ہونے والی غیر معمولی شہرت کے باعث ایک بالکل ہی مختلف میدان یعنی ریاضیات میں عمر خیام کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔

تبحر علمی کی روایت کے پس پشت یہ تصور تھا کہ یہ طبعی کائنات عالم روحانیت سے کمتر نہیں بلکہ کائنات اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت ہے اور اسی لیے مطالعۂ کائنات جائز اور اہم ہے۔ مزید برآں' تخلیق خداوندی کے ان گنت مظاہر میں سے ہر مظہر مطالعے کا لائق ہے خواہ یہ مظہر صوفی کی کیفیت حال ہو یا بچے کے لیے ماں کی محبت یا تیر کی پرواز یا زمین کا محیط یا طاعون جیسا مہلک مرض یا مچھر کا ڈنک یا جنون کی ماہیت یا حسن عدل یا انسان کی مابعد الطبعیاتی آرزوئیں۔ ان تمام امور کا مطالعہ علم و تحقیق میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ خدا کی ہر تخلیق اپنی جگہ اہم ہے اور اسی لیے اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ تخلیق خداوندی کے مطالعے کا ہر قدم انسان کو قربت الٰہی سے سرفراز کرتا ہے۔ کسی دوسرے تمدن میں مذہب اور سائنس کا ایسا جامع اور کامل امتزاج دیکھنے میں نہیں آتا۔

مذہب و سائنس' علم و اقدار' طبعیات و مابعد الطبعیات کے مابین وحدت تمدن اسلامی کا طرۂ امتیاز ہے اسی طرح طریقہ ہائے کار کی کثرت بھی اسلامی سائنس کی ایک امتیازی صفت

ہے۔ اس امتیازی اور منفرد مزاج سے یہ مراد ہے کہ اسلامی سائنس کی رو سے محدود معروضی انداز کے بجائے منظم انداز میں حقیقت کی تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے۔ اس انداز تحقیق سے کوئی منفی اثرات نہیں برآمد ہوتے۔ سماجی بہبود اور عوامی مفادات' حسن کی ترقی و ترویج' صحت مند فطری ماحول' منظم مشاہدات و تجربات اور کڑے ریاضیاتی تجزیے اسلامی سائنس کی خصوصیات ہیں۔ اسلامی سائنس معروضی طور پر موضوعی ہے یعنی معروضی انداز میں موضوعی مقاصد کی برآوری۔ یہ مقاصد رضائے الٰہی کی طلب ملت کے مفادات کا تحفظ' عدل' عبادت اور خلافت جیسی آفاقی اقدار کا فروغ ہیں۔ یہ طرزِ فکر جذبات' عقائد' تعصب اور تنگ نظری پر مبنی طریقۂ تحقیق سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلامی سائنس میں جادو اور سحر کا کوئی مقام نہیں۔ اسی طرح اسلامی انداز میں تحصیل علم کے نتیجے میں کسی قسم کا انتظار یا بدنظمی واقع نہیں ہوتی اور ایک مخصوص طریقۂ کار کو یکساں طور پر مختلف شعبہ علوم پر نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس کا مقصود تمام طریقہ ہائے کار کو مساوی مقام عطا کرنا اور اخلاقیات و اقدار کے تناظر میں علم و تحقیق کو فروغ دینا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی سائنس مغربی سائنس سے قطعاً مختلف ہے کیونکہ مغربی سائنس کی رو سے تمام علوم پر ایک واحد طریقۂ کار کا اطلاق کیا جاتا ہے اور تحقیق کے نام پر معاشرتی و انسانی مفادات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اسلامی سائنس حقیقت کی کلی تحقیق و تفہیم سے عبارت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک کلی جستجو ہے۔

اس مختصر تاریخی تذکرے سے یہ بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ اسلامی سائنس موجودہ سائنس سے مختلف وجود کی حامل ہے۔ عہد اسلامی کے سائنس کی اقدار و روایات اور **Ian Mitroff** کے پیش کردہ روایتی سائنس کی اقدار و روایات کے مابین ایک تقابلی موازنہ نقشہ نمبر ا کی مدد سے پیش ہے۔

اسلامی سائنس کے حق میں تیسری دلیل یہ پیش ہے کہ مغربی سائنس اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اگر کوئی دوسرا بہتر طریقۂ تحقیق اس کے متبادل کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تو بنی نوع انسانی کا مستقبل تاریک ہے۔ جدید سائنس کی ماہیت ہی کچھ اس طرح ہے۔

مغربی سائنس بنیادی طور پر تباہ کن ہے اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے خطرہ ہے

مغربی مورخین سائنس اور معذرت خواہانہ فکر پر کاربند مسلم علماء نے بڑے طمطراق کے ساتھ اس تصور کو مقبول کیا ہے کہ دورِ جدید کی سائنس متقدمین بالخصوص یونانی اور اسلامی سائنس کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ تصور محض ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ نیوٹن نے الہیثم کی تحقیق میں اضافہ کیا' ہاروے (Harvey) نے ابن نفیس کی نقالی کی اور کپلر (Kepler) نے البطانی' البیرونی اور دیگر

ممتاز مسلم ماہرین فلکیات سے خاصا استفادہ کیا لیکن جیسا کہ ابھی میں نے اشارہ کیا کہ مسلم سائنس دانوں کا تصور کائنات بالکل مختلف تھا اور دور جدید میں رائج سائنس کے مزاج سے انہیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ یہ امر بلاشبہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم سائنس دانوں کی بعض تحقیقات نے جدید سائنس کے لیے راہ ہموار کی لیکن اسلامی سائنس اور جدید سائنس کے اعتقادات میں زبردست فرق پایا جاتا ہے۔ مسلم سائنس داں وحی الٰہی پر عقیدہ رکھتے تھے اور عقل کو قربت خداوندی کی تحصیل کے لیے ایک وسیلہ متصور کرتے تھے جبکہ مغربی سائنس داں محض عقلیت پسندی پر یقین رکھتے ہیں اور عقل کے سوا تمام ذرائع علم کو مہمل گردانتے ہیں۔

اسلامی سائنس اور مغربی سائنس......ایک تقابلی مطالعہ

مغربی سائنس کی اقدار	اسلامی سائنس کی اقدار
۱۔ عقلیت پرستی پر ایمان	۱۔ وحی الٰہی پر ایمان
۲۔ سائنس برائے سائنس کا نظریہ	۲۔ سائنس رضائے الٰہی کے حصول کا ایک وسیلہ ہے اور عبادت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کے روحانی اور معاشرتی پہلو بھی ہیں۔
۳۔ حقیقت کے ادراک کا صرف ایک واحد طریقہ ہے۔	۳۔ عقل اور وحی پر مشتمل تمام معروضی و موضوعی طریقے جائز ہیں۔
۴۔ عقلیت کے لیے نفی جذبات ایک لازمی شرط ہے۔	۴۔ روحانی و معاشرتی بہبود کے لیے سائنسی تحقیق اور جذبات کا باہمی تعلق ضروری ہے۔
۵۔ غیر جانبداری: سائنسدانوں کو محض تحصیل علم اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج اور استعمالات سے غرض ہونا چاہیے۔	۵۔ حق کے بارے میں جانبداری: چونکہ سائنس ایک طریقۂ عبادت بھی ہے اس لیے سائنس دانوں کو اپنی تحقیق کے نتائج و عواقب پر بھی نظر رکھنا چاہیے اور چونکہ عبادت ایک نیک عمل ہے لہٰذا اس عمل کے نتائج بھی خیر سے عبارت ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں لاپرواہی کے سبب سائنسداں غیر اخلاقی افعال سرزد کرنے کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔

۶۔ تعصب کا فقدان: کسی سائنسی نظریے کی حقانیت کا دارومدار ثبوت اور ثبوت حاصل کرنے والے طریقۂ کار پر ہوتا ہے کسی سائنسی نظریے کو محض راوی کی بنیاد پر صحیح یا غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔

۶۔ موضوعیت کی موجودگی: سائنسی سرگرمیوں کی سمت کا دارومدار کسی موضوعی معیار پر ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی سائنسی نظریے کی صحت کا انحصار ثبوت' ثبوت کے طریقہ کار کے علاوہ سائنسداں کی نیت اور اس کے تصور کائنات پر بھی ہوتا ہے۔ سائنسی قوتوں کی سمت اور فوقیت کے تعین کے باعث سائنسداں اپنی حدود سے واقف ہوتا ہے۔

۷۔ فیصلے کے بارے میں غیر یقینی کیفیت: متعین ثبوت کی بناء پر ہی سائنسی نظریات کی پیش کش ممکن ہے۔

۷۔ فیصلے کا تعین: سائنسی نظریات ہمیشہ غیر یقینی ثبوت پر مبنی ہوتے ہیں۔ غیر یقینی ثبوت کی بنیاد پر بھی سائنسدانوں میں نتائج اخذ کرنے کی اہلیت ہونا چاہیے۔ یقینی ثبوت کے انتظار کے باعث نقصان دہ نتائج بھی پیش آسکتے ہیں۔

۸۔ نظریۂ تقلیل: سائنسی ترقی کا بنیادی طریقہ کار یہی نظریہ ہے۔

۸۔ امتزاج: سائنس اور اقدار میں ہم آہنگی اور امتزاج سائنسی ترقی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

۹۔ تفریق: چونکہ سائنس ایک پیچیدہ سرگرمی ہے لہٰذا علوم کو متعدد شعبوں' ذیلی شعبوں' ذیلی اور ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔

۹۔ جامعیت: سائنس ایک پیچیدہ سرگرمی ہونے کے باعث مختلف علوم کے تحت منقسم کی جاسکتی ہے البتہ مختلف علوم میں اشتراک عمل ہونا چاہیے تاکہ اس سرگرمی کی نمایاں صفت جامعیت اور کلیت ہو۔

۱۰۔ آفاقیت: سائنس آفاقی ہونے کے باوجود صرف متمول افراد کی خدمت کے لیے ہے اسی لیے سائنسی تحقیقات کے ضمن میں رازداری برتی جاتی ہے۔

۱۰۔ آفاقیت: سائنسی تحقیقات کے فوائد کل بنی نوع انسان کے لیے ہیں۔ علم و حکمت کا کاروبار غیر مناسب ہے۔ سائنسی تحقیقات کے بارے میں رازداری ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔

۱۱۔انفرادیت: سائنس داں تمام معاشرتی' سیاسی اور نظریاتی امور سے بے تعلق رہتا ہے۔	۱۱۔ملت سے تعلق: سائنسی علوم کی تحصیل فرض کفایہ ہے سائنس داں اور ملت دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق و فرائض ہیں اور دونوں کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہے۔
۱۲۔غیر جانبداری: سائنس نہ خیر ہے نہ شر بلکہ قطعاً غیر جانبدار ہے۔	۱۲۔اقدار سے وابستگی: تمام انسانی افعال کی مانند سائنس بھی اقدار سے عبارت ہے۔ سائنس خیر و شر' پسندیدہ و ناپسندیدہ دونوں ہوسکتی ہے۔ جنگ کو فروغ دینے والی سائنس ہرگز جانبدار نہیں بلکہ سرتاپا شر ہے۔
۱۳۔گروہ سے وفاداری: تحقیق کے ذریعے نئے علوم کا فروغ ایک اہم ترین سرگرمی ہے اور اس میں ہر ایک کو اشتراک کرنا چاہیے۔	۱۳۔خدا اور اس کی مخلوق سے وفاداری: نئے علوم کا مقصود آیات الٰہی کی تفہیم اور مخلوقات خداوندی یعنی انسان' حیوانات اور ماحول وغیرہ کی فلاح و بہبود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم تحقیق کو جائز قرار دیا ہے لہٰذا اسے فروغ دینا چاہیے۔ سائنسی سرگرمیاں مخصوص حلقوں تک محدود نہیں رہنی ہیں۔
۱۴۔مطلق آزادی: سائنسی تحقیق پر کسی بھی پابندی کی مزاحمت کرنا چاہیے۔	۱۴ب۔سائنسی امور کا انتظام و انصرام: سائنس کو ایک بیش قیمت وسیلہ ہونے کے باعث تباہ و برباد اور گمراہ ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس کے انتظام و انصرام میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ تاکہ یہ اخلاقی حدود میں قید رہے۔
۱۵۔نتائج ذرائع کا جواز ہیں: کیونکہ سائنسی تحقیق بنیادی طور پر محمود ہے اور بنی نوع انسان کی بہبود اس کا مقصود ہے۔ لہٰذا سائنسی تجربے کے لیے انسانوں' زندہ حیوانات اور انسانی جنینوں Fohtuses کا استعمال درست ہے۔	۱۵ب۔نتائج ذرائع کا جواز نہیں فراہم کرتے: سائنس کے مقاصد اور ذرائع میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے چونکہ دونوں جائز (حلال) ہیں لہٰذا انہیں اخلاقی حدود کا پابند ہونا چاہیے۔

قرآن پاک کے ساتھ جدید سائنس کی موافقت

محمد انور بلوچ

جس قدر زمانہ تیزی سے گذرتا جا رہا ہے اس قدر دنیا ترقی کرتی چلی جارہی ہے روز روز نت نئے تجربات وایجادات کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں حتیٰ کہ مہینوں میں طے ہونے والا سفر اب منٹوں میں طے ہو رہا ہے ان ہی تجربات وایجادات کا نام سائنس ہے، کائنات کے اندر بسنے والی ہر ہر چیز پر ریسرچ و تحقیق کرنا اور اس میں غور وخوض کرنا اسی کا نام سائنس ہے۔

سائنس نے جس قدر ترقی کی ہے وہ دنیا سے مخفی نہیں ہے، قرآن حکیم نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل کائنات کی چیزوں میں غور وخوض کرنے کی دعوت دی تھی۔

اسی طرح زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ (الذاریات)

زمین وآسمان میں نظر دوڑاؤ (یونس)

زمین وآسمان کی تخلیق پر غور کرو (اعراف)

اور اسی طرح فرمایا:

یعنی (اے دیکھنے والے) کیا تو رحمان کی مخلوق میں کہیں کوئی نقص دیکھتا تھا؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ تجھے خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی شگاف نظر نہ آتا ہے پھر (یعنی بار بار) دیکھ ہر بار تیری نظر تیرے پاس ناکام لوٹ آئے گی۔

قرآن مجید نے آج سے تقریباً چودہ سو برس قبل جو باتیں کہہ ڈالی تھیں آج سائنس اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اگرچہ زمانہ قدیم کے لوگوں کے نظریات قرآنی آیات اور موجودہ سائنس سے ٹکراہٹ کرتے تھے۔ مثلاً زمانہ قدیم کے لوگوں کا یہ نظریہ تھا کہ آسمان بغیر سہارے کے نہیں ہے بلکہ یہ ستارے جو ہم دیکھتے ہیں یہ میخیں ہیں جو آسمان کے اندر گاڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے آسمان زمین پر گر کر ٹوٹنے سے محفوظ ہے۔ اسی دور میں قرآن حکیم نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے جنہیں تم دیکھ رہے ہو۔ (الرعد)

اور اسی طرح فرمایا:

یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے۔ (لقمان)

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایسی بے شمار آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آسمان بغیر کسی سہارے وستون کے بلند ہیں۔ موجودہ سائنس بھی اس بات کو تسلیم کر چکی ہے۔ اور میرے خیال میں تو کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں مگر قرآن پاک نے کسی نہ کسی پیرائے میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ قرآن حکیم نے جو نظریات برسوں پہلے پیش کئے تھے موجودہ سائنس نے ان کی موافقت کی ہے ان میں سے چند چیزوں کے حقائق سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔

کائنات کی ابتداء

کائنات اصل میں ایک جمی ہوئی چیز تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرت سے جدا کر کے ایک بہت بڑے جہاں میں بدل دیا۔ قرآن پاک نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا:

کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا۔ (الانبیاء)

اور اسی طرح فرمایا:

یعنی پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف اور وہ دھواں تھا۔ (حم السجدہ)

قرآن پاک کے یہ بیانات جو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے بتائے جا چکے ہیں موجودہ سائنس نے ان کی قدر موافقت کی ہے۔

کائنات کے ابتدائی زمانہ کے بارے میں ہمیں سائنس اتنی معلومات دے سکتی ہے جس کا مضبوط دلیل ان کے پاس موجود ہے کہ کائنات ایک ایسے گیسی مادہ سے وجود میں آئی جو ہائیڈروجن اور کچھ ہیلیم گیسوں کا مرکب تھا جو رفتہ رفتہ گردش کرتا رہا آخر کار وہ گیسی گولہ پھٹ پڑا اور بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ان ہی ٹکڑوں کے بارے میں ایک تصور پیش کرتے ہیں جن سے کہکشائیں وجود میں آئیں۔

اب غور کیجئے قرآن مجید کے مطابق زمین اور آسمان اصل میں ایک ملی ہوئی ایک چیز تھی اور سائنس کے مطابق وہ ایک گیسی گولے کی شکل میں گردش کرتی رہی، قرآن پاک میں آسمانوں کی پیدائش سے پہلے کے لیے لفظ ''دخان'' دھواں استعمال ہوا ہے، تو سائنس کے اعتبار سے چھوٹے

چھوٹے ذرات پر مشتمل ایک گیسی مادہ کا ذکر ہے یہی سبب ہے کہ لفظ ''دخان'' کا ترجمہ ''دھواں'' کیا گیا، دھواں عموماً ایک گیسی تہہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں جو سخت اور پانی نما حالت پر مشتمل ہوتا ہے جس کا گرمی پد گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ اندازہ کیجئے قرآن پاک نے کائنات کی حقیقت کو کس قدر اپنے دو پیراؤں میں سمو دیا ہے۔

چنانچہ تخلیق کائنات کے بارے میں مشہور ایٹمی سائنسدان جارج گیمو لکھتا ہے کہ کائناتی مکان (فضا) کثیر توانائی والی گاما شعاؤں سے پر تھا۔ لیکن اس میں موجودہ مادہ کا وزن مخصوص زمین سے بالاتر فضا کی ہوا کے برابر تھا، ہماری کائنات کی تخلیقی تاریخ کے پہلے گھنے کے بعد کائنات میں ۳۰ ملین سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ جب ماہ تخلیق ہو چکا اور اس کا دور دورہ ہو گیا تو نیوٹن والی کشش ثقل بروئے کار آنے لگی اور اس نے یکساں حالت کی گیس کو عظیم بادلوں میں تبدیل کر دیا اور ابتدائی کہکشائیں بن گئیں۔ کائنات اس وقت بھی قدرے گرم تھی۔ اگرچہ مکمل اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

(بحوالہ The Creation of the Universe)

پروفیسر فریڈ ہائل تخلیق کائنات کے ذکر کو ایک فقرے میں یوں سموتا ہے کہ پہلے ایک گھومتا ہوا گیس کا مرغولہ، پھر اس میں لہریں اور بھنور، پھر بادل، پھر تکاثف اور انجماد، پھر ستارے سورج اور سیارے وغیرہ اور قرآنی بیان کے مطابق کہا جائے گا کہ پہلے دھواں، پھر پانی پھر آسمان و زمین بن گئے۔

''اس کے بعد خدا نے زمین کو پھیلایا اور اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین پر ہم رہ رہے ہیں یہ بھی پھیل رہی ہے میں زیادہ طول میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ ہمارا مقصد صرف قرآن حکیم کی بات (جو برسوں پہلے کہی گئی تھی) کے ساتھ موجودہ سائنس کی موافقت کرانا ہے۔

چنانچہ امپریل کالج (لندن) میں فزکس کے استاد پروفیسر پی۔ ایم۔ ایس بلکٹ کہتا ہے:
ہندوستانی پتھر کی پیائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ ستر ملین سال پہلے ہندوستان خط استواء کے جنوب میں واقع تھا، جنوبی افریقہ کی چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ افریقی براعظم تین سو ملین سال پہلے قطب جنوبی سے ٹوٹ کر نکلا ہے۔

(تفصیل کے لیے ریڈرز ڈائجسٹ جون ۱۹۶۱ء)

سورۃ رحمٰن کی ۳۳ ویں آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعت اگر تم زمین و آسمان کے کناروں

سے نکلنے کی طاقت رکھتے ہو تو نکل لو (خبردار) تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان
کے ساتھ۔

مذکورہ بالا آیت میں سب سے پہلے اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان و جن زمین و آسمان کے کناروں سے نفوذ نہیں کر سکے گا، مگر یہاں سلطان کے ذریعے اس آیت میں یہ دونوں باتیں ہیں ایک تو زمین و آسمان کا اقطار سے باہر نکل جانے کا انکار بھی ہے اور سلطان کے ذریعے سے نکل جانے کا امکان بھی ہے۔ امکان تو ہے نظام شمسی کے سیاروں میں جا سکنے کا سلطان کی قوت اور تیزی کے ذریعے زمین کی کشش کے دائرے سے باہر نکل جائیں گے اور انکار اس لیے ہے کہ اپنے نظام شمسی سے باہر نکل کر کسی اور سیارے میں پہنچنا ناممکن ہے۔ اسی لیے کہ ہر وہ سیارہ جس میں انسان جانے کا ارادہ کرے گا وہ ہماری زمین کی طرح کسی نہ کسی اور سورج کے گرد گھوم رہا ہوگا۔ اور حالیہ تحقیق سے بھی پتا لگا ہے کہ ہر ایک سیارہ ہمارے سلطان (راکٹ) کی تیزی سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے سورج سے دور ہٹتا چلا جا رہا ہے۔

قرآن کے ایسے انکشافات کو پڑھ کر فرط حیرت سے آنکھیں کھل جاتی ہیں یہاں پر لفظ ''سلطان'' کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ مذکور آیت میں لفظ سلطان آیا ہے، جس کے معنیٰ ہے زبردست قوت اور طاقت انتہائی تیزی پوری قدرت، صحیح رہنمائی اور بادشاہت، اور یہ راکٹ اپنی طوفان خیز رفتار سے ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی طوفان خیز رفتار سے زمین کی کشش کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ ''سلطان'' کے لفظ میں راکٹ کی شکل و صورت کا اشارہ بھی پوشیدہ ہے، کیونکہ لفظ ''سلطان'' کا مادہ ہے س، ل، ط اس سے ایک لفظ ''سلطۃ'' مشتق ہوتا ہے جس کے معنیٰ ہیں وہ خاص طور پر پتلا اور لمبا تیر جو کہ بہت ہی سرعت اندازی کے ساتھ کمان سے نکل کر اپنے نشانے پر جا لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان سلطان کے ذریعے سے زمین کے کشش کے دائرے سے نکلا ہے، مگر یاد رہے کہ انسان ابھی تو چاند جیسے قریبی ہمسائے تک ہی پہنچا ہے۔ اگر وہ مریخ، مشتری، عطارد زحل اور پلوٹو کو بھی چھان ڈالے تو وہ اقطار السمٰوٰت والارض اور خدا کی گرفت سے ہرگز نہیں نکل سکتا ہے۔

تاریخ الشمس والارض کے بارے میں ہیئت دانوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں بعض نے کہا کہ زمین حرکت کرتی ہے اور سورج ساکن اور بعض نے کہا سورج حرکت کرتا ہے اور زمین ساکن ہے، مختلف ادوار میں مختلف نظریات پیش کیے گئے بالاختصار چار ادوار مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا دور: اس دور میں کسی رصدگاہ یا دوربین کا وجود تھا۔ لہٰذا اس علم کی بنیاد عام انسانی مشاہدہ کے مطابق تھی۔ اس نظریہ کے مطابق زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک تصور کیا جاتا تھا۔

دوسرا دور: اس دور میں سب سے پہلے یونان کے ایک حکیم فیثا غورث نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اور دوسرے سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔

تیسرا دور: بعد ازاں چوتھی صدی ق۔م میں بطلیموس فلاسفر نے علم ہیئت کے متعلق وہی پہلا نظریہ پیش کیا جس میں زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دیا گیا تھا۔

چوتھا اور موجودہ دور: اس دور کے اندر کئی نظریات پیش کئے گئے آخر کار اٹلی کے ایک ہیئت دان گیلیلیو نے ایک دوسرے ہالینڈ کے ہیئت دان کی مدد سے کئی قسم کی دوربینیں تیار کیں ان کی مدد سے مشاہدہ کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ زمین متحرک ہے اور سورج ساکن ہے۔ یعنی ان چاروں ادوار میں بہت سے نظریات پیش ہوئے لیکن آخر کار نتیجہ یہی نکلا کہ زمین اور سورج دونوں ہی متحرک ہیں۔ اس بارہ میں شیلی کا نظریہ حقیقت کے قریب لے جاتا ہے۔

۱۹۱۷ء میں شیلی نے سورج اور ہماری کہکشاں کے مرکز کے درمیان فاصلے کا اندازہ ۱۰ دس کلو پارسک لگایا اگر اس میلوں میں بتایا جائے تو ۲ کا ہندسہ لکھ کر ۲۷ ستائیس زیرو لگائے جائیں گے۔ اپنے محور پر ایک چکر پورا کرنے کے لیے کہکشاں اور سورج کو اندازاً ۲۵۰ ملین سال لگیں گے یعنی ۲۵ کروڑ سال لگیں گے۔ سورج اس کی تکمیل کے لیے ۱۵۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے مسافری طے کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ سورج اور زمین متحرک ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو بات سائنس کو اب معلوم ہوئی ہے قرآن پاک نے وہ بات برسوں پہلے ہمیں بتا دی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یعنی سورج اپنی مقررہ جگہ پر چلتا ہے۔ (یس)

اور دوسری جگہ فرمایا:

یعنی ہر کوئی آسمان میں اپنے مدار پر تیر رہے ہیں۔ (الانبیاء)

اب سائنس بھی تسلیم کر چکی ہے کہ تمام سیارہ جات اپنے اپنے محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔

بہر کیف تمام سائنسدانوں کے نظریات ان کی تحقیقات اور ایجادات کو ملا کر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے جو نظریے برسوں پہلے پیش کئے تھے سائنس نے آخر کار اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور ان نظریات کو تسلیم کر لیا ہے۔

جدید دور کی سائنس قرآن کریم کی نظر میں!

محمد صادق الخیری

مسلمانوں میں سے ایک طبقہ جو اپنے آپ کو بہترین قرار دیتا ہے اور ہمیشہ مغرب کی تعریف کے پل باندھنے میں بے دریغ اپنی قوت خرچ کرتا ہے۔ قرآن کی تعلیم اور حدیث نبوی ﷺ کو پیٹھ پیچھے ڈال دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد کو دین کے ساتھ شغف نہیں ہوتا بلکہ وہ مغرب سے مرعوب ہو کر اسے بہتر قرار دیتا ہے حالانکہ جس دین پر مسلمان عمل پیرا ہیں وہ دین ابتداء سے لیکر انتہاء تک ابد سے لیکر ازل تک عالمگیر نظام اور ضابطہ حیات ہے جس پر کائنات کا ہر فرد عمل کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ دین انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ سائنس جس پر مغرب کو فخر ہے وہ سائنس بھی ہمارے قرآن کی ایجاد ہے۔ لہٰذا مغرب کو فخر کرنے کی بجائے اسلام جیسے دین پر ایمان لانا چاہیے اور اپنی زندگی کا ہر گوشہ اسلام کے مطابق ڈھال لینا چاہیے۔

سائنس کا معنی

سائنس ایک عربی لفظ ہے۔ سائنس اصل میں سائس ہے، اور سائس کا معنی توڑنا اور ریسرچ کرنا ہے۔ چھان بین کرنا ہے، اور اسی سے سیاست ہے اور سائنس اور سیاست کا مادہ ایک ہے اور سیاست کا معنی انتظام کرنا ہے جبکہ لغوی معنی بھیڑوں کی رکھوالی کرنا۔

بانی سائنس کون؟

اس کا بانی اسلام ہے اور اسلام حقیقت میں قران ہے اور اگر سائنس کا بانی قرآن نہیں ہے تو ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ قرآن سے پہلے لوگوں نے جہاز کیوں نہیں بنائے؟ ٹیکنالوجی کیوں نہیں تھی؟ جدید مشینری کیوں نہیں تھی؟ ریڈیو، ٹی وی کیوں نہیں تھا، وائرلیس سسٹم کیوں نہیں

تھا؟ لوہے کو مسخر کیوں نہیں کیا گیا، بحری جہاز کیوں نہیں بنائے گئے؟ تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن آیا ہے تو یہ سب چیزیں ایجاد ہوئی ہیں تو معلوم ہوا ان سب دلائل سے کہ بانی سائنس قرآن رہی ہے۔

دور محمدی ﷺ سے قبل سائنس کہاں؟

اے دنیا کے کافرو، دنیا کے فتح کرنے والو! جن چیزوں کو تم توڑتے پھوڑتے ہو ان کی ریسرچ کرتے ہو قرآن کے آنے سے پہلے لوگ ان کو خدا کہتے تھے۔

پتھر کو توڑنا سائنس ہے جبکہ قرآن سے قبل پتھر کو خدا کہا جاتا تھا۔ توڑا کیسے جائے لوگ درخت کو خدا کہتے تھے۔ کاٹا کیسے جائے؟ چاند کو سجدہ ہوتا تھا، ریسرچ کیسے کی جائے۔ ستاروں کو سجدہ ہوتا تھا۔ ریسرچ کیسے کی جائے؟

کافروں نے جن اشیاء سے سائنس بنائی ہے ان کو تو لوگ سجدہ کرتے تھے اور ان کو توڑا کیسے جائے۔ تو جب قرآن اترا تو اس نے آکر کہا کہ پتھر خدا نہیں ہے، چاند خدا نہیں ہے، سورج خدا نہیں ہے، درخت خدا نہیں ہے، قرآن نے آکر ان کی خدائی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ جب ان کی خدائی ختم ہوگئی اب کافروں نے ان کو توڑنا اور ان کی ریسرچ کرنی شروع کر دی۔

ترقی یافتہ ممالک اور کتب سماویہ

آپ نے دیکھا ہے اس وقت پوری دنیا میں سائنس میں سب سے زیادہ ترقی یورپ نے کی ہے۔ ایک طرف یورپ نے ترقی اور دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ نے ترقی کی مزے کی بات یہ ہے کہ یورپ امریکہ برطانیہ سب عیسائی ممالک ہیں اور ساری ترقی ان کے گرد گھومتی ہے اور انہوں نے سائنس میں جتنی ترقی کر ڈالی کہ ٹی وی بنا دیا۔ ایک آدمی امریکہ میں بیٹھ کر تقریر کرتا ہے۔ آپ اسی کو کاسٹ کی ہوئی تقریر یہاں سنتے ہیں آپ برطانیہ میں کسی سے بات کرنا چاہیں تو ٹیلی فون ایک ایسی ایجاد ہے کہ ایک لمحے میں آپ وہاں بات کر سکتے ہیں اور آپ کی عقل حیران ہے ان عیسائیوں کی دنیا میں ویدرک جیسے انسان پیدا ہوئے؟ ان عیسائیوں کی دنیا میں برناڈشا جیسے سکالر پیدا ہوئے۔

لیکن وہ برطانیہ و امریکہ اور فرانس کے ممالک پوری دنیا کو چکنا چور کرنے، اور ایجادات کے علم بردار ایک انجیل کا حافظ پیش نہ کر سکے پوری دنیا میں یہودی تورات کا حافظ پیش نہ کر سکے اور مسلمان ان کافروں کے شہروں میں ایک کیا ہزاروں مسلمان حافظ پیش کرنے کی سعادت رکھتے ہیں تو یہ مسلمان کے سچے ہونے کا اور قرآن کے اعجاز ہونے کی دلیل ہے۔

قرآن اور سائنس

قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس قرآن نے اپنا بھی تعارف کرایا، اور اپنے نبی کا تعارف کرایا قرآن نے سائنس کے مسئلے بھی بتائے مثلاً قرآن نے کہا:

و کل فی فلک یسبحون کہ جتنے بھی آسمان ہیں یہ سارے ملحق تھے زمین کے ساتھ یعنی زمین آسمان ایک تھے ایک وقت ایسا آیا کہ قرآن نے بتایا اور اعلان کیا۔

و کل فی فلک یسبحون کہ آسمان جتنے بھی ہیں یہ اجرام فلکیہ ہیں، تو جس چیز کا اعلان قرآن نے ۱۴ سو سال پہلے کیا۔ ابھی تین سو سال پہلے برطانیہ کے ایک سائنسدان نے کہا کہ میری ریسرچ کہتی ہے کہ زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے یعنی آج کے سائنس وان نے قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق کردی جو چودہ سو سال پہلے محمد e کے قرآن نے کہا تھا۔

اور آج کے سائنسدان نے یہ بھی مانا کہ، **وجلعنا من الماء کل شی** ۔ ہر چیز پانی سے ہے اور یہ فلسفہ قرآن نے بتایا کہ ہر چیز زندہ ہی پانی سے ہے تو آج کے سائنس دان نے قرآن کے اس سائنسی اصول کی تصدیق کردی اور انہوں نے کہا کہ واقعی ہر چیز کی زندگی پانی کی وجہ سے اور یہ دعویٰ چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے قرآن کر چکا ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس نے سائنس کا سبق بھی دیا اور ایسی حیرت انگیز خبریں بھی بتادیں جو ایک عام آدمی کی کتاب نہیں بتا سکتی۔

تو اسی طرح قرآن کا دعویٰ روشن ہے کہ یہ دین اسلام غالب ہوگا لہٰذا آج کے دنیا کے سارے کافروں کو چاہیے کہ وہ قرآن کے حقائق پر ایمان لائیں تا کہ دنیا کے امن کے علمبردار بن جائیں ورنہ اللہ کا اعلان ہے۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق یظهره علی الدین کله (التوبة : ۳۳)

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے دلوں میں سائنس کی عزت کرنے کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ سائنس بھی قرآن کی ایجاد ہے ہاں ایسی سائنس سے ضرور بچا جائے جو انسان کو اللہ کے انکار کرنے پر آمادہ کرے۔ آمین۔
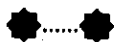
قرآن، سائنس اور عصر حاضر

پروفیسر مولانا محمد ادریس مفتی

دنیا کے تمام حکماء اور عقلاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقل سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور علم سے بڑھ کر کوئی کمال اور فضیلت نہیں۔ اگر عقل ہے اور علم نہیں تو اس کی مثال عریاں اور برہنہ شخص کی ہے اور اگر خدانخواستہ عقل ہی نہیں تو پھر زندگی ہی نہیں ایک مردہ انسان دراصل زندہ مجنون سے بہتر ہے معاش ہو یا معاد، دین ہو یا دنیا سب کا دارومدار علم پر ہے مگر علوم وفنون کی کوئی حد اور شمار نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے علم کی دو شاخیں بیان فرمائی تھیں ایک علم الادیان اور دوسری علم الابدان یعنی ایک آخرت بنانے کا علم اور دوسرا جسم اور اس کی ضروریات کا علم۔ اب ان دونوں علوم کا اگر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جسمانی علوم سے یہ جہان یعنی دنیا اور انسانی زندگی کے لوازمات اور اس کی ضروریات تو پوری ہوسکتی ہیں لیکن حیات ابدی کا سامان نہیں ہوسکتا، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہوئی کہ عارضی اور فانی دنیا کو سنوارنے کے بجائے آخرت اور ابدی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر اور طبیب کسی مریض کی ایک آنکھ تو درست کر سکتے ہیں بینائی میں اس کی مدد کر سکتے ہیں لیکن اس آنکھ میں شرم وحیا کی کیفیت کا پیدا کرنا یہ علم ادیان سے ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں ''وعلم آدم الاسماء کلھا'' یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم کا ماخذ وحی الٰہی ہی ہے اور یہی وحی تمام علوم کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس آیت میں اسماء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ ''اسماء'' جمع کا مفہوم دیتا ہے اس کا واحد لفظ ''اسم'' ہے اور اسم کا ترجمہ اردو میں نام سے کیا جاتا ہے یہی وہ غلط فہمی کی ابتدا ہے جہاں اردو دان طبقہ وحی کے اصل مفہوم سے نابلد رہ کر اللہ کے اصل پیغام کو سمجھنے سے قاصر بن چکا ہے۔ مگر عربی کے ''اسم'' کا مفہوم اردو کے ''نام'' سے بہت وسیع ہے۔ تفسیر ماجدی جلد اول صفحہ ستر۰۷ میں ہے کہ اسم وہ ہے جس کے ذریعے کوئی چیز جانی پہچانی جائے۔

القاموس المحیط میں علامہ فیروز آبادی تحریر فرماتے ہیں کہ "اسم الشئی علامۃ" یعنی کس چیز کا اسم اس کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ "الاسم ما یعرف بہ ذات الشئی" یعنی اسم کے اصل معنی یہ ہیں کہ جس سے کسی چیز کی ذات اور حقیقت معلوم ہو سکے اور یہ پہچان و شناخت اس وقت ممکن نہیں جب تک مسمی چیز کی ذات اور ماہیت کے ساتھ ساتھ اس چیز کی طبعی خصوصیات اور اثرات کا علم نہ ہو۔ یہاں تک تو بات "اسم" کے لفظی معنی کے اعتبار سے تھی اور لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو آیت "علم آدم الاسماء کلھا" کا مفہوم اس طرح سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام موجودات عالم اور مادی کائنات کے نام اور ان کے اندر جاری وساری طبعی خصوصیات (Natural Laws) کا علم دے دیا۔

علامہ قاضی عبداللہ بن عمر بیضاویؒ اپنی شاہکار تفسیر بیضاوی شریف میں اسی عنوان کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ "آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چیزوں کی حقیقت و ماہیت ان کی طبعی خصوصیات ان کے نام اور کسی چیز کے جاننے سمجھنے کے اصول، مادی صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں اور کارخانوں میں استعمال ہونے والے آلات اور اوزار کی کیفیات کے جملہ علوم کا الہام کر دیا" اس ساری بحث سے یہ بات خلاصے کے طور پر سامنے آتی ہے کہ تمام علوم خواہ وہ بدنی ہوں یا اخروی حیات سے متعلق ان سب کا ماخذ و سرچشمہ وحی الٰہی اور ذات باری تعالیٰ ہے۔ اب بعد میں انسانی فکر پر پڑنے والے خواہشات اور ہوس کے پردوں نے اس اصل کو فراموش کر دیا لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے مسٹر ایچ ایس لیڈر لکھتے ہیں کہ

"تعلیم قرآن سے حکمت یعنی سائنس اور فلسفے کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ وقت کی بڑی سے بڑی یورپین حکومت سے بڑھ گیا۔

دنیائے سائنس کے مشہور عالم پروفیسر آئن شائن اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے تمام تجربات کے نچوڑ کے طور پر ایک کتاب "Out Of My Later Days" لکھی اس کتاب میں وہ کہتا ہے کہ "سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیے" اس لیے اقدار کی قیمت متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کی قیمت متعین کرے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کریں۔ وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے اس کی

دنیا میں نہ تو اقدار متعین کرسکی ہے اور نہ ہی انھیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔ سائنس زیادہ سے زیادہ ایسے ذرائع فراہم کرسکتی ہے جن سے انسان اپنا مقصد حاصل کرلے۔ ہم نے تلخ تجربوں کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوع انسانی کے لیے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئی ہے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہوگیا ہے جس سے وہ اپنے Technical ماحول کا غلام بن کر رہ گیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے خود اپنی تباہی کے لیے بڑے بڑے ہلاکت آفرین سامان مل گئے...... اس لیے ہمیں عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیے۔ اس ''خدا'' کے عضلات تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات نہیں ہے۔ یہ صرف خدمت اچھی طرح سے کرسکتا ہے رہنمائی نہیں کرسکتا۔ عقل ذرائع اور اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد اور اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔ یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں بلکہ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں بلکہ وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اتری ہیں۔ اس لیے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربے سے درست ثابت ہوا۔ اس تناظر میں اگر آج کے شور شرابے اور پروپیگنڈے کو دیکھا جائے تو علم اور علمی جہان ایک مسخ شدہ لاشے کی طرح معلوم ہوں گے۔ آج علم سے مراد خواہشات کے حصول اور من مانی زندگی بسر کرنا رہ گیا ہے۔

قرآن مجید اور جدید سائنسی انکشافات

ابو علی عبدالوکیل

قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ تمام مخلوق ایسا عجیب و غریب اور فصیح و بلیغ اور پرحکمت کلام پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ نہ تو نظم ہے نہ ہی نثر بلکہ کلام ربانی ہے اور تمام کلاموں کے ممتاز اور نرالا کلام ہے۔ یہ اپنی ذات میں خود ہی کامل، معجزہ اور حق و صداقت کی محبت و برہان ہے۔ اس کی ایک آیت لاثانی معجزہ ہے۔ قرآن جہاں اللہ کی وحدانیت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی تعلیم دیتا ہے وہاں جدید سائنس میں بھی ترقی کی دعوت دیتا ہے۔

ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج شخص جو بیک وقت جمود اور علم جدید کی مرعوبیت سے پاک ہے مطالعہ قرآن کے وقت یہ حقیقت معلوم کر کے ششدر و حیران رہ جاتا ہے کہ اگر یہ کتاب ایک امی پر آج سے چودہ سو برس پہلے عرب کے محدود اور علمی دنیا سے منقطع ماحول میں نازل ہوئی تھی اور اس میں بڑی تعداد میں ان حقائق و اشیاء کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، فلکیات، اجرام سماوی، علم الحیات، طب، انسان کی حس اور اس کے جسم کی تکوین و ترکیب اور ایسے بہت سے علوم سے بہت گہرا ہے۔ جن کے بارے میں ان پچھلی صدیوں میں حقائق و معلومات کا ایک نیا عالم منکشف ہو گیا ہے اور علم انسانی کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کو علم جدید نے خلاف واقعہ ثابت کر دیا ہو، بلکہ بہت سے حقائق کی نقاب کشائی علم جدید نے حال ہی میں کی ہے۔

قرآنی آیات کی اب تک جو جدید تحقیقات سامنے آئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

زمین آسمان کا ملا ہوا ہونا

قرآن مجید کی سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۰ میں ارشاد ربانی ہے:

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی ﷺ کی) بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔''

قرآن مجید یہ اصول آج سے چودہ سو سال پہلے بیان کرتا ہے کہ کائنات کے بالائی و زیریں حصے سب کچھ وحدت کی طرح پیوست تھے بالآخر اس تحقیقی وحدت کو منتشر کیا گیا اور مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیئے گئے۔

کائنات کی توسیع پذیری

حیرت کی بات ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل جبکہ عربوں کے پاس کوئی بھی فلک بینی کا آلہ موجود نہ تھا قرآن مجید نے ایک ایسی بات کہہ دی جس کا انکشاف ۱۹۴۸ء کے بعد کوہ پلومر کی ایک بہت بڑی دوربین نے کیا اور وہ یہ کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

''ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم اس میں توسیع کرتے رہیں گے۔'' (الذاریات:۴۷)

یہ بات اللہ تعالیٰ کے وجود کی ایک کھلی نشانی ہے۔

بلندی پر سانس کی تنگی:

جدید دور میں ہوائی جہاز کی ایجاد کے بعد پتہ چلا کہ بلندی پر جاتے ہوئے آکسیجن کی مقدار نسبتاً کم ہوتی جاتی ہے اور سانس لینے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے ہوائی جہازوں میں منصوعی طور پر آکسیجن پہنچانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

حضور کریم ﷺ کے زمانے میں بلندی پر جانے کا یا آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تصور نہ تھا، لیکن قرآن مجید کی یہ آیت انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے:

''پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی (اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے) کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے (بلندی کو جا رہا ہے)۔ (الانعام:۱۲۶)

تخلیق

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور زمین میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم پیدا کیئے اور اس میں ہر قسم کی جوڑا جوڑا چیزیں اُگائیں۔'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو نر اور مادہ سے پیدا کیا۔ جانوروں کی طرح پودوں میں بھی نر اور مادہ موجود ہیں۔ نر پودوں میں زر بوریا اور مادہ پودے میں بقچہ گل کے اکٹھے ہونے سے نئی افزائش ہوتی ہے بعض حالتوں میں نر اور مادہ پودے کے درخت الگ الگ اور کبھی ایک ہی درخت پر دونوں اقسام موجود ہوتی ہیں۔

دوسری اشیا میں بھی ایسے جوڑے موجود ہیں جیسے مثبت منفی برق، مقناطیس کے قطبین وغیرہ ہم امکانی طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری زمین کے مقابل سورج کی دوسری طرف دوسری زمین بھی ہوگی۔ جس کی محوری گردش الٹ سمت میں مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف ہوگی۔ اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

''رب المشرقین ورب المغربین''

دنیا کے ہزار سال اللہ کے ہاں ایک دن

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

''دنیا کے ہزار سال اللہ کے یہاں ایک دن کے برابر ہیں۔''

معلوم ہوا کہ اضافیت زماں کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ماضی و مستقبل نہیں بلکہ حال ہی حال ہے۔ نظریہ اضافیت کی اسراع جو دنیا کی سب سے مشہور اسراع ہے اس کے مطابق $E= mc^2$ E_6 سے مراد توانائی m^6 سے مراد مادہ اور C^2 سے مراد روشنی کی رفتار ہے۔ اس نظریہ کے تحت نہایت ہی پیچیدہ سوالات کی گتھیاں سلجھ رہی ہیں جرمن پروفیسر کہتے تھے کہ روشنی کی رفتار کے حساب سے خلائی جہاز بعید سے بعید سیاروں پر کمندیں ڈال سکیں گے۔ زمین کے سالہا سال خلا میں چند سیکنڈ میں گزر جائیں گے اور خلا باز یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اپنی دانست میں وہ جن دوستوں اور بیوی بچوں کو چند روز قبل چھوڑ کر گیا تھا وہ دنیا پر سالہا سال گزر جانے کے باعث بوڑھے ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید کی حقانیت کا یہ زندہ ثبوت ہے۔

امی لقب حضرت محمد ﷺ کو چودہ سو سال قبل آخر کس نے اضافیت زماں و مکاں کے

اس پیچیدہ نظریہ سے آگاہ کیا تھا۔ سمجھ دار کے لیے اشارہ کافی ہے۔

سورج کی گردش

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور سورج اپنے ٹھکانے کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے یہ سب زبردست علم ہستی کا باندھا ہوا نصیب ہے۔''

اٹھارھویں صدی میں یہ بات سامنے آئی کہ سورج متحرک ہے اور خلا میں سفر کر رہا ہے کیلیفورنیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر کا اندازہ یہ ہے کہ سورج اپنے نظام شمسی سمیت چوبیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

زمین کی پیدائش:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''ہم نے زمین کو دو دن میں بنایا پھر اس میں سے پہاڑ نکال دیئے اور پھر اس میں بہت سی کارآمد اور اچھی چیزیں پیدا کیں اور سبز سبزہ ہر قسم کی خوراک پیدا کی اور ان کاموں میں چار دن لگ گئے لہٰذا پوچھنے والوں کو بتا دو کہ زمین چھ دن میں تیار ہوئی۔''

یعنی پہلا دن سورج سے نکلنے کا دوسرا اس آگ کے گولے کے ٹھنڈا ہونے کا اور چار دن دوسری تیاریوں کے یہی چھ مرحلے یا پیریڈ سائنسی تحقیقات بھی ثابت کرتی ہیں۔

پہاڑ زمین کی میخیں:

دور جدید میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمین کے بیرونی سخت حصے (قشر ارض) کے نیچے ایک نرم طبقے کے اندر پہاڑ داخل ہو کر جڑوں کا کام کرتے ہیں اور زمین کو ہلنے اور کھسکنے سے بچاتے ہیں اور یوں وہ توازن برقرار رکھتے ہیں۔ قرآن مجید یہ بات چودہ سو سال قبل بیان کرتا ہے:

''ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیئے تا کہ زمین انہی سمیت کہیں ڈھلک نہ جائے۔ (الانبیاء:۳۱)

ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنا دیا (انہیں زمین میں گاڑ دیا) (النبا:۷)

سورج پھٹ پڑے گا

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

''جس وقت سورج کو لپیٹا جائے گا۔ستارے گدلے پڑ جائیں گے پہاڑ جلا دیئے جائیں گے، دس مہینے کی حاملہ اونٹنی عدم توجہی کا شکار ہو جائے گی۔ وحشی جانور (انسانوں کے ساتھ) اکٹھے کیے جائیں گے، مختلف جانوروں کو اکٹھا کیا جائے گا زندہ درگور کی گئی (بیٹی) سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس گناہ کی پاداش میں مارا گیا۔ اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے۔ آسمان کی کھال اتار دی جائے گی۔دوزخ دہکائی جائے گی اور بہشت کو قریب لایا جائے گا (اس دن) ہر شخص جان لے گا جو اس نے (اعمال) پیش کیے ہوں گے۔''

ایک نظریے کے مطابق زمین کی اندرونی قوتیں بروئے کار آنے سے قشر ارض پھٹ پڑے گا اس سے قبل آفتاب یکا یک اپنی دوزخ بداماں آگ کے ساتھ پھٹ کر خاموش ہو جائے گا۔سورج کے اندر ہائیڈروجن گیس کے ذرات سخت حرارت اور بے پناہ دباؤ سے ہلیم گیس میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔جس سے ہائیڈروجن کم ہوتی جارہی ہے سورج کی شعلہ افشانی بڑھتی جا رہی ہے چنانچہ جیسے جیسے گری بڑھتی جائے گی آبی ذرائع خشک ہوتے جائیں گے اور زمین پر آثار زندگی ناپید ہوتے جائیں گے اور ممکن ہے کہ پھر سورج پھٹ پڑے۔

قطبی ستارے

زمین کے دونوں قطب قطبی ستارے کی سیدھ میں واقع ہیں جس کی وجہ سے یہ ستارہ ہمیں سیدھا نظر آتا ہے۔ زمین کے دونوں پول کا قطب ستارے کی سیدھ میں رکھنے میں بھی حکمت پوشیدہ ہے اور زمین کا جھکاؤ سورج کے گرد مدار میں اس کے خط استوا سے ایک خاص انداز میں رکھا گیا ہے تا کہ زمین ایک سیدھ میں قائم رہے۔خوشگوار موسمی تغیر اسی کا نتیجہ ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین کا توازن بگڑ جاتا اور سمندروں کا پانی خشکی پر چڑھ آتا اور دن رات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

زمین کو پیدا کرنے میں بھی ایک خاص انداز اپنایا گیا ہے اور قطبی ستارے سے منسلک کرنے میں بھی ایک حکمت ہے۔زمین سورج سے ایک خاص فاصلے پر خاص حجم اور کثافت دے

کر بنائی گئی ہے۔اس حقیقت کو قرآن مجید میں ۱۴۰۰ سال پہلے بیان کرتا ہے۔

کائنات کا دھواں ہونا

سائنس کے مطابق کائنات کی تشکیل ایک ایسے (دھوئیں) مادے سے ہوئی، جو ہائیڈروجن اور ہیلیم پر مشتمل ہے اس دور کے سائنسدان اب اس دھوئیں کو دیکھ رہے ہیں اور مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اس سے کس طرح ستارے بن گئے۔

اللہ تعالیٰ ڈیڑھ ہزار سال پہلے فرماتے ہیں:

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آ جاؤ تم چاہو یا نہ چاہو دونوں نے کہا ہم آگئے ہیں فرمانبرداری کی طرح۔ (حم سجدہ:۱۱)

موریس بکائے بائبل، قرآن اور سائنس میں لکھتے ہیں کائنات کے ابتدائی مرحلے میں دخان (دھوئیں) کی موجودگی جس کا حوالہ قرآن مجید میں ہے اور جس سے مراد مادے کی زیادہ تر گیس والی حالت ہے۔صریحاً اس ابتدائی تخلیق والے تصور سے مطابقت رکھتی ہے جو سائنس نے پیش کیا ہے۔

پہاڑوں کا بڑھنا

تحقیق ثابت کرتی ہے کہ ہمالیہ پہاڑ ہر سال تقریباً بارہ انچ اونچا ہو جاتا ہے۔سائنسی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ بادلوں کی بڑھنے کی رفتار زمین کے اپنے چکر لگانے کی ہوتی ہے اور پہاڑ زمین کے ساتھ ہیں چنانچہ وہ بھی بڑھتے ہیں۔

سورۂ نحل میں ارشاد ربانی ہے:

"تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ جامد ہیں، لیکن یہ بھی بادلوں کی طرح بڑھتے ہیں۔"

سمندر میں اندھیرے ہیں

سمندر کی کچھ موجیں سطحی اور کچھ بحر کے نیچے ہوتی ہیں۔تہ بہ تہ موجیں موجود ہیں۔اسی طرح سمندر کی گہرائیوں میں بھی تہ بہ تہ اندھیرے موجود ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مچھلیوں کو جگنو کی طرح روشنی عطا فرما کر ان اندھیروں میں روشنی کا کام کیا ہے سورج کی روشنی کو اوپر والی موجیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں اور سمندری گہرائی تک نہیں پہنچنے دیتی ہیں جیسے بادل سورج کی روشنی

زمین تک نہیں پہنچنے دیتے۔

قرآن پاک اس حقیقت کو پہلے یوں بیان کرتا ہے:

"یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی (نور) نہیں۔

(النور:۴۰)

آکسیجن کی موجودگی

سائنس در حقیقت زندگی کے دوسروں شعبوں کی طرح اسلام کے ہی تابع ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

"وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے آگ روشن کرتے ہو۔" ہر بھرے درختوں میں آکسیجن موجود ہوتی ہے جو جلنے میں مدد دیتی ہے اور ہم اس کی وجہ سے آگ روشن کر سکتے ہیں۔

نباتاتی مادے

پودے میں پانی جذب کرنے کی وجہ سے ایک سبزی مائل مادہ جسے کلوروفل کہتے ہیں پیدا ہوتا ہے اسی مادہ سے نباتات میں دانے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے لیے نباتات میں سے ہر چیز پیدا کی اور اس میں سبز مادہ پیدا کیا جس کے ذریعے ہم دانوں کے ڈھیر پیدا کرتے ہیں۔"

دودھ کے اجزاء

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

"یقیناً جانوروں میں تمہارے لیے سبق ہے ہم تمہیں ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے مادے اور خون کے اختلاط سے ہے ایسا

دودھ دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خالص اور فرحت بخش ہے۔"

موریس بکائے اس آیت کی تشریح لکھتے ہیں:

دودھ کے اجزائے ترکیبی دودھ کے مخصوص غدوودں سے برستے ہیں پھر ان کو غذا کے ہضم ہونے والے حصوں میں غذائیت ملتی ہے جو خون کی نالیوں کے ذریعے ان تک پہنچتی ہے، خون اس غذائیت کا جو کھانے سے حاصل ہوتی ہے جمع کرنے اور پہنچانے والا عامل ہے۔ اسی سے دودھ کے غدودوں کا تغذیہ ہوتا ہے جہاں دودھ کی تولید ہوتی ہے ایسا عمل دوسرے اعضا میں بھی ہوتا ہے۔"

فرعون موسیٰ اور قرآن کی پیش گوئی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پیش گوئی کی تھی کہ فرعون موسیٰ کی لاش کو دنیا بھر کے لیے عبرت کے طور پر محفوظ کیا جائے گا۔

"اب تو ہم تیری لاش ہی بچائیں گے تا کہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت ہے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔"

۱۹۰۷ میں فرعون کی لاش جو کہ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں غرق ہوا تھا مل گئی۔ اس کی پٹیاں کھولی گئیں تو یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی تھی۔ جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی۔ فرعون بحیرہ مرہ میں غرق ہوا تھا جو اس زمانے میں بحیرہ احمر سے منسلک تھا جزیرہ نما سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے جبل فرعون کہتے ہیں۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں نہایت گرم پانی کا چشمہ ہے جسے حمام فرعون کہتے ہیں۔ معلومات کے نتیجے میں فرعون کی لاش کو پھول کر سطح پر پہنچنے اور حمام فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا جس دوران اس کے گوشت پوست میں سمندری پانی کا نمک جذب ہو گیا ہوگا۔ تین ہزار سال میں یہ رفتہ رفتہ ایک تہ کی صورت میں جم گیا اور پٹیاں کھولیں تو یہ نمک لاش پر پایا گیا۔

سورج ٹھنڈا ہو جائے گا

قانون بقائے توانائی کے مطابق توانائی یا حرارت ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے، چنانچہ سورج توانائی کا منبع ہے اور آہستہ آہستہ اپنی توانائی زمین کو فراہم کرتے کرتے ٹھنڈا ہو جائے گا۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

"سورج قیامت کے دن ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

حرام کا تصور

شریعت اسلامیہ سور کا گوشت اور خون (کھانا) حرام قرار دیتی ہے۔تحقیقات کے مطابق ان کے کھانے سے امراض ہیضہ، ٹائیفائیڈ اور بخار وغیرہ کا خطرہ ہوتا ہے اور دوسری طرف خون میں جسم کی تمام فاسد رطوبتیں شامل ہوتی ہیں اور نبی پاک e نے اپنی امت کو یہ دونوں چیزیں کھانے سے روکا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے مردار اور خون (پینا) اور سور کا گوشت (کھانا) حرام قرار دیا ہے۔"

بے شک اسلام کے ہر حکم میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے۔

اونٹ کی تخلیق

اونٹ کے اندر کچھ خاص خصوصیات موجود ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کیا یہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بنایا گیا۔"

سائنسی تحقیقات کے مطابق اونٹ میں درج ذیل منفرد خاصیتیں ہیں۔

۱۔ دوسرے جانور پودوں سے وٹامن لیتے ہیں اونٹ اپنے لیے خود بناتا ہے۔

۲۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز اور جسمانی ساخت جدا ہے۔

۳۔ اس کی یادداشت تیز ہے۔

۴۔ یہ بہت صابر جانور ہے۔

۵۔ وفادار اور جفاکش ہے۔

سورج اور چاند کا تیرنا

جدید تحقیقات کے مطابق سورج اور چاند دونوں گردش کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور ہم نے زمین پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے ہیں تا کہ وہ ان کے ساتھ جھک نہ جائے اور ہم نے اس میں کشادہ راہیں بنادی ہیں تا کہ وہ راستہ پا

سکیں اور وہی ہے جس نے دن رات اور چاند سورج پیدا کیے ان میں سے
ہر ایک (زمین سمیت) اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔"

چاند میں دراڑ

امریکی خلاباز چاند میں موجود دراڑ دیکھ کر حیران رہ گئے اور انہیں پتہ چلا کہ مسلمانوں کے نبی حضرت محمد ﷺ نے معجزے کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور جس کے نتیجے میں یہ دراڑ موجود ہے۔ چنانچہ اس دراڑ کا نام "عرب دراڑ" رکھا گیا۔

قرآن حکیم اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے:

"قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ پڑا۔"

زمین کے مخفی خزانے

زمین کے اندر اللہ تعالیٰ کے اپنی قدرت کاملہ سے انسانی استعمال کی چیزیں جیسے معدنیات وغیرہ خزانے کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً کوئلہ، تانبا، سونا اور ہیرے جواہرات وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے وہ
سب کچھ تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور مخفی نعمتیں پوری
کر دی ہیں۔"

مخفی مخلوق

اللہ تعالیٰ کی بعض مخلوقات مثلاً ملائکہ اور جنات وغیرہ ہمیں نظر نہیں آتے مگر انسان اپنی طبعی کثافت کی بنا پر سب کو نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کہ وہ شیطان اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

ہزاروں تحقیق گاہوں میں سائنسی آلات ان مخفی مخلوقات کی موجودگی کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ مثلاً انسانی جسم میں دو ہزار کروڑ خلیے موجود ہیں جو ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

زندگی کی ابتدا:

دور جدید کے سائنس دان متفق ہیں کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ قرآن مجید یہ حقیقت بہت پہلے بیان کر چکا ہے۔

پہاڑوں کی تعمیر پانی کی وجہ سے ہوئی تھی پانی میں سے وہ گیس بنی جو بطن زمین کے مواد کو باہر لائی تھی اور پہاڑوں کی آتش فشانی میں بھی پانی کا دخل تھا۔

ارشاد ربانی ہے:

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا۔''

آسمان کی چھت

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

''اور بنایا ہم نے آسمان کو محفوظ چھت۔''

زمین کے گرد اوزون کی تہہ موجود ہے جو سورج کو نقصان دہ شعاعوں کو روکتی ہے جونکہ یہ تہہ زمین اور اس کی مخلوقات کی حفاظت کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک محفوظ چھت کا کام دیتی ہے۔

نباتات کی تخلیق

نباتات میں نر اور مادہ موجود ہوتے ہیں۔ جو پولن کہلاتے ہیں۔ ہوائیں پولن کو اڑا کر مادہ پھول پر ڈالتی ہیں یا یہ کام بھونروں سے لیا جاتا ہے یا پانی میں موجود پودے پانی سے یہ کام لیتے ہیں چنانچہ اس عمل سے پودے کی افزائش ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

''ہم نے حاملہ کر دینے والی ہوائیں چلائیں۔''

درد کا احساس

طب کے مطابق درد کو محسوس کرنے والے سیل جلد میں موجود ہوتے ہیں اور درد کا احساس جسم میں جلد کو ہوتا ہے اسی لیے تکلیف پہنچانے کے لیے قرآن مجید میں بار بار جلد تبدیل کرنے کا کہا گیا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری آیات ماننے سے انکار کر دیا انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ خوب عذاب کا مزا چکھیں۔''

مٹی اور پانی سے انسانی تخلیق

قرآن مجید میں بار بار انسان کو مٹی اور پانی سے بنانے کا ذکر آتا ہے۔ قرآن مجید میں

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔'' (انعام:۲)

''اور ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا۔'' (الصفت:۲)

''اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر کی تخلیق کی۔'' (الفرقان:۴۵)

یہ تمام آیات قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ تخلیق انسانی میں مٹی اور پانی اہم اجزا ہیں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق انسان کا ڈھانچا خلیوں سے بنتا ہے۔ ان خلیوں کی ساخت واضح کرتی ہے کہ ان کی تخلیق میں وہ اہم عناصر شامل ہوتے ہیں جو زمین میں ہوتے ہیں۔ مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، سلیکون، پوٹاشیم کیلیشم، میگنیشیم، سوڈیم وغیرہ۔

زمین کا سکڑنا

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اطراف سے سکیڑتے چلے جا رہے ہیں۔''

ماہرین ارضیات واضح کرتے ہیں کہ زمین جب سورج سے الگ ہوئی اس وقت اس کا درجہ حرارت وہی تھا جو سورج کا تھا بعد میں یہ اوپر سے ٹھنڈی ہونے کے باعث سکڑنا شروع ہوگئی اور سکڑتی جا رہی ہے۔ جب زلزلے کے باعث اندر سے لاوا نکلتا ہے تو وہ گرم ہوتا ہے اور اس کا درجہ حرارت وہی ہوتا ہے جو سورج کا ہے۔

قیامت ضرور آئے گی

علم حرکیات حرارت کے مطابق فطرت اپنے آخری مرحلے پر پہنچنے سے ایک مرحلے سے گزرتی ہے جسے اضافی ناکارگی کہتے ہیں اور یہ ناکارگی بڑھتی جا رہی ہے اور ایک ایسا وقت آجائے گا جب مزید ارتقاء ناممکن ہوگا اور کائنات مردہ ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ ناکارگی رکتی نہیں ہے اس کا قیام وسکون نہیں ہے سوائے یہ کہ وہ چیز ختم ہو جائے۔ اس لیے قیامت اب ایک سائنسی حقیقت بن گئی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''قیامت ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔''

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا

سورہ یٰسین میں ارشاد ربانی ہے:

''کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں عجیب مضمون کیا اور وہ اپنی اصل کو بھول گیا کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کرے گا آپ جواب دے دیجئے کہ ان کو دوبارہ زندہ کرے گا جس نے اول باران کو پیدا کیا ہے اور وہ سب طرح کا پیدا کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو پانی سے زندگی بخشتے ہیں مثلاً اگر زمین میں بیج بو دیا جائے اور اس پر آبپاشی نہ کی جائے اسے پانی نہ دیا جائے تو کبھی بھی فصل نہیں اگ سکتی، مگر جب اسے پانی مل جاتا ہے تو دوبارہ سے ہری بھری ہو جاتی ہے۔ جب وہ اللہ اتنی بڑی زمین کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو انسان کو کیسے نہیں کر سکتا۔ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ ایک انسان کا جسم چھبیس پدم خلیے مشتمل ہے۔ پرانے خلیے دس سال کے عرصے میں مر جاتے ہیں اور نئے پیدا ہو جاتے ہیں یہ کا اندر ہی ہوتا رہتا ہے جو شخص سو برس زندہ رہا وہ دس بار مر کر زندہ ہوا چنانچہ وہی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ فرعون کی لاش چالیس سے زائد صدیاں ... نے کے بعد بھی بہت اچھی حالت میں موجود تھی۔ اس میں کوئی سڑاند پیدا نہیں ہوئی چہرے ... ہیبت اور رعب و جلال دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا فرعون ابھی آپریشن ٹیبل سے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسے عبرت کے طور پر بچائے رکھنے کا فرمایا تھا چنانچہ یہ حقیقتیں پڑھ کر بھلا کون قرآن پاک کے سچی اور الہامی کتاب ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کا اعجاز ایک ذوقی اور وجدانی کیفیت ہے جو طبیعت کو محسوس تو ہوتی ہے لیکن زبان سے بیان نہیں ہو سکتی جس طرح ذائقہ ... زبان معلوم تو کر لیتی ہے، لیکن الفاظ سے اس کا اظہار ممکن نہیں۔ جاذب اثر کتاب ہے۔ جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یا الٰہی تو اپنی اس پیاری کتاب کی محبت ہمیں اس قدر عطا فرما کہ ہماری زندگیوں کا گوشہ گوشہ اس کے مطابق ہو جائے اور یہ مکمل طور پر ہمارے لیے ضابطہ حیات بن جائے بلاشبہ اسی میں کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ (آمین)

قرآن وحدیث کے سائنسی اعجازات

ریاض الحسن نوری

اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو وقت اور ضرورت کی مناسبت سے معجزات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا شہرہ تھا، اس لیے انہیں اسی مناسبت سے جادوگروں کو نیچا دکھانے کے لیے معجزات دیئے گئے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

یوں تو نبی ﷺ سے بھی وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے معجزات ظہور پذیر ہوتے ... سیرت کی کتب میں مرقوم ہیں۔ مگر آخری نبی ہونے کی حیثیت سے آپ ... لیے ایک ... ضروری تھا جس کے ثمرات قیامت تک وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے معجزات ظاہر ہو ... ان کا ہم تفصیل سے ذکر کریں گے لیکن کچھ مثالیں ہم مختصراً اپنے موقف کے ثبوت میں پیش ... ہیں۔ ہمارے پاس امام ابن تیمیہ کا ۳۷ جلدوں والا مجموع فتاوی ہے اسی ایڈیشن کے حوالے ... ہم پیش کریں گے۔

آسمان اور زمین کے گول ہونے کا ثبوت

امام ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا کہ ہمیں اس سوال کا صحیح جواب بتائیں کہ آسمان اور زمین گول ہیں یا نہیں؟

"مسلمان علماء کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ آسمان گول ہیں...... علماء اس پر کتاب و سنت اور صحابہ تابعین کے اقوال سے دلائل سماعیہ بیان کرتے ہیں......"

پھر دوسرے مقام پر مزید لکھتے ہیں:

"یعنی اس طرح اس بات پر بھی اجماع ہے کہ زمین اپنی تمام حرکات کے ساتھ خشکی اور سمندروں پر مشتمل ایک کرہ (گیند) کے مانند گول شکل کی ہے......" (مجموع فتاوی:۲۵)

اہم بات یہ ہے کہ یہاں امام صاحب نے زمین کی مختلف حرکات کا ذکر کیا ہے جو وہ خشکی اور تری کو ساتھ لیے کر رہی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

”(اہل علم کا) اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین گیند کی مانند (گول شکل میں) ہے اور وہ پانی پر ہے جس نے اس کا زیادہ حصہ گھیر رکھا ہے جب کہ اس کا چھٹا یا اس سے کچھ زیادہ حصہ خشک ہے۔“ (مجموع فتاویٰ: ۵:۱۵)

۲۱۴ھ میں مامون رشید کے زمانے میں مسلمانوں نے زمین کا صحیح محیط معلوم کیا اور یورپ کے سائنس دان کولمبس کے دور تک محیط کے صحیح علم سے محروم تھے اور ان کا علم غلط تھا۔

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مامون رشید کے دور میں دو مقامات سے زمین کا محیط ناپا گیا جو تقریباً ۲۴ ہزار میل دریافت ہوا۔ (ابن خلکان: وفیات الاعیان: ۴: ۲۲۸، ۲۲۹)

ابن خلکان نے ناپنے کا تفصیلی طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

یاد رہے کہ کولمبس جب امریکہ پہنچا تو وہ یہ سمجھا کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی یورپ کے علماء نے زمین کا محیط مقرر کرنے میں ۴۰ فی صد غلطی کی تھی یعنی ان کے نزدیک زمین کا محیط ۴۰ فیصد کم تھا۔ اس وجہ سے کولمبس کو غلطی لگی کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے **Richard Churchill: The _Earth Hamylin** صفحہ ۱۰۳)

”دوران خون“ ایک مشہور حدیث کا سائنسی اعجاز:

لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی کتب میں اور میڈیکل کے دیگر کالجوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے کہ دوران خون کی دریافت ہاروے (Harvey) نے کی۔ میں نے لاہور ٹی وی سے بھی دو مرتبہ یہی بات سنی کہ دوران خون کا علم ہاروے نے دریافت کیا۔ مگر میڈیکل کالج میں اور ٹی وی پر یہ قطعاً نہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ حقیقت ”خون تمام بدن میں گردش کرتا ہے“ ہمارے نبی ﷺ نے ۱۴۰۰ سال پہلے اپنی امت کو ایک مشہور حدیث میں بتا دی تھی۔ یہ حدیث اتنی مشہور ہے کہ میں اپنے گھر کے بزرگوں سے بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ ہمارے اکثر قارئین بھی یقیناً اس حدیث سے واقف ہوں گے۔

”یعنی شیطان انسان کے جسم میں ایسے ہی گردش کرتا ہے جیسے بدن میں خون گردش کرتا ہے۔“ (مسند احمد: ۳/ ۱۵۶، بخاری وغیرہ)

ظاہر ہے کہ عام صحابہ کرام بھی اس حقیقت سے واقف تھے کہ خون جسم میں گردش کرتا

ہے، کوئی جامد چیز نہیں۔ جبھی تو وہ اس بات پر حیران نہیں ہوئے۔

زمین کے عجائبات پر غور کا قرآنی حکم:

زمین (جیالوجی وغیرہ) سے متعلق مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیں:

وَفِي الْأَرْضِ آيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (الذاریات:۲۰)

"تفسیر جلالین میں یہ آیت مختصر تشریح سے یوں درج ہے:

(وَفِي الْأَرْضِ) مِنَ الْجِبَالِ وَالْأَرْضِ وَالْبِحَارِ وَالْأَشْجَارِ وَالثِّمَارِ وَالنَّبَاتَاتِ وَغَيْرِهَا (آيٰتٌ) دَلَالَاتٌ عَلٰى قُدْرَةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى وَوَحْدَانِيَّتِهٖ (لِلْمُوْقِنِيْنَ)"

"یعنی زمین میں پہاڑوں کو دیکھیے خود زمین کو دیکھیں (اس کی گولائی کی صفت) سمندروں، درختوں، پھلوں اور دیگر مختلف قسم کی نباتات وغیرہ اللہ تعالیٰ کی کروڑوں قسم کی مخلوقات کو دیکھیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت مسحور کن اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔"

مفسر نے مختصراً اشارہ کیا ہے لیکن اشارے پر ہی کئی مجلدات تیار ہو سکتی ہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد" کہ اگر سمندر سیاہی بن جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں چاہے اور بہت سے سمندروں کو سیاہی کی طرح استعمال کرتے چلے جائیں" حق ہے۔

شہد کی مکھی سے لے کر جراثیم کو دیکھیے اللہ کی قدرت اور اس کی ربوبیت عالم کس طرح عیاں ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی کے لیے (وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ) آیت آئی ہے سائنس دانوں نے شہد کی مکھی کے کمالات پر مجلدات تیار کی ہیں جو بڑی حیران کن ہیں۔ انشاء اللہ اپنے موقع پر اس آیت کا اعجاز بیان ہوگا۔ جراثیم سے متعلق عام انسان صرف یہ جانتا ہے کہ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سرکہ وغیرہ اور دہی بھی جراثیم بناتے ہیں جو ہمارے کھانے کو ہضم کرنے میں ہماری بہت زیادہ معاونت کرتے ہیں۔ ایک جدید سائنس دان لکھتا ہے۔

The Humblest bacterium can manufacture in the course of its brief rcistance, more organic compounds than cna all the words chemsts combined. (Robert S. De Ropp: Durgs and the mind, energreen cat booh p. 209)

یعنی "ایک کمتر جرثومہ اپنی قلیل زندگی میں اتنے کثیر قسم کے پیچیدہ

مرکبات بناتا ہے جتنے کہ تمام دنیا کے سائنس دان (کیمسٹ) مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔"

جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس گئے تو اس نے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ کوزے میں دریا کو بند کر دینے کے مترادف ہے۔ سنئے:

"ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو (ایک خاص ہیئت پر) تخلیق کیا اور پھر اس کو ہدایت دی (کہ وہ کیسے زندگی کو عمدگی سے گزارے)۔" (سورۃ طٰہ)

اب دیکھیے کہ شہد کی مکھی کو کیسے وحی کی؟ چیونٹیوں کو کیسے راہ دکھائی۔ جدید دور کے مشہور ترین ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ کیڑے مکوڑوں کا نظم دیکھ کر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ کیڑے انسانوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ (ژنگ: ماڈرن میں ان سرچ آف اے سول: ۲۱۴)

روسی سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق شہد کی مکھیوں، بھڑوں اور مکھیوں میں ایک قدرتی قطب نما ہوتا ہے جس سے وہ اپنا راستہ تلاش کرتی ہیں۔

انسان اپنے شہروں کو ایئر کنڈیشنڈ نہیں کر سکا۔ لیکن شہد کی مکھی کا چھتہ ایئر کنڈیشنڈ ہوتا ہے۔

شہد کی مکھیاں وغیرہ الٹراوائلٹ روشنی کی مدد سے بادلوں میں سے بھی دیکھ سکتی ہیں۔

انسان کی پیدائش سے لاکھوں سال قبل سے چیونٹیاں اپنی خوراک کا اینٹی بایوٹکس تحفظ کر رہی ہیں۔

پنسلین کا علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی رحمت سے حادثاتی طور پر عطا کر دیا اور آج بھی اینٹی بائیوٹک ادویات ساری دنیا میں مریضوں کی شفا کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ (فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ)

اللہ ہی نے بعض جراثیم کو دہی بنانے پر لگا دیا اور بعض کو سرکہ بنانے پر لگا دیا۔ کچھ کو انسان کے معدہ میں غذا کو ہضم کرنے پر مامور کر دیا وعلی ھذا القیاس، اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے۔ اب دیکھئے انسان کا معدہ گوشت کا بنا ہوا ہے۔ اس میں گوشت ہضم ہوتا ہے۔ اوجھڑی بھی ہضم ہو جاتی ہے مگر خود معدہ کو آنچ تک نہیں آتی۔ (فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ) "تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟"

انسان اور جانور آکسیجن کو سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں لے جاتے ہیں اور اس سے خون صاف ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ دونوں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس نکالتے ہیں اگر یہی سلسلہ جاری رہتا تو فضا سے آکسیجن ختم ہو جاتی اور سب جاندار مر جاتے۔ پس اللہ نے نباتات کو مامور کر

دیا کہ وہ سورج کی روشنی سے مدد لے کر آکسیجن یوں بنائیں کہ فضا میں آکسیجن کی کمی واقع نہ ہو اور جانداروں کو آکسیجن کی کمی کی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ)

اس کا سوچ کر ہمیں فوراً فرعون کو موسیٰ کا جواب یاد آ جاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ رب العالمین نے نباتات کو آکسیجن بنانے کے فرض پر لگا دیا جب کہ جانور کاربن ڈائی آکسائیڈ بناتے ہیں جو نباتات استعمال کرتی ہیں۔ یوں نباتات اور حیوانات ایک دوسرے سے تعاون پر لگے ہیں اور دونوں اس تعاون سے پھل پھول رہے ہیں۔ (اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى)

پھر اللہ تعالیٰ ہوا چلا کر فضا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا وہ توازن قائم رکھتا ہے جو اس کی مخلوقات کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ ہوا چل کر صرف یہی کام نہیں کرتی بلکہ نر پھولوں کے ذرات مادہ پھولوں تک پہنچاتی ہے۔ (مثلاً کھجور کے درخت میں) اس کا ذکر قرآن میں (وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ) میں کیا ہے۔

کیچوے کا حیرت انگیز کردار:

کیچوے کو عام لوگ ایک بیکار سا کیڑا سمجھتے ہیں۔ مگر یہ کیڑا زمین میں گہری نالیاں بنا کر زمین کو قابل زراعت بنانے کا ایسا عظیم کردار ادا کرتا ہے کہ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر کیچوا نہ ہوتا تو کوئی نباتات پیدا ہی نہ ہوتی۔ (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ)

سائنس دان کہتے ہیں کہ ایک ایکڑ زمین میں مختلف قسم کے کئی بلین حشرات الارض ہوتے ہیں جو انسان کی خدمت کرتے ہیں۔ صرف کیچوے ہی ایک ایکڑ میں ایک ملین کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ محض بیکار مٹی جیسی کہیں کوئی چیز نہیں ہے۔ چونٹیوں کی خدمت اپنی جگہ ایک بہت بڑا سائنسی عجوبہ ہے جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ حدیث شریف میں چیونٹیوں، شہد کی مکھیوں، ھد ھد اور صُرد کو مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ (مسند احمد: ۱/۳۶۹)

یاد رہے کہ صُرد، چھوٹے پرندوں کا شکار کرنے والا ایک جانور ہے جس کو اردو میں سبز ھد ھد کہتے ہیں۔

قرآن کا پہاڑوں کو لنگر اور اوتاد کہنے کا سائنسی اعجاز:

رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام سے اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ۱۹۸۷ء میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک امریکی سائنس دان نے ان قرآنی آیات کا ترجمہ سنایا جن میں پہاڑوں کو لنگر اور میخیں کہا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ ۱۰۰ سال قبل تک سائنس دان یہی سمجھتے تھے کہ

پہاڑ ایسے ہی ٹیلے ہیں جیسے ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں۔ (یعنی جیسے مصنوعی پہاڑوں شملہ پہاڑی ہے۔ قدرتی طور پر پتھروں اور مٹی کا ڈھیر لگ جاتا ہے) مگر اب جدید تحقیقات سے علم ہوا ہے کہ پہاڑ اگر ایک میل اونچا ہوتا ہے تو اس کی جڑ چالیس پچاس میل گہری ہوتی ہیں۔ جیسے میخ کا تھوڑا حصہ اوپر نظر آتا ہے جب کہ بڑا حصہ نیچے ہوتا ہے، یہی حال لنگر کا ہے اس کے صحیح ادراک اور آیت کے اعجاز کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جو ان شاء اللہ آئندہ بیان ہوگی۔ الختصر امریکی سائنس دان نے ان قرآنی آیات کو معجزہ قرار دیا کیونکہ ان میں وہ حقائق بیان کیے گئے ہیں جو سائنس دانوں نے مشکل تحقیقات کے بعد دریافت کیے ہیں۔ ان حقائق کو ۱۴۰۰ سال پہلے بیان کرنا واقعی ایک عظیم سائنسی معجزہ ہے۔

زمین کا گول ہونا:

یاد رہے کہ کشش ثقل کا علم اسلامی دنیا میں یورپ سے پہلے دریافت ہوا تھا۔ ہم امام ابن تیمیہ کے حوالے سے زمین کے گول ہونے اور حرکت کرنے کا ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھیے کہ کشش کی وجہ سے گول زمین پر انسان اور اللہ تعالیٰ کی دیگر جان دار مخلوقات گھومتی پھرتی ہیں، آرام سے رہتی ہے۔ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک متحرک گول زمین پر رہ رہے ہیں۔ ان کو زمین ساکن اور چپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے گول ہونے یا متحرک رہنے سے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور زمین کو ہم ہی نے فرش بنا لیا پس کیا عمدہ و آرام دہ فرش بنانے والے ہیں۔"

انسانوں کے لیے کھربوں ڈالر کے مفت عطیات

یوں تو ہوا کی آکسیجن ہم کو مفت ملتی ہے اور پانی بھی۔ لیکن سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں کچھ مفت نہیں ملتا۔ نباتات اور پھلوں پھولوں میں جو اللہ کا مقرر کردہ لقاح کا عمل ہے جو ہواؤں اور کیڑوں کے ذریعے ہوتا ہے، اس کی قیمت کھربوں ڈالر سے بڑھ کر ہے۔

"اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ تم شمار نہیں کر سکتے۔"

فقہی مسائل میں جدید سائنسی تحقیقات کی اہمیت

وفاقی شرعی عدالت میں گھوڑوں کی ریس کا مقدمہ پیش ہوا۔ ریس کلب والوں کی

طرف سے مشہور وکیل اے کے بروہی پیش ہوئے۔اس سلسلے میں سپریم کورٹ شریعت بنچ کے ایک موجود جج بھی ان کی معاونت کر رہے تھے، مجھ سے ایک مشہور وکیل اور دیگر کئی لوگوں نے کہا کہ آپ اس مقدمے میں ضرور حصہ لیں ورنہ ہم یہ مقدمہ ہار جائیں گے۔ بہر حال خاکسار نے اس مقدمے میں قرآن وسنت سے بھی کثیر دلائل دیے مگر جدید سائنسی تحقیقات کے بھی دلائل دیے۔ شریعت کورٹ کے چیف جسٹس محترم گل محمد صاحب نے سائنسی دلائل کو بھی جو قمار کے خلاف تھے بالخصوص اپنے فیصلہ میں درج کیا۔ یوں اے کے بروہی اور سپریم کورٹ شریعت بنچ کے مذکور جج یہ مقدمہ ہار گئے اور اللہ تعالیٰ نے خاکسار کو ان پر فتح دی۔ والحمد اللہ علی ذالک۔

جدید دور میں فیملی لاز کو بھی اسلام کے مطابق ڈھالنے میں بھی جدید سائنسی تحقیقات کی ضرورت ہے۔

تخلیق کائنات کا اسلامی تصور

ڈاکٹر وکیل جبران

اسلام نے کائنات اور کائنات کی تخلیق کا جو تصور پیش کیا ہے وہ انسانی قلوب کیلئے نہایت تسلی بخش اور سائنسی نکتہ نظر سے تمام ادیان کے تصورات سے زیادہ قابل تسلیم اور معیاری ہے۔ اسلام نے کائنات، تخلیق کائنات، مقصد تخلیق کائنات، اجزائے کائنات، تخلیق آدم، افزائش امور کائنات، حیات، طرز حیات اور انجام کائنات وغیرہ کے جملہ پہلوؤں کو اس انداز سے اجاگر کیا کہ قلوب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید کے مطابق پوری کائنات چھ (ایک آیت کے مطابق) یوم کے عرصہ میں تخلیق ہوئی۔ یہاں "یوم" سے مراد ایک دن نہیں بلکہ ایک عہد ہے۔ یہ عہد ایک مختصر عرصہ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور ایک طویل عرصہ بھی۔ بعضوں نے "یوم" کی مدت ایک ہزار سال متعین کی ہے۔ ایک آیت میں یوم کی مقدار ایک ہزار سال بتائی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> "اللہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے' ایک ایسا دن جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔"
>
> سورہ معارج کی ایک آیت میں یوم کی مدت پچاس ہزار سال شمار کی گئی ہے۔

آیئے ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق چھ دن کے عرصہ میں ہوئی۔

ا۔ سورہ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

بے شک وہی تمہارا رب ہے، اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں

تخلیق کیا، پھر اس کو عرش پر قائم کیا۔

۲۔ سورہ ہود میں فرمایا گیا ہے:

وہ ذات باری تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، اس وقت کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزمایا جائے کہ تم میں سے اچھے اعمال کرنے والا کون ہے۔

سورہ الفرقان کی ایک آیت میں آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے کی مدت سات یوم متعین فرمائی گئی ہے۔

بے شک اسی ذات باری تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو سات دنوں میں پیدا فرمایا، پھر ان کو عرش پر قائم کر دیا۔

اللہ نے کیا کچھ بنایا؟

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات، یعنی دنیا میں جو بھی چیز موجود ہے بنائی۔ قرآن مجید میں بعض خصوصی اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً زمین، نباتات، جمادات، معدنیات، حیوانات، افلاک، سورج، چاند، ستارے، سیارے، عرش، لوح، کرسی، فرشتے، جن، ہر قسم کی جاندار مخلوق، انسان کیلئے طرح طرح کی نعمتیں، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ سبھی کچھ اللہ کی تخلیق ہے۔ چند اشیاء کا تذکرہ ملاحظہ ہو:

۱۔ سورہ الرحمان میں فرمایا گیا ہے:

اور آسمان ہے، جس کو اس نے بلند کھڑا کر دیا اور اس کیلئے ایک میزان بنا دیا۔

۲۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے۔

۳۔ اور سورج جو اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔

۴۔ اور وہی ذات باری تعالیٰ ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی نازل کیا۔

۵۔ اور زمین پر جتنے بھی جاندار چلتے پھرتے ہیں اور جتنے بھی پرندے اڑتے پھرتے ہیں۔

۶۔ اور ذات باری تعالیٰ ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند پیدا کئے اور وہ سب کے سب اپنے حلقوں پر تیر رہے ہیں۔

۷۔ اور اللہ نے تمہارے لئے سمندر مسخر کر دیے۔

تخلیق آدم

اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر، جنگلات وغیرہ بنانے کے بعد ان کے تصرف کیلئے کسی ایسی ذات کا مادی شکل میں ہونا ضروری جانا جس کے ذریعے اس کائنات میں رونق لگ جائے۔ اسلامی روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش بریں پر متمکن تھا اور فرشتے اس کے حضور سجدہ ریز رہتے تھے۔ ان کے پاس عجز و نیاز اور رکوع و سجود کے علاوہ کوئی اور صلاحیت موجود نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوق سے ہٹ کر ایک ایسی مخلوق تشکیل دینے کا ارادہ کیا جس میں تضادات موجود ہوں۔ اللہ نے اس میں نفس ناطقہ کے ساتھ ساتھ قوت غضبی بھی بھر دی۔ اسے وقت شہوی سے نوازا تو اسے قوت فیصلہ و اعتدال سے بھی مزین کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی مخلوق (انسان) کی تشکیل کا ذکر فرشتوں سے کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارادے سے کچھ مضمحل ہوئے۔ اس قصہ کو سورہ البقرہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں، فرشتوں کہا کیا تو اسے نائب بنائے گا جو زمین پر دنگا فساد اور خونریزی کرے گا، حالانکہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری ستائش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا میں ان باتوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

ملائکہ کو جب یہ خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق کو جس میں مفسد اور خونریز تک ہوں گے ہم ایسے مطیع و فرمانبرداروں کے ہوتے آدم کو خلیفہ بنایا جائے گا تو اس کی وجہ کیا ہوگی۔ ملائکہ نے بطریق استفادہ یہ سوال کیا کہ کیا ایسے آدم کو خلیفہ بنایا جائے گا جو زمین میں فساد پھیلا گئے گا اور خونریزی کرے گا۔

فرشتوں کو سردست بالاجمال یہ جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے پیدا کرنے میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے۔

> ”اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے اور پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت

کے اور نفع ونقصان کے تعلیم فرما دیا اور علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القاء کر دیا۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امور مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو، سچے ہو تو ان چیزوں کے نام واحوال بتاؤ فرشتوں نے عرض کی:

وہ بولے، پاک ہے تو، ہم کو معلوم نہیں، مگر جتنا تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔

فرشتوں نے اپنے عجز وانکسار کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدوں اس علم کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدر قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم وحکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

اب اللہ تعالیٰ نے آدم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

فرمایا اے آدم فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دے، اس نے ان تمام چیزوں کے نام بتا دیئے، فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے کہا کہ فرشتوں کو تمام اشیائے عالم کی چیزوں کے نام بتا دو تو حضرت آدم نے فر فر سب امور ملائکہ کو بتا دیئے۔ یہ سن کر ملائکہ دنگ رہ گئے اور حضرت آدم کے احاطہ علمی پر عش عش کر اٹھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ کہو ہم نہ کہتے تھے کہ ہم جملہ مخفی امور آسمان وزمین کے جاننے والے ہیں اور تمہارے دل میں جو باتیں مکنون ہیں وہ بھی سب ہم کو معلوم ہیں۔

اب اس سے اگلا قصہ سنئے البقرہ ہی میں فرمایا گیا ہے:

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں گر گئے مگر شیطان نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

جب حضرت آدم کا خلیفہ ہونا مسلم ہو چکا تو فرشتوں کو اور ان کے ساتھ جنات کو حکم ہوا کہ حضرت آدم کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں۔ جیسا کہ سلاطین اپنا اول ولی عہد مقرر کرتے ہیں، پھر ارکان دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم کرتے ہیں تا کہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ سب نے سجدہ مذکور ادا کیا، سوائے ابلیس کہ وہ جنات میں سے تھا اور ملائکہ کے ساتھ کمال اختلاط رکھتا تھا۔ پس ابلیس اپنے تکبر کی وجہ سے کافر ہو گیا اور انسان کا ابدی دشمن بن گیا۔

آدم کس چیز سے بنا؟

آیئے اب ذرا دیکھتے ہیں کہ آدم کس چیز سے بنایا گیا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

ہم نے انسان کو مٹھی بھر مٹی سے بنایا پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا، جو کہ ایک محفوظ مقام (رحم مادر) میں قرار رہا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جو جما ہوا خون کا لوتھڑ بنایا، پھر ہم نے اس خون کی بوٹی کی شکل دیدی، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈی بنا دیا، پھر ہم نے اس ہڈی پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اس کو ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا، اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات بے شک بہترین تخلیق کار ہے۔

سورہ الرحمان میں فرمایا گیا ہے:

اس نے انسان کو ٹھکیرے کی طرح کھنکناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

سورہ الروم میں فرمایا گیا ہے:

یہ اس کی نشانیوں میں سے ایک ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

سورہ المرسلات میں فرمایا گیا ہے:

کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی سے نہیں پیدا کیا۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

اس کو ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا۔

سورہ الفرقان میں مذکور ہے:

اور وہ ذات باری تعالیٰ ہے، جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا۔

حوا اور اولاد آدم

آدم کو مٹی سے بنایا گیا پھر اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ پھر آدم کی نسل بڑھانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو بنایا اور اسے ایسی صلاحیتوں سے بھر دیا جس کے ذریعے اس نے آدم کی زوجیت قبول کی اور جنسی صورت میں افزائش نسل کیلئے ممدومعاون ثابت ہوئی۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

اور تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اسی سے اس کا جوڑا بنایا

قرآن کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو مٹی سے بنایا اور پھر اس کی زوجیت کیلئے حوا کو پیدا کیا، جو آدم ہی کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ آدم اور حوا کے جنسی ملاپ (نطفہ) سے نسل انسانی بڑھی اور پھیلی پھولی۔

کائنات کی وحدت سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا قرآنی استشہاد

وجود باری تعالیٰ

وجود باری تعالیٰ کا مسئلہ ابتداء ہی سے انسان کیلئے ایک مسئلہ رہا ہے۔ اس ضمن میں فلسفیوں اور منطقیوں نے جو دلائل وضع کیے ہیں ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کوئی اللہ کو قدرت قرار دیتا ہے اور عالم کو حادثہ تصور کرتا ہے اور کوئی اس کے برعکس دلائل دیتا ہے۔ بعض صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ جو کچھ ہے وہ مادہ کی پیداوار ہے اور بعض اس کائنات کو خالق کی باقاعدہ تخلیق قرار دیتے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر عصر حاضر تک دنیا کے کسی خطہ پر، کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ وہاں کے لوگ اپنے لیے کسی خالق کا اقرار نہ کرتے ہوں۔ تمام انسان خواہ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ۔ یہ ضرور جانتے ہیں کہ ان کا ایک خالق اور پروردگار ہے اور جب وہ دنیا کے اسباب و وسائل سے مجبور اور مضطرب ہو جاتے ہیں تو اس وقت اپنے خالق کو پکارتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کو فطری تسلیم کیا جاتا ہے، جو لوگوں کی فطرت اور جلبت میں مرکوز ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

> ”اپنے چہرہ کو اللہ کی عبادت کیلئے سیدھا کر، ایک طرف ہو کر اور اللہ کی اس فطرت کو لازم پکڑ جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی ناممکن ہے، یہی دین جو فطرت کے مطابق ہے، ٹھیک دین ہے۔“

چنانچہ یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وجود باری تعالیٰ کا اقرار بدیہی اور فطری امر ہے اور تمام بنی نوع انسان کا اجماعی مسلک ہے۔ اسی وجہ سے تمام انبیائے کرام کا نصب العین ہمیشہ توحید کی دعوت رہا ہے۔

قرآن مجید توحید میں شک کرنے والوں کے سلسلے میں کہتا ہے:

"اس کے رسولوں نے کہا کیا تم کو اللہ کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے کہ جو آسمانوں اور زمینوں کا بنانے والا ہے۔"

خدا کی ہستی اور وحدانیت تو ایسی چیز نہیں جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش ہو۔ انسانی فطرت خدا کے وجود پر گواہ ہے۔ علویات وسفلیات کا عجیب وغریب نظام یہ شہادت دیتا ہے کہ اس مشین کے پرزوں کے وجود کے سانچہ میں ڈھالنے والا، پھر انہیں جوڑ کر نہایت محکم ومنظم طریقے سے چلانے والا بڑا زبردست ہاتھ ہونا چاہیے۔ جو کامل حکمت واختیار سے عالم کی مشین کو قابو میں کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے کٹر سے کٹر مشرک کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں اس بات کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا کہ بڑا خدا، جس نے آسمان وزمین وغیرہ پیدا کیے وہی ہو سکتا ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں سے اونچے مقام پر فائز ہو۔ انبیاء کی تعلیم یہ ہے کہ جب انسانی فطرت نے ایک علیم وحکیم، قادر وتوانا منبع الکمالات خدا کا سراغ پالیا پھر اوہام وظنون کی دلدل میں پھنس کر اس سادہ فطری عقیدہ، کو کھلونا کیوں بنایا جاتا ہے۔ وجدان شہادت دیتا ہے کہ ایک قادر مطلق اور عالم الکل خدا کی موجودگی میں کسی پتھر یا درخت یا انسانی تصویر یا سیارہ فلکی یا اور کسی مخلوق کی الوہیت میں شریک کرنا فطرت صحیحہ کی آواز دبانے یا بگاڑنے کا مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اہل کائنات کو اپنی طرف بلانے کی دعوت دی ہے۔ سورہ ابراہیم میں فرمایا گیا ہے:

وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دی تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنی طرف بلاتا ہے تاکہ وہ توحید کے راستہ پر چل کر اس کا قرب حاصل کریں۔ اگر وہ اپنی مشرکانہ اور کافرانہ حرکتوں سے باز آ کر ایمان وایقان کا طریق اختیار کر لیں تو ان کے ایمان لانے سے پیشتر کے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں۔

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

اور تم سب کا معبود ایک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

یعنی تمام بنی نوع انسان کا معبود حقیقی ایک ہے۔ اس میں تعداد کا احتمال نہیں۔ اگر دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ اس نفع کی توقع باندھی جاتی اور یہ استادی، پیری یا بادشاہی کا نظام نہیں کہ ایک جگہ موافقت نہ آئی تو دوسری جگہ چلے گئے۔ یہ تو معبودی اور خدائی ہے۔ نہ اس کے سوا کسی کو

معبود بنایا جا سکتا ہے اور نہ کسی سے اس کے علاوہ خیر کی توقع کی جا سکتی ہے۔

جب مذکورہ بالا آیت (والھکم الٰہ) نازل ہوئی تو مشرکین نے تعجب کیا کہ تمام عالم کا معبود اور سب کام بنانے والا ایک کیسے ہو سکتا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

یعنی آسمان کے اس قدر وسیع اور اونچا اور بے ستون پیدا کرنے میں اور زمین کے اتنی وسیع اور مضبوط پیدا کرنے اور اس کے پانی پر پھیلانے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے اور ان کے گھٹانے اور بڑھانے میں اور کشتیوں کے دریا میں چلنے میں اور آسمان سے پانی برسانے اور اس سے زمین کو سرسبز و تازہ کرنے میں اور جملہ حیوانات میں اس سے توالد و تناسل نشوونما ہونے میں، اور جہات مختلفہ سے ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں متعلق کرنے میں دلائل عظیمہ اور کثیرہ ہیں۔ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت و حکمت اور رحمت پر ان کیلئے صاحب عقل و فکر ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں "لا الہ الا ھو" میں توحید ذات کا اور "الرحمٰن الرحیم" میں توحید صفات اور "ان فی خلق" میں توحید افعال کا ثبوت دیا گیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں وہ آیت جو "آیت الکرسی" کہلاتی ہے توحید و صفات باری تعالیٰ بیان کرتی ہے۔

اس آیت میں توحید ذات اور عظمت صفات باری تعالیٰ بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ:

"حق تعالیٰ ہمیشہ سے موجود ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمام مخلوقات کا موجود وہی ہے، وہ تمام نقصان اور ہر طرح کے تبدیل اور فتور سے منزہ ہے، سب چیزوں کا مالک ہے، تمام چیزوں کا کامل علم اور سب پر پوری قدرت اور اعلیٰ درجہ کی عظمت اس کو حاصل ہے، کسی کو نہ اتنا استحقاق، نہ اتنی مجال کہ بغیر اس کے حکم کے کوئی کسی کی سفارش بھی اس سے کر سکے، کوئی امر ایسا نہیں جس کے کرنے میں اس کو دشواری اور گرانی ہو سکے، وہ تمام چیزوں اور سب کی عقلوں سے برتر ہے، اس کے مقابلہ میں سب حقیر ہیں۔

توحید کے ضمن میں سورہ البقر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مکالمہ بیان کیا گیا ہے:

> کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے رب کی بابت ابراہیم سے جھگڑا کیا۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم اور نمرود کا مکالمہ بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے نمرود اپنے آپ کو سلطنت کے غرور سے سجدہ کرواتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرود کے سامنے آئے تو انہوں نے اسے سجدہ نہ کیا۔ نمرود نے دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمرود نے کہا: رب تو میں ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں حاکم کو رب نہیں کہتا۔ رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ نمرود نے دو قیدی منگوا کر بے قصور کو مار ڈالا اور قصور وار کو چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ دیکھا میں جس کو چاہوں مارتا ہوں اور جسے چاہوں نہیں مارتا۔ حضرت ابراہیم نے آفتاب کی دلیل پیش فرماتے ہوئے کہا کہ میرا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھلا۔ اس پر نمرود لا جواب ہو گیا۔

سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

> اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے (بھی گواہی دی) وہی انصاف کا حاکم ہے۔

اللہ تعالیٰ خود اپنی تمام کتابوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا ہے اور اس کی یہ فعلی کتاب (یعنی کائنات) کا ایک ایک ورق بلکہ ایک ایک نقطہ یہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اہل علم ہر زمانہ میں توحید کی شہادت دیتے رہے ہیں اور مشرکین بھی یہ سمجھتے ہیں کہ علمی اصول کبھی مشرکانہ عقائد کی تردید نہیں کر سکتے۔

کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگار عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظام ربوبیت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

کیا انسان کا وجدان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آسکتا ہے اور کوئی زندگی، کوئی ادارہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو، مگر کوئی

پروردگار اور کوئی کارساز موجود نہ ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کارسازی موجود ہو اور کوئی کارساز موجود نہ ہو۔ حکمت موجود ہو اور کوئی حکیم موجود نہ ہو۔ انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی کہ مخلوق تو موجود ہو لیکن اس کا خالق موجود نہ ہو۔ اس کا وجدان پکار پکار کر کہتا ہے کہ اس کارخانہ حیات و کائنات کے پیچھے کسی صانع و خالق کا وجود لازم ہے۔ یہ امر انسان کے وجدانی ادعان کے خلاف ہے کہ وہ کائنات اور نظام ربوبیت کا مطالعہ کرے اور ایک رب العالمین ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اٹھے۔ ایک انسانی غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کونسا اعتقاد پیدا ہوتا ہے، کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار اور خالق ہستی موجود ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

قرآن بار بار دعوت فکر دیتا ہے کہ دیکھو، قدرت کارفرما ہے۔ آیئے اس ضمن میں چند قرآنی آیات پر غور کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(۱) بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشوں کے خلاف) حجت ہے۔ اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر تراش لیا کرے۔

(۲) وہ کون ہے جو آسمان اور زمین سے تمہیں روزی بخشتا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور پھر وہ کونسی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانہ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ پس وہ بول اٹھیں گے اللہ ہے، اچھا تم ان سے کہو پھر یہ غفلت و سرکشی کیوں ہے۔

(۳) وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا، پھر اس آبپاشی سے خوشنما باغ اگائے حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے، کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ مگر یہ لوگ وہ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے۔

(۴) اچھا تو بتلاؤ کہ وہ کون ہے جس نے زمین کو (زندگی اور معیشت) کا ٹھکانہ بنادیا، اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اس کی درستگی کیلئے پہاڑ بلند کر دیئے، وہ دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں) ایسی دیوار حائل کر دی کہ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے، افسوس ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

(۵) وہ کون ہے جو بے قراردلوں کی پکار سنتا ہے، جب وہ اسے پکارتے ہیں اور ان کا دکھ درد ٹال دیتا ہے اور وہ کہ اس نے تمھیں زمین کا جانشین بنایا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔

(۶) وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے، اور پھر اسے دہراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہ ہائے رزق سے تمھیں روزی دیتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے۔ (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو اور تمہارے پاس (انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف) کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔

(۷) اے افرادِ نسل انسانی اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمھیں فیض یاب کیا ہے ان پر غور کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمھیں زمین و آسمان کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں کوئی معبود نہیں ہے، مگر اسی کی ایک ذات۔

(۸) وہی ہے جو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے اور جسے چاہے بے شمار رزق دے۔

(۹) یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) اور زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے، ہاں وہی تمہارا خدا ہے پھر تم اس سے روگردانی کر کے کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو۔

(۱۰) وہی صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے، وہی ہے جس نے رات کو راحت و

سکون کا ذریعہ بنایا ہے کہ چاند اور سورج کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم کردی کہ حساب کا معیار بن گئی، یہ اس عزیز وعلیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔

(۱۱) وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے پیدا کر دیئے تاکہ خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی حاصل کرو، بلاشبہ ان لوگوں کیلئے جو جاننے والے ہیں ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کردی ہیں۔

(۱۲) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

(۱۳) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں، پھر ان کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں، پھر ترقی کے بعد زوال طاری ہوا، اور تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئی، بلاشبہ دانشمندوں کیلئے اس صورتحال میں بڑی ہی عبرت ہے۔

مندرجہ بالا آیات، جن میں تحقیق حق کی دعوت دی گئی ہے، پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات اور کارخانہ عالم کو پیدا کرنے والی ایک ہستی بالضرور موجود ہے کیونکہ دنیا کی کوئی چیز بھی خود بخود وجود میں نہیں آسکتی۔ اس دنیا میں موجود ہر جسم طبعی کیلئے حرکت ضروری ہے، کوئی جسم طبعی ایسا نہیں جو متحرک نہ ہو، اور ہر متحرک کا ایک محرک ہونا لازمی ہے کہ جس پر تمام سلسلہ ختم ہوتا ہو۔ وہ محرک اول ہو گا یہی محرک اول اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو پوری کائنات کی خالق ہے۔

کائنات کے خاتمہ کا اسلامی اور سائنسی تصور

ڈاکٹر وکیل جبران

کائنات کا خاتمہ

اسلامی عقیدہ کے مطابق کائنات اور اس کی ہر چیز فانی ہے، جو بالآخر فنا ہو جائے گی اور آسمان وزمین کے کرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے۔ اس اسلامی تصور کو ''قیامت'' کا نام دیا جاتا ہے۔

قیامت

قرآن مجید میں ''قیامت'' کو بہت سے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً یوم القیامه ، یوم الازفه ، یوم عسیر، یوم عظیم ، یوم عصیب، یوم البعث، یوم التلاق، یوم التناد، یوم الدین، یوم الجمع، یوم الاخر، یوم الموعود، یوم الحساب، یوم الخروج، یوم الحسره، یوم الفصل، الساعه، القارعه، الحاقه، الواقعه ، الصاخته وغیرہ۔

قیامت کی تعریف

قیامت کی تعریف میں چند قرآنی آیات کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) یوم ینفخ فی الصور

سورہ انعام، نحل اور طٰہٰ کے مطابق قیامت وہ ہے جس دن صور پھونکا جائے گا۔

(۲) یوم ینفع الصادقین صدقهم

سورہ مائدہ کے مطابق: قیامت اس دن کا نام ہے جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔

(۳) **یوم تشقق السماء**

سورہ فرقان کے مطابق: قیامت وہ ہے جس دن آسمان پھٹ جائے گا۔

(۴) **یوم یقوم الاشھاد**

سورہ مومن کے مطابق: قیامت وہ دن ہے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

(۵) **یخرجون من الاحداث.**

سورہ قمر کے مطابق: قیامت وہ دن ہے جس دن لوگ قرون سے نکلیں گے۔

(۶) **یوم یعض الظالم علی یدیہ.**

سورہ فرقان کے مطابق: قیامت وہ دن ہے جب گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چھپائے گا۔

(۷) **یوم القیوم الناس لرب العالمین.**

سورہ نمل کے مطابق: قیامت وہ ہے جس دن لوگ جہان کے پروردگار کیلئے کھڑے ہوں گے۔

(۸) **یوما الاتجزی نفس عن انفس شیاء.**

سورہ بقرہ کے مطابق: قیامت وہ دن ہے جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق ایک دن ایسا آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت اسرافیل علیہ السلام (جو ایک مقرب فرشتہ کا نام ہے) صور پھونکیں گے، جس سے پوری کائنات فنا ہو جائے گی۔ فنا کے اسی عالم کو اسلام میں ''قیامت'' کا نام دیا گیا ہے۔ پوری کائنات کے فنا ہونے کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے دوبارہ صور پھونکیں گے تو تمام انسان زندہ ہو جائیں گے اور انہیں ان کے نامہ اعمال کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی، اس دن کا نام ''یوم الجزاء'' یا ''یوم محشر'' ہے۔

وقوع قیامت

وقوع قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) وقوع قیامت کے بارے میں سورہ الحاقہ میں فرمایا گیا ہے:

وہ ثابت ہو چکنے والی (قیامت) کیا ہے؟ وہ ثابت ہو چکنے والی اور تو نے
کیا سوچا ہے، وہ ثابت ہو چکنے والی عاد اور ثمود نے اس کوٹ ڈالنے والی کو
جھٹلایا، پس عاد اور ثمود کو اچھال کر غارت کر دیا گیا۔

یعنی وہ قیامت کی گھڑی جس کا آنا ازل سے علم الٰہی میں ثابت اور مقرر ہو چکا ہے جبکہ حق باطل سے بالکل واشگاف طور پر بدوں کسی طرح کے اشتباہ کے جدا ہو جائے گا اور تمام حقائق اپنے پورے کمال کے ساتھ نمایاں ہوں گے اور اس کے وجود میں جھگڑا کرنے والے سب اس وقت مغلوب و مقہور ہو جائیں گے۔ جانتے ہو وہ گھڑی چیز (الحاقہ) کیا ہے؟ کس قسم کے حالات و کیفیات کو اپنے انداز رکھتی ہے۔ قوم ثمود اور عاد نے اس جھٹلانے والی گھڑی کو جھٹلایا تھا، جو تمام کائنات اور آسمانوں کو کوٹ کر رکھ دے گی اور سخت سے سخت مخلوق کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

اسی سورہ (الحاقہ) میں فرمایا گیا ہے:

پھر جب صور میں ایک بار پھونک ماری جائے گی اور زمین الٹائی جائے
گی اور پہاڑ توڑے جائیں گے جس طرح توڑنے کا حق ہے، ایک ہی
آن میں، پس اسی روز قیامت برپا ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا
اور اس کی رفتار سست پڑ جائے گی اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر
جو تیرے رب کا تخت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس دن آٹھ شخص سامنے
کیے جائیں گے تمہاری کوئی بات چھپی نہ رہے گی سو جس کو اس نامہ اعمال
داہنے ہاتھ میں ملا، وہ کہے گا لو میرا لکھا ہوا پڑھو۔

یعنی صور پھونکنے کے ساتھ ہی زمین اور پہاڑ اپنے حیز کو چھوڑ دیں گے اور سب کو کوٹ پیٹ کر یکسر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور جس وقت درمیان سے پھٹنا شروع ہوگا تو فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے۔ اب عرش عظیم کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس دن ان چار کے ساتھ چار اور لگیں گے۔ پھر تمام لوگ اللہ کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ جہاں ان کے نامہ اعمال کے مطابق انہیں جزایا سزا دی جائے گی۔

(۲) سورۂ الواقعہ میں وقوع قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

جب ہو پڑے ہو پڑنے والی (قیامت) اس کے ہو پڑنے میں کوئی
جھوٹ نہیں ہے۔ پس کرنے والی ہے بلند کرنے والی، جب زمین کپکپا
کر لرز اٹھے گی اور پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر

اڑتے ہوئے غبار کے مانند ہو جائیں گے۔

(۳) ✓ سورہ ''مرسلات'' میں فرمایا گیا ہے:

پس جس وقت ستارے مٹا دیے جائیں گے اور جس وقت آسمان کھول دیا جائے گا اور جس وقت پہاڑ اڑا دیے جائیں گے۔

یعنی قیامت کے روز تارے بے نور ہو جائیں گے، آسمان پھٹ پڑیں گے اور پھٹنے کی وجہ سے ان میں دریچے اور جھروکے سے نظر آنے لگیں گے اور روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔

(۴) سورۂ القیامتہ میں فرمایا گیا ہے:

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے برائی پر، کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہ کریں گے؟ ہم اس کی پوریاں ٹھیک کیوں نہیں کر سکتے، آدمی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہو گا، پھر جب چندھیانے لگے آنکھ اور چاند گہنا جائے اور سورج اور چاند اکٹھے ہو جائیں

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوں گی اور بدن ریزہ ریزہ ہو چکا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سب کو دوبارہ اسی ترکیب سے وجود میں لے آئے گا جس طرح وہ دنیا میں تھا۔ یعنی اللہ کی قدرت سے ذروں، اجزا اور بدن انسانی کو دوبارہ ایسی حالت میں لانا محال نہیں ہے۔ اس کی آیت میں وقوع قیامت کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے قریب حق تعالیٰ کی تجلی سے آنکھیں چندھیانے لگیں گی اور مارے حیرت کے نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور سورج سر کے قریب آ جائے گا۔ پھر سورج اور چاند بے نور ہو جائیں گے۔

(۵) ✓ سورۂ الزلزال میں فرمایا گیا ہے:

جب ہلا ڈالے زمین اسے کے بھونچال سے اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ۔

یعنی اللہ تعالیٰ ساری زمین کو ایک نہایت سخت اور ہولناک زلزلہ سے ہلا ڈالے گا جس کے صدمہ سے کوئی عمارت اور کوئی پہاڑ یا درخت زمین پر قائم نہ رہے گا، سب نشیب و فراز برابر ہو جائیں گے تاکہ میدان حشر بالکل ہموار اور صاف ہو جائے اور یہ معاملہ قیامت نفخ ثانی کے وقت ہو گا۔ اس وقت زمین پر اور جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے مثلاً مردے، یا سونا چاندی وغیرہ سب باہر

اگل دے گی۔

(۶) سورۃ العادیات میں فرمایا گیا ہے:

کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے اور تحقیق ہو جو کچھ کہ دلوں میں ہے۔

یعنی وہ وقت بھی آنے والا ہے جب مردہ جسم قبروں سے نکال کر زندہ کئے جائیں گے اور دلوں میں جو چیزیں چھپی ہوئی ہیں، سب کھول کر رکھ دی جائیں گی۔

(۷) سورۃ النباء میں فرمایا گیا ہے:

جس دن پھونکی جائے صور، پھر تم چلے آؤ گروہ کے گروہ اور کھولا جائے آسمان تو ہو جائیں اس میں دروازے اور چلائیں پہاڑ تو ہو جائیں چمکتی ریت (سراب) کے مانند۔

یعنی قیامت کے روز آسمان پھٹ کر ایسا ہو جائے گا گویا دروازے ہی دروازے ہیں۔ پہاڑ سراب بن جائیں گے، یعنی جیسے چمکتی ریت پر دور سے پانی کا گمان ہوتا ہے اسی طرح ان پہاڑوں کا گمان ہوگا۔

(۸) سورۃ المزمل میں فرمایا گیا ہے:

جس دن کہ کانپے گی زمین اور پہاڑ اور پہاڑ پھسلتے ہوئے تودے بن جائیں گے

یعنی عذاب کی تمہید اس وقت سے شروع ہوگی جب پہاڑوں کی جڑیں ڈھیلی ہو جائیں گی اور وہ کانپ کر گر پڑیں گے اور ریزہ ریزہ ہو کر ایسے جائیں گے جیسے ریت کے تودے جن پر قدم نہ جم سکے۔

(۹) سورۃ التکویر میں فرمایا گیا ہے:

جب سورج کی دھوپ تہہ ہو جائے گی اور جب تارے میلے ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب بیانی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے گی اور جب پہاڑ جھونکے جائیں گے۔

یعنی قیامت سے قبل سورج کی شعاعیں جن سے دھوپ نکلتی ہے لپیٹ کر رکھ دی جائیں گی اور آفتاب بے نور ہو کر پنیر کی ٹکی کے مانند رہ جائے گا،

تارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور ان کا نور زائل ہو جائے گا۔ لوگ اپنے قیمتی مال کو قیامت کے ہولناک زلزلے کے وقت بھول جائیں گے۔ جنگل کے وحشی جانور جو آدمی کے سایہ سے بھاگتے ہیں شہر میں آگھسیں گے اور پالتو جانوروں میں مل جائیں جیسا کہ اکثر خوف کے وقت دیکھا گیا ہے۔ سمندروں کا پانی گرم ہو کر دھواں اور آگ بن جائے گا۔

(۱۰) سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا ہے:

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا، اور وہ آسمان اسی لائق ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے۔

یعنی اللہ کی طرف سے جب پھٹنے کا حکم تکوینی ہوگا، آسمان اس کی تعمیل کرے گا اور وہ مقدور و مقہور ہونے کے لحاظ سے اسی لائق ہے کہ بایں عظمت اپنے مالک کے سامنے نگوں ہو جائے اور اس کی فرمانبرداری میں ذرا چوں و چرا نہ کرے۔ محشر کیلئے یہ زمین ربڑ کی طرح کھینچ کر پھیلا دی جائے گی اور عمارتیں پہاڑ وغیرہ سب برابر کر دیئے جائیں گے۔ تاکہ ایک سطح مستوی پر سب اولین و آخرین بیک وقت کھڑے ہو سکیں۔ اس دن زمین اپنے خزانے اور مردوں کے اجزاء اگل ڈالے گی اور ان تمام چیزوں سے خالی ہو جائے گی جن کا تعلق اعمال عباد کے مجازات سے ہے۔

خلاصہ

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات اور دیگر بے شمار آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ:

(۱) ”کل شی ھالک“ یعنی دنیا کی ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے۔ اور ”کل علیھا فان“ یعنی کائنات میں موجود ہر چیز فانی ہے۔

(۲) ایک دن ایسا آئے گا کہ کائنات کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اس مقصد کیلئے حضرت اسرافیل علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے حکم سے صور پھونکیں گے اور پوری کائنات تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔

(۳) جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت اسرافیل علیہ السلام دوبارہ صور پھونکیں گے تو تمام

انسان زندہ ہو کر محشر میں جمع ہو جائیں گے جہاں ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا کا فیصلہ ہوگا۔

تصور "فنا و زوال"

علامہ سید سلیمان ندوی کائنات کے فنا ہونے کے بارے میں استدلال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے کائنات کو متضاد عناصر اخلاط پر قائم فرمایا ہے۔ دن، رات، روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس، حیات، موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر، شر غرض جس چیز کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چار دیواری متضاد قوی حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے اس دنیا کی کل چل رہی ہے جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا، وہی ان کا فنا کا دن ہوگا۔ لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتاً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرہ ارضی کو بچا لے گیا۔ بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا۔ اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی۔ یہ کرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے۔ مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعداد میں اعتدال قائم ہے۔ جس دن اعتدال فنا ہوگا، نظام ارضی کا پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی۔

کائنات کے خاتمہ کا سائنسی تصور

ماہرین فلکیات کائنات کے خاتمہ کے بارے میں دو قسم کے تصورات رکھتے ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگیں گے حتیٰ کہ وہ آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے اور یوں کائنات معدوم ہو جائے گی۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اجرام

فلکی پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے ہٹتے ہٹتے ختم جائیں گے اور ٹھنڈے ہو کر معدوم ہو جائیں گے۔ گویا دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات فنا ہو جائے گی۔

اول الذکر گروہ جو کائنات کے پاش پاش ہو کر معدوم ہو جانے کا قائل ہے اس کا کہنا ہے کہ اس وقت تمام اجرام فلکی ایک دوسرے سے دور ہٹ رہے ہیں یعنی کائنات پھیل رہی ہے مگر پھیلاؤ کا یہ عمل بالآخر رک جائے گا اور تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کی جانب کھینچنے لگیں گے اور آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے اور کائنات آگ کے ایک بڑے گولے میں تبدیل ہو جائے گی۔

موخر الذکر گروہ کا کہنا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کا عمل جاری رہے گا حتیٰ کہ ایک دن تمام ستارے اور کہکشائیں جل بجھیں گی اور کائنات اجرام فلکی کی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

پروفیسر مارٹ ریلین کا خیال ہے کہ کہکشائیں، ستاروں اور سیاروں کے طشت نما مجموعوں کا نام ہے۔ ان سب کہکشاؤں سے ریڈیائی لہریں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے تجربہ سے ثابت ہوا کہ کہکشاؤں کی محوری گردش کی رفتار ہمارے اب تک کے اندازوں سے کہیں زیادہ ہے تاہم ان کی گردش بہت مستحکم ہے اور اسی سے اشارہ ملتا ہے کہ ان کے مادے کی مجموعی مقدار میں نظر آنے والے مادے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات میں غیر مرئی تاریک مادہ موجود ہے۔ جو نظر آنے والے مادہ سے مقدار میں دس سے سو گناہ زیادہ ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر کائنات میں مادہ کی اتنی مقدار موجود ہے تو اس کے پھیلاؤ کو روک کر چند کروڑ برسوں میں اسے پیس کر رکھ سکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تاریک کے انکشاف سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اگر کہکشائیں سابقہ تخمینوں کی بہ نسبت سو گنا بھاری ہیں تو پھر وہ ایک دوسری پر بیحد اثر انداز ہو سکتی ہیں اور ان کی کشش ثقل انہیں ایک دوسرے کی جانب کھینچ سکتی ہے اور آخر کار پھیلاؤ کے عمل کو روک سکتی ہے جس کے نتیجہ میں کائنات عدم کا شکار ہو سکتی ہے۔

موجودہ دور میں سائنس دانوں کے سامنے کائنات کے خاتمہ سے متعلق ایک اور جدید نظریہ سامنے آیا ہے جس کے مطابق کائنات کا انجام نہ تو پس جانا ہے اور نہ ہی پھیلتے پھیلتے ختم کر ختم ہو جانا ہے بلکہ اس نظریہ کے مطابق کائنات پھیلتے پھیلتے سست رفتار ہو جائے گی اور بالاخر ایک مقام آئے گا جسے ہم "مقام قرار" کو قیامت کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ "قیامت" کا مفہوم بھی تھم جانا یا رک جانا ہے۔

ایک تصویر یہ بھی ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں۔ ان میں سے

بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے سیارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی معدوم ہو جائے۔

بعضوں کا کہنا ہے کہ نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ آخر ایک دن ایسا آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ یوں پوری کائنات معدوم ہو جائے گی۔

انسانی وجود قرآن اور جدید سائنس

عبدالرحمٰن شاکر

کائنات میں انسان واحد مخلوق ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے چار قسمیں کھا کر فرمایا ہے کہ ہم نے احسن تقویم بنایا ہے۔اس احسان کی یاددہانی کے لئے فرمایا:

اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے کرم فرمانے والے رب کے بارے دھوکہ میں ڈالا ہے۔جس رب نے تجھے پیدا کیا (تیرے اعضا کو) درست کیا۔ پھر تیرے (عناصر) کومعتدل بنا یا(الغرض) جس صورت میں چاہا تجھے ترتیب دے دیا(الانفطار ۶,۷,۸)

ان آیات میں بڑے پیارے انداز میں انسان کو جھنجوڑا گیا ہے۔ دراصل انسان کی تخلیق میں رب العزت کی قدرت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تخلیق انسان پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی گئی ہے۔

سید قطب شہیدؒ اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں کہ اصطلاح میں معجزہ انبیاء کرام سے سرزد ہوا کرتا تھا اور مخالفوں کو عاجز کر دیتا تھا۔ مگر معجزہ کے لفظ کو جب عام معنوں میں لیا جائے تو ہر وہ چیز جو انسانی قدرت سے باہر ہو وہ معجزہ ہے اس لحاظ سے کان آنکھ دماغ سب معجزے ہیں۔آیئے ان معجزات پر جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں مختصراً غور کرتے ہیں۔

انسانی ہاتھ بے نظیر طبیعی عجائب کے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ بات نہایت مشکل بلکہ محال ہے کہ کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو سکے جو بساطت،قدرت اور سرعت میں انسانی ہاتھ کے مشابہ ہو۔دونوں ہاتھوں میں ۲۷ ہڈیاں ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ۱۹ پٹھے ہوتے ہیں۔

انسانی کان کا صرف ایک جز یعنی کان کا وسطی حصہ تقریباً ۴ ہزار پیچیدہ قوسوں پر مشتمل ہے۔ یہ قوسیں ایک اعلیٰ درجے کے نظام کے ساتھ درجہ بدرجہ واقع ہیں۔ان کا حجم اور شکل وصورت چھوٹی بڑی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان قوسوں کا طول اور حجم کیا ہے؟ یہ کئی ہزار قوسیں کس طرح باہم

مرکب ہیں؟ ان کی خاص ترکیب کیا ہے؟ وہ خلا کیا ہے جس کے اندر یہ رکھی گئی ہیں؟ توپ کی گرج سے لے کر درخت کی سائیں سائیں تک ہر چیز کو اخذ کرنا اور دماغ تک پہنچانا ان کا کام ہے۔ ایک کان کے اندر سننے کے کم و بیش ایک لاکھ خلیات ہیں اور پٹھے جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں پتلی پتلی سلوٹیں ہیں جن کی دقت و عظمت عقل کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ آنکھ میں دیکھنے کے حاسے کا مرکز روشنی استقبال کرنے والے ۱۳ کروڑ آلات پر مشتمل ہے۔

اور یہ پٹھوں کے اطراف ہیں جن کی حمایت سے آنکھ کا حلقہ قائم رہتا ہے۔ اس حلقے پر بہت سی سلوٹیں ہیں جو اسے دن رات بے شمار مخالف اثرات سے بچاتی ہیں۔ یہ سلوٹیں آنکھوں کو مٹی کے ذرات مخالف اجسام اور دھوپ کی شدت سے بچاتی ہیں۔ پپوٹے ان پر جھک کر ان کی حفاظت کرتے ہیں جبکہ آنسو آنکھوں کو پاک صاف رکھنے کا مضبوط ترین ذریعہ ہے۔ انسان میں چکھنے کی قوت اور آلہ زبان ہے اسی قوت ذائقہ سے انسان کڑواہٹ، مٹھاس، ٹھنڈک، کھٹاس، نمکینی اور شدید نمکینی محسوس کرتا ہے اور اسی زبان سے اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔ زبان میں چکھنے کے ۹ ہزار آلات پائے جاتے ہیں جو بہت پتلے ہیں ان میں ہر آلہ ایک ایک سے زیادہ پٹھوں کے ساتھ دماغ سے منسلک ہے۔ اب اندازہ فرمائیں کہ ان پٹھوں کی تعداد کس قدر ہے؟ ان کا حجم کیا ہے؟ اور یہ علیحدہ علیحدہ کیونکر کام کرتے ہیں؟

معدہ انسانی ذہانت کی ایجاد کردہ فیکٹریوں کی نسبت سب سے زیادہ کیمیائی مواد پیدا کرنے اور کام میں لانے والی فیکٹری ہے۔ ہم اس فیکٹری میں قسم قسم کے کھانے بے ترتیبی کے ساتھ ڈالتے ہیں ہم نہ تو اس کارخانے کے عمل اور تاثیر وقوت کا خیال کرتے ہیں نہ ہی یہ سوچتے ہیں کہ قوت ہاضمہ کی کیمیا[illegible] [illegible] طرح عمل کرے گی اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ معدہ کھانے کی غیر مرتب چیز وا[illegible] [illegible] یہ اشیاء کا انتخاب کرتا ہے۔ کھانے کے اجزاء کو کیمیائی اقسام میں تبدیل کرنے [illegible] معدے کے گیسٹرک غدود عجیب طریقے سے گیسٹرک جوس خارج کرتے ہیں۔ جس [illegible] ال نمک کا تیزاب اور خامرہ پیپسن (pepsin) ہاضمے میں ہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رب العزت کے پیدا کردہ اس نظام کی باریکی دیکھئے کہ خوراک کا انہضام منہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے ہمارے منہ کے اندر لعاب میں موجود خامرہ ٹائلن (ptyalin) خوراک بالخصوص کاربو ہائیڈریٹس کے انہضام میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ درحقیقت معدے کا نظام ہضم جسم کے تمام خلیوں کو خوراک اور توانائی مہیا کرتا ہے۔ یعنی جسم کے تمام اجزاء مثلاً ہڈیوں، ناخنوں، گوشت آنکھوں دانتوں وغیرہ کے اربوں کھربوں خلیات کو غذا اور توانائی پہنچاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا وجود ختم ہو جائے یہ امر غور طلب ہے کہ انسانی جسم کے کل خلیات کی تعداد ۷۵ کھرب ہے۔

گردہ انسانی خون کو صاف کر کے پیشاب سے الگ کرتا ہے۔ اس کے نظام کی باریکیاں انسانی عقل کو عاجز کر دیتی ہیں۔ خون کی صفائی اور پیشاب بنانے کے عمل کے لئے ہر گردہ ۱۰ لاکھ سے بھی زائد انتہائی باریک خوردبینی نالیوں پر مشتمل ہوتا ان نالیوں کو نیفرون Nephrons کہتے ہیں ہر نیفرون خون سے فاضل اور فاسد مادوں مع فالتو پانی اپنے اندر جذب کرتی ہے اور اس کے ساتھ مختلف نمکیات اور دوسری چیزوں کی مقدار کو بھی کنٹرول کر کے پیشاب میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ہر نیفرون مزید کئی حصوں مثلاً (رینل کارپسل۔ اینل ٹیوبیول، بومین کیپسول، گلومیرولیس وغیرہ) پر مشتمل ہوتی ہے۔ لہٰذا کام اور ساخت کے اعتبار سے ہر نیفرون اپنی ذات میں ایک مکمل چھاننی بلکہ فیکٹری ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم بلامبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر انسانی گردے میں ۱۰ لاکھ سے بھی زیادہ...... صاف کرنے والی اور پیشاب بنانے والی چھاننیاں یا فیکٹریاں ہیں۔

انسانی دماغ کی حیرت انگیزیوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جدید سائنس اپنی تمام تر ترقی کے باوجود دماغ کا کماحقہ ادراک حاصل نہیں کر سکی۔ انسانی دماغ دو نیم کروں میں منقسم ہوتا ہے یہ دونوں نیم کرے ایک موٹی ڈوری جیسے اعصابی پل کورپس کیلورم کے ذریعے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس پل میں ۲۰ کروڑ ریشے ہوتے ہیں ان ریشوں کے توسط سے فی سیکنڈ کئی ارب اطلاعات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ دماغ میں ۱۰ ارب اعصابی خلیے ہوتے ہیں۔ یہ تعداد دماغ کے سیریبلیم حصے کے علاوہ ہے جبکہ سریبلیم میں جو عقبی دماغ کے نیچے ہوتا ہے ۱۰۱ ارب اعصابی خلیے ہوتے ہیں سیریبلیم عضلات حرکات اور جسم کا توازن برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ پھر ہر اعصابی خلیے کے متعلق دس گلائل Glial خلیے ہوتے ہیں یہ اعصابی ڈھانچہ بناتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر اعصابی خلیے کے دوسرے اعصابی خلیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے ایک سے ۱۰ ہزار اتصالی مقامات ہیں۔ اب خود اندازہ فرمائیں کہ گلائل خلیوں اور اتصالی مقامات کی تعداد کتنی ہوگی؟ انسانی دماغ میں "ہاں یا نہیں" قسم کی اطلاعات معلومات رکھنے کی طاقت تعداد اور طاقت ۱۰ کھرب ہے۔ جدید ترین سائنسی تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ دماغ میں بہت چھوٹے برقی دور ہوتے ہیں جس کا سائز ایک سنٹی میٹر کا دس ہزارواں حصہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اطلاعات ایک دور سے دوسرے دور تک انتہائی سرعت سے پہنچ سکتی ہیں۔ ایک کمپیوٹر میں اطلاعات کی کثافت یا گنجائی فی سنٹی میٹر ۱۰ ہزار ٹکڑوں (Bits) کی ہوتی ہے جبکہ انسانی دماغ میں کمپیوٹر کی نسبت ۱۰ ہزار گنا زیادہ اطلاعات مرتسم کرنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ یعنی انسانی دماغ میں یہ کثافت فی سنٹی میٹر ۱۰ کروڑ ٹکڑوں کی ہوتی ہے کیونکہ کمپیوٹر تو انسان کا ایجاد کردہ ہے جبکہ انسانی دماغ والا سپر کمپیوٹر کا خالق خود اللہ تعالیٰ ہے۔ سارے مدرکات دقیق عصبی آلات کے ذریعے دماغ تک تو پہنچتے ہیں سوال یہ ہے

کہ انسان ان کو کہاں جمع رکھتا ہے؟ اگر دماغ ایک لپٹے ہوئے دفتر کی مانند ہوتا تو انسان اپنی متوسط عمر میں کروڑوں اربوں میٹر کا محتاج ہوتا تا کہ ان پر یہ سب صورتیں کلمات معانی مشاعر اور تاثرات کو لکھ سکے اور بعد میں انہیں یاد رکھ سکے جس طرح درجنوں سالوں کے بعد واقعی گذشتہ واقعات کو یاد کرتا ہے۔

درحقیقت انسان دنیا کی سب سے زیادہ پیچیدہ مشینری ہے اس کا آغاز صرف ایک قطرے سے ہوتا ہے یعنی باپ کے نطفے کے کروڑوں تخموں میں سے صرف ایک تخم یا سپرم ماں کے نطفے کے صرف ایک انڈے یا اووم (ovum) سے ملتا ہے اور انسانی وجود کا سب سے پہلا خلیہ زائیگوٹ بنتا ہے جو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ بغیر خوردبین کے نظر نہیں آسکتا۔ اسی زائیگوٹ میں انسانی اعضاء دل و دماغ کان آنکھ گردے وغیرہ کے پیچیدہ نظاموں کی خصوصیات خلاصے کے طور پر جمع ہوتی ہیں۔ یعنی ایک مکمل انسان زائیگوٹ کے اندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ زائیگوٹ میں ۶۰ ہزار انسانی حیاتیاتی خصوصیات جمع ہوتی ہیں۔ اسی زائیگوٹ کو درجہ بدرجہ کمال تک پہنچا کر انسان جیسی شاہکار مخلوق وجود میں آتی ہے اور یہ کام صرف وہی ذات کرسکتی ہے جو اپنی ذات میں بھی لامحدود ہو اور پھر اپنی ہر صفت میں لامحدود ہو۔ ایسی لامحدود قدرت حکمت اور علم رکھنے والی ذات جو ایک ذرے ''جو کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتا'' سے انسان بنا سکتی ہے وہی ذات انسان کے مرنے کے بعد انسان کی ہڈیوں کو زندہ کر کے دوبارہ انسان بنا سکتی ہے۔

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ایسے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ منی کا قطرہ نہ تھا پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا پھر اس کو اللہ نے بنایا اور اس کی نوک پلک سنواری۔ پھر اس سے دو جوڑے نر اور مادہ پیدا کیے۔ کیا پھر وہ رب اس بات پر قادر نہیں کہ مردے کو دوبارہ زندہ کر دے۔ (القیمۃ)

قرآن سائنس اور تسخیر کائنات کی تعلیمات

قرآن اور سائنس کا موضوع بہت وسیع ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس سوال کی طرف آئیں گے کہ سائنس کا قرآن مجید سے کیا تعلق ہے؟

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ ہمارے ہاں بدنصیبی یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھ کر نہیں پڑھتے، یہ دردناک کہانی ہے۔ اگر ہم قرآن کی طرف رجوع کریں تو یہ کثیر جہتی طریقے سے ہماری زندگیوں میں کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کی تلاوت میں اجر و ثواب بھی ہے، برکت بھی۔ جب ہم بطور کلام قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو اس سے ہمارے دل ونگاہ کو نئی زندگی ملتی ہے۔ روحانی طور پر آدمی تر و تازہ ہو جاتا ہے اور نفسیاتی سطح پر بھی طرح طرح کے امراض سے نجات ملتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کوئی مومن انکار نہیں کر سکتا، مگر اصل سوال یہ ہے کہ ہم قرآن شریف کو کتنا سمجھ کر پڑھتے ہیں، بلکہ اسے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ کیا ہمارے ہاں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس کے پیغام کو سمجھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔ افسوس کہ اب ہمارے اندر قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم نے قرآن مجید سے اس کے سمجھ کر پڑھنے کے تصور ہی کو علیحدہ کر دیا ہے۔ ہماری انفرادی سطح کی پریشانیوں اور قومی سطح کے زوال کا بنیادی سبب ہی یہی ہے۔

علم، تحقیق، ایجاد، دریافت اور تخلیق کے جس راستے پر قرآن ہمیں ڈالنا چاہتا ہے، وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ تقلید جامد، توہمات پرستی، بے جان رسوم اور چند ظاہری شکلوں کی پاس داری نے لے لی۔ اب جہاں قرآن مجید کے بارے میں ہماری سوچ انتہائی محدود ہے، ہم سائنس کی نوعیت اور اہمیت کو بھی پوری طرح نہیں سمجھتے۔ ہمارے علمی زوال کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی سطح پر بدنصیبی سے ''سائنس'' کا لفظ آتے ہی چہروں پر ایک ناگوار اور بے زاری سی چھا جاتی ہے۔ ہم اسے ایک ''اجنبی'' چیز سمجھتے ہیں یا پھر ایک ''دنیوی علم''، ''دنیادار'' لوگوں کے کام کرنے کا کام۔ ایک ایسا کام جس کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

تھا جو ناخوب بہ تدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

سائنس دان کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لی ہوتی ہے کہ وہ "کتاب فطرت" کو پڑھ سکتا ہے اور اس کے قوانین اور اسرار و رموز کا فہم حاصل کر کے اسے دنیا کے سامنے قوت کی علمی اصطلاحوں میں بیان کر سکتا ہے، لہٰذا سائنس نہ مغربی ہوتی ہے اور نہ مشرقی۔ اس کا کسی مذہب یا ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے، علم و حکمت کی ہر بات اس کی متاع گم گشتہ ہے۔ اسے ہر لحہ اس کی طلب و جستجو ہونی چاہیے اور یہ اسے جہاں سے بھی ملے، حاصل کرنی چاہیے۔ سائنس تو یوں بھی ہماری چیز ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ موجودہ سائنس نے صحیح معنوں میں جنم قرون وسطیٰ کی اسلامی درس گاہوں میں لیا ہے۔ اس کے اصل بانی مسلمان ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنی باتوں یا جملوں کے لیے بھی "آیات" کا لفظ استعمال کیا ہے اور کائناتی مظاہر کے لیے بھی۔ ایک تحریری آیات اور دوسری تخلیقی آیات۔ آیت نشانی، نشان اور دلیل کو کہتے ہیں جو کسی موجود کی موجودگی کی گواہی دے۔ قرآنی آیات اور کائناتی آیات دونوں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی گواہی دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں آیت کا لفظ اپنی مختلف شکلوں، واحد، جمع وغیرہ میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ یہاں بات سمجھانے کے لیے چند مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

"سورۂ نمل" کا آغاز ہوتا ہے:

ترجمہ: یہ قرآن کی آیات ہیں جو کہ کتاب روشن ہے۔ (اس میں) مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

"سورۃ البقرۃ" میں ہے:

ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف سلجھی ہوئی آیتیں ارشاد فرمائی ہیں اور ان سے انکار وہی کرتے ہیں جو بدکردار ہیں۔

مندرجہ بالا حوالوں میں آیات کا لفظ قرآنی جملوں یا پیغام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اب کچھ مثالیں ان مقامات کی جہاں یہ لفظ کائناتی مظاہر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ہے۔

ترجمہ: بے شک زمین اور ماورائے زمین کائنات میں مومنوں کے لیے (قدرت الٰہی) کی نشانیاں ہیں اور (اے انسانو) تمہاری تخلیق میں بھی اور ان جان

داروں میں بھی جنھیں اللہ (کائنات میں) پھیلاتا ہے، اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں، رات اور دن کی گردش میں اور اس نے اوپر سے ذریعہ رزق فرمایا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا اور ہواؤں کی گردش میں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

''سورۃ الذاریات'' میں ہے:

ترجمہ: ''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجودوں میں بھی۔ پس کیا تم دیکھو گے نہیں؟''

سائنس کی بنیادی طور پر تین حیثیتیں ہیں۔ سائنس ایک علم ہے، سائنس ایک طاقت ہے اور سائنس ایک معیار ہے۔ بہ حیثیت علم سائنس ہمارے ذہنی افق کو وسیع کرتی ہے۔ ہمارے ذہن کی نشوونما کر کے ہمارے شعور، ہماری بصیرت اور ہماری سمجھ میں اضافہ کرتی ہے، ہمارے اندر تجزیے کی صلاحیت کو فروغ دیتی ہے اور بالآخر ہم میں منطقی اور تعقلاتی انداز فکر کو پیدا کرتی ہے۔ اس سے ہماری سوچ اور شعور میں نظم پیدا ہوتا ہے اور یوں ہمارے اندر وہ بصیرت پیدا ہوتی ہے جو ہمارے رب کی معرفت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ہم ''کائنات'' کے مطالعے سے بالآخر ''کائنات والے'' اللہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

''سورۂ ق'' میں ہے۔

ترجمہ: ''کیا انہوں (لوگوں) نے اپنے اوپر کائنات سماوی کی طرف نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اسے کیسے بنایا اور (کیسے) آراستہ کیا ہے اور اس میں کوئی رخنہ نہیں۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ پیدا کیے اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اُگائیں۔ (یہ سب اس لیے) بصیرت افروزی اور یاد دہانی کا ذریعہ بنے۔ ہر اس بندے کے لیے (اپنے رب کی طرف) جو رجوع کرنا چاہیے۔''

''سورۃ العنکبوت'' میں ہے:

ترجمہ: کہو، زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح تخلیق کی ابتدا کی ہے، پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز قادر ہے۔

سورۂ یونس میں ہے:

ترجمہ: کہو، دیکھو کیا کیا کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں، مگر نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آئے جو ایمان نہیں رکھتے۔"

انسان جب اپنی اور کائنات کی تخلیق پر غور کرے گا تو ایک طرف اس میں خالق کائنات کی عظمت و کبریائی کا شعور پروان چڑھے گا، جس سے اسے رب کی معرفت حاصل ہوگی اور دوسری طرف اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس فروغ پائے گا، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن جائے گا۔

ایک اہم اصلاح "تسخیر" ہے جسے وہ بار بار استعمال کر کے ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ ہم قوانین فطرت کو سمجھ کر وسائل و ذرائع کو بہتر سے بہتر طور پر استعمال میں لائیں۔ اس سے ہمیں دفاعی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔

"سورۃ الحدید" میں ہے۔

ترجمہ: "اور ہم نے لوہا پیدا کیا، اس میں شدید قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں۔"

"سورۃ الانفال" میں ہے۔ میں قرآن نے ٹیکنالوجی کی ایجاد و حصول کی تحریک ان الفاظ میں دی ہے۔

ترجمہ: "اور ان کے لیے (جو تم پر حملہ کریں) تیار رکھو جتنی بھی استطاعت ہو، ہر قسم کی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے۔ تاکہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر، جو تمہارے بھی دشمن ہیں دھاک بٹھائے رکھو۔"

آج صورت حال یہ ہے کہ دنیا کا ہر مذہب، ہر فلسفہ، ہر نظریہ جب اپنی صداقت کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اپنے حق میں سائنس سے دلائل حاصل کر سکے۔ اسلام جو کہ ابدی صداقتوں کا مجموعہ ہے، اس کی بھی یہ ضرورت ہے کہ دنیا کی ذہنی و علمی سطح کے مطابق اس کے سامنے اس کے تسلیم شدہ معیار پر اسلام کی صداقت کے دلائل پیش کیے جائیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: "اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت کے ساتھ بلاؤ۔"

اسلام اور سائنس میں جو مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس کے باعث اسلام اور علمی و فکری قوت کو دنیا کی ہر سطح پر منوا رہا ہے۔ ہمیں اسلام کی اس قوت کو سمجھنے اور عمل لانے کی ضرورت ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

❋......❋

قرآن مجید میں ایٹم بم کا تذکرہ

افتخار احمد اعوان

قرآن مقدس میں ایک معجزہ ہے، اس کی آیات، مضامین، واقعات اور امثلہ میں اعجاز در اعجاز کا ایسا سلسلہ بکھرا ہوا ہے کہ عقل انسانی متحیر اور فہم و دانش، ورطہ استعجاب میں گم ہو جاتی ہے۔ قرآن کی فصاحت اس حقیقت کی بین غماز ہے کہ کوئی انسان اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ قرآن مقدس جیسی بے مثال اور لافانی کتاب تصنیف کر سکے۔ بلکہ غور کرنے سے بالآخر یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے بے مثال و بے بدل ہے جو بواسطہ روح الامین، سید الکونین کے قلب اطہر پر بطور معجزہ اتارا گیا اور اس حقیقت کو مانے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔

جب ہم موجودہ دور کے انسانوں کو عقائد و نظریات کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ہمیں مادہ پرست لوگوں میں قسم قسم اور عجیب و غریب گروہ، افراد اور فرقے نظر آتے ہیں، انہی میں سے ایک فرقہ قرآن مجید کی الہامی حیثیت کا منکر ہے، انہیں عرف عام میں ''دھریے'' کہا جاتا ہے۔

یہ لوگ جب قرآن مقدس کے بارے میں سنتے ہیں کہ یہ کتاب، ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس میں زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ اور ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور یہ کتاب آسمانوں سے نازل ہوئی ہے تو ان کی عقل کا پیمانہ اور سوچ و فکر کا پیالہ تنگ دامنی و کم ظرفی کا گلہ کرنے لگتا ہے۔ وہ زہر ہلاہل کو قند اور ظلمت کو نور کہنے پر بضد رہتے ہیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ آسمان سے بھی کوئی چیز اتر سکتی ہے، وہ کہتے ہیں۔ ''یہ کتاب، محمد عربی ﷺ کی بے مثال ذہانت و فطانت کا شاہکار اور مہارت کا شہ پارہ ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ ۲۳ سال مسلسل آیات گھڑتے رہے اور کہیں فصاحت و بلاغت اور مخصوص طرز کلام میں فرق نہ آنے دیا اور نہ کیسے ممکن ہے کہ سات آسمانوں کے اوپر سے ایک فرشتہ اترے جو کہ گرم ریگستانوں میں اونٹ اور بکریاں چرانے والے ایک امی کو حکمت و دانش کی آیتیں پڑھائے اور اور پھر آسمان پر چلا جائے، یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف محمد ﷺ کی حیران کن عقلی اور تخلیقی

صلاحیتوں کا مظہر ہے۔"

وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن بہت اچھی کتاب ہے، اس میں نصیحت بھی ہے، عبرت بھی حکمت و دانش بھی ہے اور فصاحت و بلاغت بھی، اس میں گزشتہ اقوام کے واقعات بھی ہیں اور آئندہ کا لائحہ عمل بھی، اس میں عقائد بھی ہیں، معاشرت بھی، معیشت و تجارت کے قوانین بھی ہیں اور سیاست و حرب ضرب کے اصول بھی، لیکن اس نکتے پر آ کر عقل کا دائرہ مکمل اور سوچ کی حد ختم ہو جاتی کہ "یہ کتاب ہے لیکن اگر تنگ نظری محدود و خیالی سے ہٹ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں انسانی کے دیگر شعبوں کے بارے میں الہامی ہدایات موجود ہیں وہیں پر جدید ترین سائنس کی تازہ ترین ایجادات کے بارے میں ایسے ٹھوس اشارے اور واضح انکشافات پائے جاتے ہیں جن کا تصور بھی "الہام" کے بغیر ناممکن ہے مثال کے طور پر "ایٹم بم" ہی کو لیجئے! یہ سائنس کی وہ ایجاد ہے جس پر آج کسی بھی ملک کی حربی طاقت کا دارومدار ہے۔ آج کی سائنس اس ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھتی ہے مگر آج سے تقریباً پندرہ صدیاں پہلے قرآن مقدس نے ایٹم بم کی شکل وصورت، اس کا عمل، پھٹنے کا انداز، بلکہ ایٹم بم پھٹنے سے جو منظر سامنے آتا ہے اس کی بھی تصویر کشی ہے اور سب کچھ ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں بلکہ انگریزی لفظ "ایٹم" (Atom) کے ساتھ یہ سب بیان کیا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آج سے پندرہ سو سال پہلے کا کوئی انسان یہ سب کچھ الہام کے بغیر بتا سکتا تھا یا اس کے حاشیہ خیال میں اس کا تصور تک آ سکتا ہے؟

قرآن پاک کی سورۃ ھمزہ میں اللہ نے ارشاد فرمایا "كلا لينبذن في الحطمة" یہ حطمہ دراصل ایٹم ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں "ٹ" کا تلفظ نہیں اس کی بجائے وہ "ت" یا "ط" بولتے ہیں اور "ح" اور "الف" قریب المخرج ہے اس طرح فرنچ زبان میں بھی ٹ کا تلفظ نہیں چنانچہ وہ ایٹم کو "حطم" بولتے ہیں۔ "حطمہ" کا مادہ "حطم" ہے جس کا معنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور ایٹم کا بھی تقریباً یہی معنی ہے یعنی بہت چھوٹا ٹکڑا۔

مفسرین کرام لفظ "حطمہ" کے تحت لکھتے ہیں وہ ایسا جہنم ہے کہ اس میں جو بھی چیز چلی جائے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور بعینہ یہی علم ایٹم کا ہے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شوق و رغبت اور تجسس دلاتے ہوئے فرمایا۔ وما ادراک ماالحطمة اور تجھے کیا معلوم کہ حطمہ کیا ہے؟ مگر قرآن مقدس وہ عظیم کتاب ہے جو کسی بھی مضمون کو تشنہ نہیں چھوڑتی وضاحت کیلئے بتا دیا "نار الله الموقدة التي تطلع على الافئدة، وہ اللہ کی ایسی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک چڑھتی ہے، اس آیت کریمہ میں ایٹم بم کے عمل اور کارکردگی کی وضاحت کی گئی ہے۔

عام بارودی بم جس جگہ پھٹتا ہے وہاں موجود انسانوں اور دیگر چیزوں کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ لیکن ایٹم بم کا عمل انشقاق قدرے مختلف ہے جس جگہ ایٹمی دھماکہ ہوتا ہے وہاں اس بم کی طاقت

کے مطابق کم وبیش تیس میل کے رقبے میں سے ہوا کو باہر دھکیل دیتا ہے، جب یہ ہوا اپنی جگہ لینے واپس لوٹتی ہے تو اس میں اتنی شدت کی گرمی ہوتی ہے کہ اس کا حملہ جب سینے پر ہوتا ہے تو دل کی شریانیں ٹوٹ جاتی ہے ہیں۔ ناک اور منہ سے لہو جاری ہو جاتا ہے اور دل اور سینہ جل بھن کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو قرآن مجید نے محض ایک آیت میں بیان فرما دیا اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں بم کی ظاہری ساخت کا نقشہ کھینچا ہے فرمایا، **انها عليهم موصدة** ''بے شک یہ ان پر بند کی ہوئی آگ ہے'' معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایٹم بم ہو یا کوئی دوسرا بم یا گرنیڈ وغیرہ وہ بند کی ہوئی آگ نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یاد رکھئے! جس وقت افلاک کی وسعتوں سے یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت بارود کا ہی دنیا میں کوئی وجود نہ تھا بارود کی ایجاد کو تو تقریباً تین سو سال ہوئے ہیں اور قرآن عظیم کے نزول کو قریباً ایک ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے بھلا اس زمانے کے کسی انسان کے ذہن میں بھی یہ بات آسکتی تھی! اور آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''**في عمد ممددہ**'' لمبے لمبے ستونوں میں'' یعنی وہ آگ لمبے لمبے ستونوں میں بند کی ہوئی ہے بادی النظر میں تو اس سے ایٹم بم کی ظاہری شکل وصورت مراد ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی ستون کے ساتھ مشابہت اظہر من الشمس ہے لیکن اگر مزید گہرائی میں دیکھا جائے تو اس سے مراد ایٹم بم پھٹنے کے بعد کا منظر ہے کہ جس وقت ایٹم بم کا دھماکہ ہوتا ہے تو دھوئیں اور ریڈیو ایکٹو ریز کا ایک لمبا ستون، آسمان کی طرف تقریباً تیس میل تک اٹھتا ہے اور اٹھتے وقت عجیب وغریب رنگ برنگے، رنگ بدلتا ہے اور سرے پر پہنچ کر ایک چھتری سی بنا لیتا ہے اس سورۃ مبارکہ کے شروع میں ان اقوام کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بعض مخصوص گناہوں اور عادات قبیحہ کی وجہ سے ان پر ''حطمہ'' کا عذاب مسلط کیا جائے اور وہ ہیں ''ہمزہ'' یعنی منہ پر برائی کرنا'' لمزۃ یعنی پیٹھ پیچھے برائی کرنا''۔ ''**الذی جمع مالا وعددہ**'' یعنی جو مال جمع کرتا رہے، اور گنتا رہے، اپنا بینک بیلنس بڑھانے کی فکر میں ہر وقت لگا رہے اور مال کا حق ادا نہ کرے۔ ''**یحسب ان مالہ اخلدہ**'' مزید یہ کہ وہ یہ گمان بھی کرے کہ اس کا مال اسے زندہ جاوید کر دے گا'' **کلا لینبذن فی الحطمہ**'' ہرگز نہیں بلکہ ان کو حطمہ میں ڈال دیا جائیگا۔

اس سورۃ مبارکہ میں جو کچھ بیان ہوا۔ یہ تو فقط قرآن مقدس کی فصاحت و بلاغت کا ادنیٰ کرشمہ اور اس کے الہامی کتاب ہونے کا واضح ثبوت ہے ورنہ فی الحقیقت اس کی ہر آیت میں فصاحت و بلاغت کے پردوں کے پیچھے، ہزاروں نہیں کروڑوں نکتہ ہائے دقیق پنہاں ہیں افسوس کہ آج ہم قرآن مقدس میں تدبر و تفکر سے منہ موڑ کر یورپ کی دجالی تہذیب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اسی وجہ سے ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے۔

اسلام اور ماحولیاتی آلودگی

ڈاکٹر حمید اللہ

قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار مقامات پر طہارت، نظافت اور تزکیہ کے کلمات آئے ہیں۔ اس طرح رجس، رجز، اذی، خبث اور خبائث جیسے کلمات بھی بے شمار ملتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں پاکی، پاکیزگی اور نظافت نہ صرف پسندیدہ بلکہ ضروری ہے۔ اسلام نے اس کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ (الطهور شطر الایمان) "پاکی ایمان کا حصہ ہے۔" نبی مکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ (وثیابک فطهر والرجز فاهجر) (المدثر:۴-۵) "اپنے کپڑے پاک رکھا کرو اور غلاظت سے اجتناب کر لیا کرو۔"

ان کے مقابلے میں ہر قسم کی آلودگی مثلاً غلاظت، گندگی، ناپاکی اور برائی اسلام کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہیں اور ان سے ماحول کو ہر قیمت پر پاک وصاف رکھنے کا حکم دیا ہے۔

ہمیں معلوم یہ کرنا ہے کہ ماحول کس شے کا نام ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماحول عربی زبان کا کلمہ ہے۔ جس کا مفہوم انسان کے اردگرد کے حالات و واقعات ہیں جن میں انسان زندگی گزارتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کرتا ہے۔ یہ حالات و واقعات مذہبی بھی ہو سکتے ہیں اور اخلاقی بھی، اقتصادی بھی ہو سکتے ہیں اور سیاسی بھی، تعلیمی بھی ہو سکتے ہیں اور جغرافیائی بھی، انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اجتماعی بھی اور اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ الغرض یہ تمام حالات انسان کے لیے وہ ماحول (Enviroments) مہیا کرتے ہیں جن میں انسان رہنے پر مجبور ہے۔

بدقسمتی سے ماحول کی آلودگی (Pollution) کو لوگوں نے ہوا کی آلودگی (Air

(Pollution) پانی کی آلودگی (Water Pollution) زمین کی آلودگی اور مٹی کی آلودگی اور پلیدگی تک محدود کر دیا ہے۔ اخلاقی آلودگی (Moral Pollution) مذہبی آلودگی، اقتصادی آلودگی، سیاسی آلودگی، تعلیمی آلودگی اور معاشرتی آلودگی (Social Pollution) پر بہت کم لوگوں کی نظر ہے۔ خاص نظریے کے تحت بعض حضرات نے صرف پہلے والے حصے کو اس میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

ماحول (حالات) کی خرابی سے انسان دو طرح سے متاثر ہوتا ہے ایک ذہنی اور اخلاقی طور پر دوسرا جسمانی طور پر۔

ذہنی و اخلاقی طور پر انسان ماحول سے منفی طور پر اس وقت متاثر ہوتا ہے جب اقتصادی حالات ناموافق اور ناہمواریاں ہوں۔ گھریلو حالات ٹھیک نہ ہوں، انسان کو بنیادی ضروریات مہیا نہ ہوں، معاشرے کی اخلاقی حالت تباہ و برباد ہو اور ارد گرد ہر قسم کی غلاظت اور گندگی (ظاہری و معنوی) دیکھنے میں آتی ہوں۔ اس قسم کے ماحول میں انسان کے لیے جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر انسان اس ماحول سے بری طرح متاثر ہوتا ہے جہاں مناسب خوراک نہ ملتی ہو، مناسب لباس مہیا نہ ہو اور سر چھپانے کے لیے مناسب جگہ نہ ہو اور صفائی کا کوئی انتظام نہ ہو اور ہر کہیں غلاظت اور گندگی کے ڈھیر اور گندے اور بدبودار پانی کے تالاب نظر آتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر قسم کے ماحول کو پاک و صاف رکھنے کی تاکید کی ہے۔ تاکہ انسان اس میں ذہنی، اخلاقی اور جسمانی طور پر خوش و خرم نظر آئے اور یہ چند سالہ زندگی آرام و سکون کے ساتھ گزارے۔

دین اسلام، جو نام ہے فطری طور پر پورے قرآن کا اور عملی طور پر سیرت نبوی کا، اس دین نے انسان کے لیے پرسکون اور پرامن ماحول مہیا کرنے کا مکمل بندوبست کیا ہے۔ مگر اسلام نے ماحول کی پاکیزگی کی ابتداء باطنی اور ذہنی صفائی سے کی ہے۔ وہ پہلے انسان کا دل اور ذہن ہر قسم کی آلائشوں سے پاک و صاف دیکھنا چاہتا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان کا دل اور ذہن خیالات و افکار کا مرکب ہے۔ اگر یہ اچھے اور نیک خیالات و افکار کا گہوارہ ہیں تو انسان سے پھر نیک اور اچھے کام سرزد ہوں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی: رقم ۱)

جس کے نتیجے میں اس کو ذہنی اور قلبی سکون نصیب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے

انسانی ذہن وقلب کو اچھے اور نیک خیالات وافکار میں مصروف رکھنے کا مناسب بندوبست کیا ہے اور ایسا کرنے کے لیے ایمان اور عقیدہ لازمی قرار دیا ہے۔ جو آدمی ایمان اور عقیدہ صحیحہ رکھتا ہے اس کو مومن کہتے ہیں۔ (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل رقم: ۲۷)

اور مومن اصطلاح میں وہی شخص ہوتا ہے جو ایک اللہ پر صحیح معنوں میں ایمان و یقین رکھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہی ایک اللہ پوری کائنات کا خالق مالک اور رازق ہے۔ موت و زندگی اس کے ہاتھ میں ہے۔ عزت اور ذلت وہ دیتا ہے۔ مشکل کشا، حاجت روا اور قاضی الحاجات وہی ہے۔ (حدیث جبریل بخاری و مسلم)

مومن اس بات کا بھی قائل ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے۔ اللہ کے دین کو اس روئے زمین پر نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہی انسان مکلف ہے اور اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ناراضگی کا اندازہ اس کی طرف سے نازل کردہ کتابوں اور آسمانی صحیفوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اپنے منتخب رسولوں کے ذریعے بھیجتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کے لیے آسمانی اور الہامی کتابوں پر ایمان اور یقین لازمی قرار دیا ہے۔

مومن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ یہ زندگی چند روزہ اور عارضی ہے ہمیشہ رہنے والی زندگی آخرت کی ہے، طویل بھی ہے اور ابدی بھی۔ اس ابدی زندگی کی کامیابی کے لیے اس دنیا میں محنت کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مومن کے لیے ارکان ایمان پر مفصل طور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ارکان پر جس قدر ایمان مضبوط ہوگا اسی قدر انسان پرسکون زندگی گزار سکے گا۔ جس قدر ان ارکان پر ایمان کمزور ہوگا اسی قدر انسان کا ذہنی اور قلبی سکون کمزور ہوگا۔

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل رقم: ۲۷)

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب تک ایمان کے نتیجے میں انسان نیک اعمال کرنے کے لیے تیار نہ ہو اس وقت تک وہ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان کے نتیجے میں انسان کا اعمال صالحہ کے لیے تیار ہونا صحیح اور کامل ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایمان اگر انسان کی زندگی اس کے نیک اعمال کی صورت میں نمودار نہ ہو تو پھر یہ ایمان صحیح معنوں میں ایمان نہیں ہے اور اگر ایمان کے نتیجے میں انسان روزمرہ زندگی میں نیک اعمال کرنے لگتا ہے اور برائی سے بچنے لگ جاتا ہے تو پھر اس کا ایمان سچا اور صحیح ہے۔

مومن بننے کے بعد انسان کے ذہنی سکون اور جسمانی صفائی کے لیے چند اعمال فرض

کیے گئے ہیں تا کہ انسان عقیدے کی صفائی کے ساتھ جسمانی طور پر بھی پاک وصاف رہے اور اس کی تربیت اس انداز سے ہو جس کے نتیجے میں اس کے دل کی دنیا آباد ہو جائے دوسرے معنوں میں اس کا ضمیر زندہ بیدار رہے۔ تقویٰ، احساس ذمہ داری، جیسی نیک صفات سے اس کا اندر یعنی باطن مزین رہے۔

ان اعمال میں سے پہلا عمل روزانہ پانچ دفعہ نماز پڑھنا ہے۔

(بخاری، کتاب الایمان باب ۴۰ آداء الخمس من الایمان)

سال میں ایک ماہ فرض روزے رکھنا ہیں۔

(بخاری، کتاب الایمان باب ۴۰ آداء الخمس من الایمان)

اس طرح پوری زندگی میں ایک دفعہ حج بیت اللہ بھی اسلام کے ارکان میں سے ہیں۔

یہ عمل درحقیقت علاقائیت، ذات پات، رنگ ونسل اور زبان کی بنیاد پر انسانوں کے اندر فرق کرنے کی غلاظت کے خلاف جنگ ہے اور انسانی اخوت اور اسلام اور ایمان کی بنیاد پر بھائی چارے اور دوستی کا ماحول پیدا کرتا ہے۔

ضروریات زندگی سے زیادہ مال پر سال میں ایک دفعہ ڈھائی فی صد کی زکوٰۃ دینا اسلام کا اہم رکن ہے۔ یہ درحقیقت بخل، حرص و لالچ، خودغرضی اور شقاوت قلبی جیسی باطنی آلودگیوں (Pollution) کا علاج ہے۔ (التوبہ:۱۰۳)

اس سے انسان کے اندر اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی اسلام کا ایک اہم ترین عمل ہے۔ یہ درحقیقت اُس آلودگی (Pollution) کا علاج ہے۔ جو انسان کے اندر بدی، استحصال، ظلم، غضب، بداخلاقی اور دوسری برائیوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ بدکرداری دراصل وہ خرابی اور آلودگی (Pollution) ہے جس کو ختم کرنے کے لیے جہاد فرض کیا گیا۔ (یوسف:۵۳)

اس سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک کی غیر موجودگی میں دوسرے کا وجود بے معنی ہے۔ گویا ایک مومن کو لازمی طور پر مسلمان بننے کی ضرورت ہے اور ایک مسلمان کو لازمی طور پر مومن بننے کی ضرورت ہے۔ ذہن وقلب کی صفائی کے بعد اسلام جسمانی یعنی ظاہری صفائی پر بھی زور دیتا ہے اور اس کا نتیجہ ذہنی اور قلبی صفائی کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ نماز کی ادائیگی کے لیے وضو کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے وضو کے بغیر نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ وضو کے لیے صاف اور پاک

پانی کی ضرورت ہے، وضو کے لیے ہاتھ دھونا، کلی کرنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف کرنا، چہرہ دھونا، کہنیوں تک ہاتھ کا دھونا اور پاؤں کا دھونا لازمی ہے، اس کا نام وضو ہے۔ اگر ایک مسلمان روزانہ پانچ دفعہ اس عمل کو دھرائے تو اس کے اعضاء کسی حالت میں بھی غلیظ نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی اپنے گھر کے سامنے موجود ایک نہر میں روزانہ پانچ دفعہ نہائے تو کیا اس کے جسم پر میل رہ سکتا ہے؟ جواب لازمی طور نفی میں ہوگا۔

(بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب الصوات "الخمسه کفاره" رقم:۵۲۸)

اور یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ "صاف ذہن" صاف جسم کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔

نبی پاک e نے مسلمانوں کو ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ نماز جمعہ سے پہلے نہانے کا حکم دیا۔ (بخاری، کتاب الجمعۃ، باب ۳، الطیب للجمعۃ، رقم: ۸۸۰)

- تا کہ نماز جمعہ صاف ستھرے جسم کے ساتھ پڑھی جائے۔ مسلمانوں کو یہ بھی حکم ہے کہ اپنا لباس پاک وصاف رکھیں بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ نماز کے لیے ضروری شرائط میں لباس، جسم اور جگہ کی صفائی و پاکیزگی بھی شامل ہے۔

اسلام میں جسمانی صفائی (پاکیزگی) کی بڑی تاکید آئی ہے۔ یہاں تک کہ جنابت کی صورت میں غسل کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ حالت جنابت میں نہ کوئی نماز پڑھ سکتا ہے نہ مسجد کے اندر جا سکتا ہے اور نہ قرآن پاک کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔ (الواقعہ:۷۹)

مسجد کے ماحول کو پاک وصاف رکھنے کی بھی تاکید ہے۔ مسجد کے اندر داخل ہوتے ہوئے صاف، پاک، لباس پہننا ضروری ہے۔ (الاعراف:۳۱)

بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے مثلاً لہسن وغیرہ۔

(مسلم، کتاب المساجد، رقم: ۶۸ ص ۷۶۴)

الغرض پاکیزگی کی تاکید اور غلاظتوں سے اجتناب پر اسلام نے زور دیا ہے۔ اس لیے نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں ہر ایک کے لیے فطرتی ہیں۔ ختنہ، زیر ناف بال صاف کرنا، ناخن کاٹنا، بغل کے بال صاف کرنا اور مونچھیں کترنا۔

(بخاری، کتاب اللباس، باب نمبر: ۶۳-۶۴)

ماحول اور پانی

صفائی اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ایک ہی دفعہ مسلسل پانی پینے سے روکا ہے۔ بلکہ آرام واطمینان کے ساتھ بیٹھ کر تین گھونٹ میں پانی پینے

کی تاکید کی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں پانی پینے سے کبھی کبھار پانی کے اندر سانس لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور اس وقت سانس منہ سے نہیں ناک سے پانی کے اندر لی جاتی ہے جس سے پانی کے اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ مل جاتی ہے اور اس کا پینا صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔

اس طرح پانی کے اندر پھونکنا یا گرم چیز کو پھونک کر ٹھنڈی کرنا بھی ممنوع ہے جس کی بنیادی وجہ ان کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا شامل ہونا ہے نبی پاک e نے ماحول کو صاف اور پاک رکھنے کے لیے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ کھڑے ہوئے پانی میں پیشاب یا گندگی ڈالنا سخت منع ہے، اس عمل سے رکے ہوئے پانی کو بھی پاک و صاف رکھنے کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے تا کہ وقت ضرورت وہ پانی استعمال کے قابل رہے اس طرح برتن میں موجود پانی میں نیند سے اٹھ کر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ اس سے دوسرے برتن میں پانی لے کر ہاتھ منہ دھونے چاہئیں۔

(بخاری، کتاب الوضوٗ باب ۶۸، البول فی الماء الدائم رقم: ۲۳۹)

جس برتن میں استعمال کا پانی ہو اس کو ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مشکیزے کا منہ بند رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور کھانے کے برتنوں کو ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریکی میں پانی پینے سے اس لیے روک دیا گیا ہے کہیں اس میں کوئی مضر چیز گری ہو جو پانی کے ساتھ پیٹ میں نہ چلی جائے اور انسان بیمار نہ ہو جائے اس لیے پانی برتن کو دھو کر پینا چاہیے۔

ماحول اور اخلاق

ماحول کو خوش گوار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دیں جھوٹ بول کر حقیقت کو نہ چھپائیں جس سے دوسرے کی حق تلفی ہو اور اس کے نتیجے میں ماحول میں گھٹن پیدا ہو۔ اسلام نے فرائض (ذمہ داری) کی ادائیگی پر زور دیا ہے تا کہ اس کے نتیجے میں لوگوں کے حقوق ادا ہوں اور جب حقوق ادا ہوں اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ برتے تو ماحول پر امن اور خوش گوار رہتا ہے۔ جس میں لوگ خوشی اور اطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب ۲۵، علامات النبوۃ فی السلام)

اسلام نے غیبت اور الزام تراشی سے بھی روکا ہے۔ (الحجرات: ۱۲)

تا کہ لوگوں کی عزت و آبرو کا تحفظ ہو۔ بدکاری اور فحاشی سے اس لیے روکا ہے کہ ایسا کرنے سے خاندانوں اور افراد کی ناک کٹ جاتی ہے۔ اور معاشرے کے لیے ایسے افراد پیدا

ہوتے ہیں جس کی کفالت کی ذمہ داری کسی معین شخص پر نہیں آتی اور جس کے نتیجے میں وراثت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے وہ تمام راستے بند کر دیئے ہیں جو اس شنیع عمل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً پردے کا حکم دیا گیا، عورتوں کو زیادہ گھر کے اندر رہنے کی تلقین کی گئی، مخلوط اور آزاد میل جول سے روکا گیا، مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا اور عورتوں کو بھی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ (النور:۳۱)

عورتوں کے تنہا گھر سے نکلنے پر پابندی لگائی گئی اور غیر محرم رشتہ دار کے سامنے آنے سے منع کیا گیا کسی بھی غیر محرم سے تنہائی میں ملنا غیر اسلامی عمل قرار دیا گیا۔

چوری سے اس لیے روکا گیا کہ لوگوں کے مال کا تحفظ ہو جائے، نشہ آور اشیاء سے اس لیے روکا گیا کہ عقل کی حفاظت ہو اور معاشرے میں مخبوط الحواس اور دیوانے لوگوں کا راستہ روکا جا سکے اور معاشرہ پرامن اور خوش گوار رہے۔

ماحول اور گزرگاہیں

جغرافیائی ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے اسلامی تعلیمات واضح ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان کی ستر سے کچھ زائد شاخیں ہیں اعلیٰ شاخ کلمہ طیبہ ہے اور ادنیٰ شاخ راستے سے اذیت دہ چیز کا ہٹانا ہے۔

(مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان، ۵۷-۵۸)

اذیت دہ چیزوں میں غلاظت، گندگی، کانٹے، پتھر، رکاوٹ، بول و براز، مردہ جانور وغیرہ سب شامل ہیں۔ اسلام نے ان اشیاء کو ہٹانا، راستے کو پاک صاف رکھنا ایمان کی شاخ قرار دیا ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان جہاں جہاں بھی جائے یا جہاں سکونت پذیر ہو وہ علاقے پاک صاف رہیں۔

آپ ﷺ نے ہڈی وغیرہ کے ہٹانے کو صدقہ قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے راستے کا ماحول متاثر ہوتا ہے، راہ گیروں کی آمد و رفت مشکل ہو جاتی ہے لہٰذا ان رکاوٹوں کو ہٹانا ضروری ہے۔ تاکہ ذہنی سکون و اطمینان بھی مل جائے اور ماحول آلودگی سے پاک رہے۔

مذکورہ ارشادات نبویہ ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ گلیوں، راستوں، سڑکوں اور شاہراہوں پر غلاظت، گندگی اور اذیت ناک چیزیں نہ ڈالی جائیں اور بدبودار غلیظ، گند اور مردار اشیاء وہاں سے ہٹائی جائیں۔ یہ ہر مسلمان کی اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو اذیت نہ دے بلکہ انہیں اذیت رساں اشیاء سے بچانے کی ہر ممکن

کوشش کرے۔

آپ ﷺ نے لوگ لوگوں کے آرام کے لیے سڑکوں، شاہراہوں کے کناروں پر مساجد اور سرائے بنانے کا حکم دیا ہے تا کہ سیاحوں اور مسافروں کو نماز پڑھنے اور آرام کرنے کی سہولت میسر رہے۔

اسلام کی تعلیم یہ بھی ہے کہ شاہراہیں اور راستے محفوظ اور ہموار بنائے جائیں۔ نبی پاک ﷺ نے لوگوں کو گلیوں، راستوں، سڑکوں اور شاہراہوں پر بیٹھنے، نماز پڑھنے اور رکاوٹ پیدا کرنے اور بول و براز سے منع فرمایا۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب ۲۱ النھی عن الخلاء ص ۲۴۹۷)

اس سے ماحول گندا ہوتا ہے اور لوگوں کے آرام میں خلل پڑنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ یہ اعمال اسلام کی تعلیمات سے متصادم بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے گزرگاہوں میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے اور لوگوں کی آمد و رفت میں مخل ہونے سے باز رہنے کی تعلیم دی ہے۔

اس حکم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سڑکوں اور گزرگاہوں میں تجاوزات کرنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے لہٰذا تجاوزات کو دور کرنا اسلامی تعلیمات میں شامل ہے۔ آپ ﷺ نے تمام گزرگاہوں کے کنارے سیاحوں، مسافروں کی قیام گاہوں کو کشادہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ گزرگاہوں کو تنگ و تاریک نہ رکھا جائے اور نہ انہیں بند کیا جائے۔

آپ ﷺ نے گزرگاہوں کے درمیان بیٹھ کر آمد و رفت میں خلل ڈالنے کو منع فرمایا اور اگر کسی کو ضرورت کی بناء پر ایسا کرنا پڑے تو اس کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے کہ راہ گزر خواتین کو تنگ نہ کرے۔ کسی کو تکلیف اور اذیت نہ دے، راہ گیر کے سلام کا جواب دے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔

(بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام، رقم: ۶۲۲۷)

موٹر یا کسی دوسری گاڑی میں سفر کرتے وقت چھلکے یا غیر ضروری اشیاء سڑک یا شاہراہوں پر ڈالنا ایک غیر مہذب اور ناپسندیدہ عمل ہے اس سے ماحول گندا ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ایسا عمل غیر ذمہ دارانہ ہے جس کو کسی صورت پسند نہیں کیا جاتا۔

جدید ترین اسلحہ کا حصول اور اسلام

محمد مقبول الرحمٰن

آج کے دور میں ایٹمی اور جدید جنگی ساز و سامان کی اہمیت وافادیت کسی صاحب عقل وفہم سے پوشیدہ نہیں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق آج امریکہ اور اس سے پہلے روس اور اب مختلف ممالک کی غیر مسلم اور نسبتاً چھوٹے اور غریب ممالک پر برتری کون نہیں جانتا۔ امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو شہروں (ہیروشیما و ناگاساکی) پر ایٹم بم برسائے اور لاکھوں انسانی جانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اسی طرح امریکہ اپنی چودھراہٹ برقرار رکھنے کیلئے خصوصاً مسلم ممالک کو وقتاً فوقتاً اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ لیبیا پر تشدد کس کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ امریکہ کی اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے لیبیا آج تک مختلف قسم کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ سوڈان پر ڈھائے جانے والے مظالم کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ سوڈان میں تو چن چن کر دودھ بنانے والی فیکٹریوں اور معصوم بچوں کو نشانہ بنایا گیا۔ مملکت اسلامیہ افغانستان پر پہلے روس نے اپنی درندگی کی انتہا کر دی تھی پھر جو اس کے بعد ہوا وہ ایک الگ داستان ہے۔ ۱۹۹۱ء میں امریکہ تیل کی آڑ میں کویت اور عراق کے درمیان جنگ کروا کے پھر بندر کی طرح خود فیصلہ کرنے کے لئے کود پڑا اور اپنی اقوام متحدہ سے اجازت لے کر دیگر ۳۲ ممالک کو اتحادی بنا کر عراق پر درندگی کی انتہا کر دی۔ امریکہ نے عرب مجاہد اسامہ بن لادن کی آڑ میں جو کھیل افغانستان میں کھیلا انسانیت کپکپا اٹھی، کائنات لرز گئی اور اس وقت ظلم وستم کی انتہا عراق پر ہو رہی ہے۔ یہ سب مثالیں انتہائی اختصار سے پیش کیں تاکہ مختصری تاریخ ذہن نشین رہے۔ یہ تمام واقعات ہماری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اقتصادی اور معاشی اور بالخصوص جدید اسلحہ میں خود کفالت کی ہے۔ اگر جاپان کے پاس ایٹم بم ہوتا تو کیا امریکہ اسی طرح سلامت رہتا۔ اسی طرح جملہ اسلامی ممالک

اگر ایٹم بم اور جدید میزائل سازی میں خود کفیل ہوتے تو کیا امریکہ اور دیگر جارح ممالک صحیح سلامت رہتے اور اسی طرح جہاں چاہا بمباری کی اور تباہی پھیلا دی۔ ایسا کبھی نہ ہوتا۔ اب امریکہ اپنی اجارہ داری کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب اسے پوری دنیا چڑھ دوڑنے کا چسکا پڑ چکا ہے۔

دنیا میں کمزور اور غریب ممالک کو حقوق و انصاف دلانے والا کوئی ادارہ یا تنظیم نہیں ہے۔ بالخصوص عالم اسلام کا کوئی پرسان حال نہیں۔ دشمن اپنے مفاد میں تو مسلمانوں کو استعمال کرتا رہا اور کر رہا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ طفل تسلیاں ہی دیتا رہا۔ مشرقی تیمور کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں اکثریت نصاریٰ کی تھی مہینوں میں نہیں دنوں میں خود اقوام متحدہ نے وہاں ریفرنڈم کا رونا پیٹا اور مشرقی تیمور کو مملکت اسلامیہ انڈونیشیا سے الگ کر کے عیسائی ریاست بنا دیا۔ دوسری طرف کشمیر میں ۵۵ سالوں سے بھارتی جبر و تسلط اور تشدد کیا جا رہا ہے اور خود ۱۹۴۸ء میں بھارت اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے گیا مسٹر نہرو وغیرہ نے اس وقت مانا کہ کشمیر میں امن ہونے کے بعد رائے شماری کروائی جائے گی لیکن صد افسوس آج تک یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی فائل میں سڑ رہا ہے لیکن اسے حل نہ کیا گیا۔ نیز ۸ لاکھ سے زیادہ بھارتی فوج مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ کشمیر میں واضح اکثریت مسلمانوں کی ہے قاعدے کے اعتبار سے انہیں حق خود ارادیت ملنا چاہئے نیز حق خود ارادیت پر کئی قرار دادیں موجود ہیں اور لاتعداد یادداشتیں ہر سال مختلف ممالک میں اقوام متحدہ کے نمائندوں کو پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن ان پر کوئی غور و فکر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ اسی لئے یہ مذکورہ مسئلہ جوں کا توں ہی ہے۔

مسئلہ مشرقی تیمور اور کشمیر میں کئی اعتبار سے مماثلث ہونے کے باوجود یہ فرق اپنی جگہ موجود ہے کہ مشرقی تیمور نصاریٰ اور کشمیر خالص مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ ذرا عرب کی طرف دیکھئے اسرائیل کس طرح فلسطین کے نہتے مسلمانوں پر تشدد کر رہا ہے یہ امریکہ کا لے پالک بچہ ہے کیا مجال اقوام متحدہ سمیت کوئی ادارہ اسے اپنی درندگی سے باز رکھ سکے۔ پس خون مسلم ارزاں ہے یہ پانی کی طرح بہتا رہے تو پرواہ نہیں۔ اگر امت مسلمہ اپنی رہبری و رہنمائی کے لئے قرآن مجید کے احکام کو نافذ کرتی، اسے پڑھتی اور سمجھتی تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا، صورت حال مختلف ہوتی، بازی کا کوئی اور حال ہوتا (یعنی مسلم قوم حاکم اور دشمنان اسلام محکوم) قرآن پاک میں رب کریم نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ: ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) تم بقدر استطاعت ان (سے مقابلہ) کیلئے ہتھیار تیار رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑے اور ان سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کر دو اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں

جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(الانفال:٦٠)

صاحب تفسیر بیان القرآن نے اپنی معرکۃ الآرا تفسیر میں جو لکھا میں وہی نقل کر رہا ہوں۔ لکھتے ہیں۔اس آیت میں قوت سے مراد اسلحہ کے تمام انواع و اقسام ہیں اور اس آیت کے دو محمل ہیں ایک یہ کہ جن دشمنان اسلام سے تمہارا مقابلہ ہو ان کے خلاف جو اسلحہ سب سے زیادہ مؤثر ہو اس اسلحہ کو مہیا کرو اور دوسرا محمل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ہتھیار سب سے زیادہ مہلک ہو اس ہتھیار کو حاصل کر لو۔عہد رسالت میں سب سے زیادہ مہلک ہتھیار تیر تھا اس لئے نبی ﷺ نے تیر اندازی سیکھنے اور تیر کمان کے حصول کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے۔آپ ﷺ نے منبر پر آیت مذکورہ کی تلاوت کی اور لفظ ''قوہ'' کی تفسیر میں فرمایا سنو! یقیناً قوت تیر اندازی ہے۔یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔آپ ﷺ نے تیر اندازی کی فضیلت کو بیان فرمایا کہ بے شک اللہ عزوجل ایک تیر کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا۔تیر بنانے والا، جو تیر بنانے میں ثواب کی نیت کرتا ہو اور تیر کو حاصل کرنے والا اور تیر اندازی کرنے والا۔''اس دور میں تیر اندازی کے مصداق ایٹمی میزائل ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ نے تیر اندازی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے۔کیونکہ اس زمانہ میں دشمن کے خلاف بہت بڑا اور بہت مؤثر ہتھیار تھا۔موجودہ زمانے میں تیر اندازی کی جدید شکل میزائل ہیں۔جس طرح تیر کو کمان میں رکھ کر ہدف پر مارتے ہیں اسی طرح میزائل وار ہیڈ میں ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نیوٹران بم رکھے جاتے ہیں۔اسی طرح لانچنگ پیڈ سے میزائل کو ہدف پر داغا جاتا ہے۔سو جس طرح اس زمانہ میں تیر اندازی کا علم حاصل کرنا اور اس کی مشق کرنا ضروری تھا اسی طرح اس زمانہ میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی تیاری کا علم حاصل کرنا اور میزائل بنانے کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کے زمانہ میں شدید مخالفت کے باوجود امریکہ نے روس یا چین پر ایٹمی حملہ کی جسارت نہیں کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کو ان ملکوں کے پاس بین البر اعظمی ایٹمی میزائل، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں اور امریکہ ان کی زد میں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی اپنی مذکورہ بالا تفسیر میں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حقائق کائنات میں غور و فکر کرنے اور تدبر اور تفکر کرنے کی ترغیب دی ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی حقائق کائنات میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ایک ساعت میں

تفکر کرنا ایک رات کے قیام سے افضل ہے۔ علامہ سعیدی لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ حقائق کائنات کا سراغ لگانا اس پر آشوب دور میں انسان کی ضرورت پوری کرنے کے اسباب اور علل کو جدید سائنس سے معلوم کرنا، انسان کی فلاح کے لئے مہلک اور لا علاج امراض کا جدید میڈیکل سائنس سے علاج دریافت کرنا اور ملک وقوم کے دماغ کے لئے عصری تقاضوں کے مطابق غور وفکر کر کے ایٹمی ہتھیار اور میزائل بنانا تاکہ مسلمانوں کا ملک دشمنان اسلام کے حملوں سے محفوظ رہے اور اقوام عالم میں عزت اور آزادی کے ساتھ کھڑا رہ سکے۔ ایسے امور کیلئے ایک لمحہ غور وفکر کرنا بھی ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے اور اس مذکورہ حدیث کا مصداق ہے۔

سو ملک کے تمام باشندوں کی عبادتوں اور ریاضتوں اور نیک اعمال کا وجود ملک کی بقا اور اس کی آزادی پر موقوف ہے اور اس کی بقاء اور آزادی عصری تقاضوں کے مطابق ایٹمی ہتھیار بنانے پر موقوف ہے تو جن مسلمان سائنسی ماہرین نے یہ ہتھیار (بم اور میزائل) بنائے اور اس کے بنانے میں جو تفکر کیا تو یہ تفکر بہت عظیم عبادت ہے اور ملک کے تمام عبادت گزاروں کی عبادتوں کے اجر وثواب سے ان کو بھی حصہ ملے گا۔ تاہم ہم ان سائنسی ایجادات کے خلاف ہیں جو عیاشی اور فحاشی کو فروغ دیتی ہیں۔

عہد رسالت اور بعد کے ادوار میں مجاہدین گھوڑوں پر بیٹھ کر جہاد کرتے اور دشمن ممالک کا سفر کرتے تھے۔ اس دور میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں کو گھوڑوں کے بدلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو دشمن ممالک پر حملہ کرنے کیلئے جنگی طیاروں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، فوجی ٹرک، اور لڑاکا طیارے ان سب کے حصول میں وہی اجر وثواب ہوگا جو پہلے گھوڑوں میں ہوتا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں

علم اور سائنس کی روشنی

تورا کینہ قاضی

مسلمانوں میں علمی اور سائنسی سرگرمیوں کی نشوونما اور ترقی کا آغاز عباسی خلافت کے بعد (۷۵۰ء تا ۱۰۰۰ء) میں ہوا۔ اس زمانے میں عباسی خلافت کا دارالحکومت بغداد اپنی ثقافتی ترقی، بین الاقوامی سیاسیات کے اہم ترین مرکز اور اپنی افسانوی امارت کے قصوں کی بدولت دنیا بھر میں اپنی شہرت اور شان وشوکت کا غلغلہ برپا کیے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں سائنس دانوں کی حیثیت اور اہمیت اور قدردانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہارون الرشید اور مامون کے درباری طبیب جبرائیل بن بختیشو نے نوکروڑ درہم کی جائیداد بنالی تھی خلیفہ کے ذاتی طبیب کی حیثیت سے اسے سال میں دومرتبہ خلیفہ کی فصد کھولنے پر دس لاکھ درہم دیے جاتے اور اتنی ہی رقم اسے چھ ماہ تک خلیفہ کو مسہل دواؤں کی خوراک دیتے رہنے پر ادا کی جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے عہد کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں علمی بیداری کی ایک نئی اور تدریجاً ترقی کرنے والی لہر، جو دنیا کی فکری وثقافتی داستان میں انتہائی معنی خیز اہمیت کی حامل گنی جاتی ہے، پیدا ہوئی۔ یہ بیداری بڑے پیمانے پر غیر ملکی واسطوں سے اور ان کے اثرات سے پیدا ہوئی تھی یونانی، فارسی، شامی اور سنسکرت کے عربی تراجم نے اس لہر کو اور بھی تیز کردیا تھا۔ مسلمان اپنی سائنس، فلسفے اور لٹریچر میں اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے لیکن ان میں علمی تجسس اور جستجو کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور نت نئے علوم سیکھنے کی گہری خواہش بھی موجود تھی اس امر سے وہ قدیم علماء وحکماء کے صحیح وارث بنے اور اقوام کو جن کا انہوں نے سامنا کیا یا جن کو انہوں نے مسخر کیا، زیادہ مہذب ومتمدن بننے میں مدد دی۔

ابوبکر محمد زکریا الرازی (۸۶۵ء تا ۹۲۸ء) پہلے عظیم محقق تھے جب وہ ایران میں تھے تو انہوں نے دس جلدوں میں ایک بے حد جامع اور وقیع کتاب الطب المنصوری تحریر کی جس کا پندرھویں صدی میں اٹلی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ انہوں نے خسرہ اور چیچک پر بھی تحقیقی

رسائل تحریر کیے جو علم طب میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے چیچک کی وجوہات پر روشنی ڈالی اور اس کا علاج اور ضروری پرہیز بتایا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ الحاوی سمجھا جاتا ہے۔ جس کا پہلی بار ۱۲۷۹ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور Continues کے نام سے یہ کتاب ۱۴۸۴ء کے بعد بار بار شائع ہوتی رہی۔ اس کا پانچواں ایڈیشن ۱۵۲۲ء میں وینس میں شائع ہوا یہ کتاب غیر مسلم اور مسلم دونوں کے علمی کارناموں پر لکھی گئی ہے۔ الرازی کا یہ قابل قدر طبی تحقیقاتی کام صدیوں تک لاطینی یورپ میں اپنا گہرا اثر مرتب کیے رہا اور الرازی کو جراحی میں ڈورے یا بتی کا موجد تو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ڈورا یا بتی زخم چیرے جانے کے بعد اس میں سے فاسد مواد کے اخراج اور زخم کھلا رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے طب روحانی کی اصطلاح استعمال کی، جسے مغربیوں نے بعد میں سائیکو تھراپی بنا لیا۔ علم کیمیا کے میدان میں الرازی کا اہم ترین کارنامہ کتاب الاسرار ہے جس کے کئی ایڈیشن طبع ہوئے اور بالآخر اسے ۱۱۸۷ء میں جیرارڈ آف کریمونا نے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ کتاب آگے چل کر یورپ میں کیمیائی علوم کی ترویج وحصول کا سب سے بڑا ذریعہ بنی۔

الرازی کے بعد مسلم طب کی ایک اور بے حد جلیل القدر اور قد آور شخصیت بوعلی سینا کی ہے۔ ایک نوجوان طبیب کی حیثیت سے انہوں نے بخارا کے سلطان نوح بن منصور (۹۷۶ء تا ۱۰۹۷ء) کا کامیاب علاج کیا جس پر انہیں سلطان کے عظیم الشان کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت مل گئی۔ جس میں اس زمانے کا ہر قسم کا سائنسی لٹریچر موجود تھا ان کی قابل ذکر تصنیفات میں کتاب الشفاء خاص اہمیت کی حامل گنی جاتی ہے یہ ایک فلسفیانہ انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں مسلم فکر اور مابعد افلاطونی ترقیات کی ترمیم واصلاح کی بنیاد ارسطوی روایات پر رکھی گئی ہے۔ ان کی ایک دوسری کتاب القانون فی الطب ہے جس میں اس وقت کے معیاری طبی فکر کی حتمی قوانینی ترتیب کی گئی ہے۔ القانون کا ترجمہ بارھویں صدی میں مغربی ترجمہ نگار جیرارڈ آف کریموٹا نے لاطینی زبان میں کیا یہ کتاب فوراً ہی جالینوس اور الرازی کے کاموں کے مقابلے میں، جو اس زمانے میں یونانی طب میں انتہائی مستند سمجھے جاتے تھے، طبی لٹریچر میں ایک کلاسیکی کام کی حیثیت سے شرف قبولیت پا گئی۔ اس کتاب کو یورپی سکولوں میں علم طب کی نصابی کتاب کی حیثیت سے رائج کیا گیا اور یہ بارھویں تا سترھویں صدی تک طبی سائنس کے لیے ایک راہنما کتاب بنی رہی۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تپ دق کو ایک متعدی مرض قرار دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ بہت سی بیماریاں پانی اور مٹی کی بدولت پھیلتی تھیں اس میں پہلی مرتبہ پھیپھڑوں کے درمیان کی جگہ کی بیماری MEDIASTINTS اور پلورسی کے مابین فرق کو واضح کیا گیا تھا اور خون کی کمی اور منہ کی

اندرونی سوجن کی سائنسی بنیاد پر تشخیص کی گئی تھی کہ ان بیماریوں کا سبب انتڑیوں کے کیڑے تھے علی بن عباس المجوسی نے بال جیسی باریک رگوں کے تصور کو آگے بڑھایا اور ثابت کیا کہ بچے کی پیدائش کے وقت بچہ از خود بطن مادر سے باہر نہیں آتا، بلکہ بطن کے بعض عضلات کے سکڑاؤ اور پھیلاؤ کے سبب اس کی ولادت ممکن ہوتی ہے۔ ابن رشد کی میدان طب کی سب سے بڑی خدمت ان کا عظیم کام بعنوان الکلیات فی الطب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو ایک مرتبہ چیچک ہو جائے تو اسے دوسری بار ہرگز یہ بیماری لاحق نہ ہوگی بلکہ وہ عمر بھر کے لیے اس بیماری سے محفوظ ہو جائے گا۔ اس نے آنکھ کی پتلی کی کارکردگی کی بھی وضاحت وتشریح کی۔ الزہری گیارھویں صدی میں ایک عظیم مسلم جراح ہو گزرے ہیں انہوں نے زخم سینے کے نئے طریقوں، مثانے کی پتھری توڑنے اور جانوروں کے جسم کی چیر پھاڑ کی اہمیت سے طبی دنیا کو روشناس کرایا۔ ان کے کاموں کا ترجمہ بھی جیرارڈ آف کریمونا نے لاطینی زبان میں کیا اور اس کے بہت سے ایڈیشن ۱۴۹۷ء میں وینس میں ۱۵۴۱ء میں باسل میں اور ۱۷۷۸ء میں آکسفورڈ میں طبع ہوئے۔ الزہری کی کتابوں میں اوزاروں کے نقشے بنے ہوئے تھے جنہوں نے یورپ میں سرجری کی بنیاد ڈالی۔ عمار بن علی المسیب نے ہلکے موتیا بند کا علاج اپنی بنائی ہوئی کھوکھلی ٹیوب سے انجذاب کے ذریعے تجویز کیا انہوں نے جب ایک ایک چشم آدمی کے موتیا بند کا علاج اسی طریقے سے کامیابی سے کیا تو خلیفہ ابن ابوالحسن ان کی مہارت کا معترف ہو گیا علی بن النفیس نے خون کے پلونری سرکولیشن (PULMONARY CIRCULATION) کا ایک صاف اور واضح نظریہ پیش کیا جسے تین سو سال بعد پرتگال میں سرولس نامی طبیب نے دوبارہ پیش کیا اور اس وجہ سے مغرب میں وہی اس نظریے کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ زمین کے محیط کے تعین کے لیے المامون کے ماہرین فلکیات نے زمین کی پیائش کا محیر العقول کارنامہ انجام دیا انہوں نے دریائے فرات کے شمال میں سنجرک میدان میں ارضی پیائش کا کام کیا اس میں ایک میریڈین ڈگری کے طول کا اندازہ ۶۶۷ء ۵۶ میل کے حساب سے لگایا اور یہ پیائش حیرت انگیز طور پر درست تھی البتہ اس میں اصل طول سے ۲۸۷۷ فٹ زیادہ گنے گئے تھے۔ البطانی (۸۷۷ء تا ۹۱۸ء) ایک حقیقی محقق سائنس دان تھا جس نے بطلیموس کے کاموں میں تصحیح کی اور چاند اور دیگر اجرام فلکی کے مداروں کا صحیح تعین کیا اس نے دائرے کی صورت میں سورج کے گرہنوں کی ممکنات کو ثابت کیا اور نئے چاند کے بصری تعین کے قدیم نظریات کو بھی پیش کیا اس نے پہلی مرتبہ ٹرگنومیٹری، الجبرا اور تجزیاتی جیومیٹری جیسے علوم کو قبول عام کی سند دلانے کی کوشش کی۔ البیرونی علوم فلکیات کے میدان میں مسلمانوں کی ایک انتہائی اہم سائنسی شخصیت گنا جاتا ہے۔ اس نے ناقابل تردید دلائل سے زمین کے اپنے محور کے گرد گھومنے

کے پرانے متنازعہ نظریے پر بحث کی اور طول بلد کا صحیح تعین کیا اس نے اٹھارہ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے صحیح اوزان کا تعین کیا۔ عمر خیام اور اس کے معاونین کی تحقیقات کی بدولت ایک کیلنڈر وجود میں آیا جو جارجین کیلنڈر سے بھی زیادہ صحیح تھا جارجین کیلنڈر میں ۳۳۳۰ سالوں میں ایک دن کی غلطی تھی جبکہ خیام کے کیلنڈر میں ۵۰۰۰ سالوں میں ایک دن کی غلطی تھی۔ الخوارزی ریاضیات کی ابتدائی تاریخ کی ایک انتہائی قدر آور شخصیت ہے اس نے پہلی بار فلکیاتی جدول بنایا اور حساب اور الجبرا کے قدیم کاموں کی تدوین کی۔ اس کی کتاب حساب الجبر و القابلہ میں آٹھ سو مثالیں پیش کی گئی تھیں اور اس کتاب کو اس کا عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بارھویں صدی میں جیرارڈ آف کریمونا نے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کتابیں یورپی یونیورسٹیوں میں ایک اہم نصابی کتاب کی حیثیت سے سولھویں صدی تک پڑھائی جاتی رہیں اس کتاب کی بدولت یورپ الجبریائی سائنس سے متعارف ہوا۔ الخوارزی کے کاموں کی بدولت یورپ عربی اعداد شماری سے بھی جو اس کے نام پر ALGORSM کہلاتے تھے، متعارف ہوا۔ بعد کے مسلمان ریاضی دانوں میں ایک عمر خیام تھا جس نے دوسرے درجے کی مساوات کے ذریعے جیومیٹریائی اور الجبریائی حل پیش کیے اس نے مساوات کی بہترین حلقہ بندی بھی کی۔ مسلمانوں نے علم کیمیا کے میدان میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں انہوں نے یونانیوں کے ''اٹکل پچو'' اور الجھے ہوئے غور وفکر کے مقابلے میں تجرباتی کاموں کو روشناس کرایا۔ مسلمان کیمیا دان حقائق کے اجتماع میں سخت محنت کرنے والے اور عناصر کے مشاہدے میں سچے ہوتے تھے ہر چند کہ وہ حتمی نظریہ تجویز کرنے اور سائنسی نتائج اخذ کرنے میں کمزور تھے مسلم کیمیاء کا باپ جابر بن حیان آٹھویں صدی میں ہو گزرا ہے۔ اس نے تجربے کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کروایا اور علیم کیمیا کی تھیوری اور پریکٹس دونوں میں اہم خدمات انجام دیں اس نے تبخیر، اخراج جوہر، دھاتوں کے پگھلاؤ اور قلم پذیری کے طریقوں کی اصلاح کی اور سائنسی طور پر کیمیا کے طریق عمل کے دو اصول بیان کیے یعنی تکلیس اور تقلیل۔ حیوانات اور انسانیت کے علوم میں پہلا مسلمان سائنس دان الجامعن نویں صدی میں گزرا ہے۔ اس کے کام جن میں اس نے ارسطوی تعلیمات کے حوالے بھی دیے ہیں، ارتقا اور حیوانی نفسیات سے متعلق ہیں دسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی کتاب اخوان الصفا میں ایسے کائناتی چکروں (COSMIC CYCLES) کا نظریہ پیش کیا گیا جن سے صحرا سر سبز وشاداب زمینوں میں سر سبز وشاداب زمینیں صحراؤں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور پہاڑی علاقے سمندروں میں اور سمندر پہاڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یا وقت بن عبداللہ الحموی نے بارھویں صدی میں ایک جیوگرافیکل ڈکشنری مدون کی جس میں جگہوں کے نام حروف ابجد کی

ترتیب سے دیے گئے تھے۔ یہ ایک ایسا جامع اور وقیع انسائیکلو پیڈیا تھا جس میں اس عہد کی تمام جغرافیائی اور تاریخی قیمتی معلومات، اتھنوگرافی اور نیچرل سائنس کو سمیٹ دیا گیا تھا۔ عبدالرحمان ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) نے قومی عروج، ترقی و زوال کے قوانین بنانے کی کوشش کی اور تاریخ کا حقیقی حلقہ اثر اور فطرت دریافت کی۔ اسے سوشیالوجی سائنس کا حقیقی بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ کسی بھی مسلم یا یورپین نے ابن خلدون کی مانند مطالعہ تاریخ کو بیک وقت ایسے جامع اور فلاسفیکل انداز میں نہیں لیا۔ مسلم فلسفے کے ابتدائی دور میں جو بڑے نام سامنے آتے ہیں وہ الکندی، الفارابی اور ارسطو کے نظریات میں ہم آہنگی لانے کا کام شروع کیا اور اس نے فیثا غورثی ریاضیات کو تمام سائنسوں کی بنیاد قرار دیا۔ بصریات پر اس کی تحقیقات کو مسلم اور یورپی ممالک میں وسیع پیمانے پر قبولیت حاصل رہی۔ بعد میں ابن الہیثم ۹۶۵ء میں پیدا ہوا تھا اس نے بطلیموس اور اقلیدس کے اس نظریے کی تردید کی کہ آنکھ سے نوری شعاعیں نکل کر دیکھی جانے والی چیزوں کی طرف جاتی ہیں اس نے آئینے میں کسی چیز کی صورتوں میں عکس بننے پر تجربات کیے۔ اپنے بعض تجربات کی بنیاد پر اس نے عدسے کا تصور پیش کیا جس سے تصویریں بڑی نظر آئیں۔ ایسے عدسے تین صدیوں بعد اٹلی میں تیار ہوئے۔ فلسفہ یونانی کو اسلامی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلسلہ جو الکندی نے شروع کیا تھا اسے فارابی نے بھی جاری رکھا۔

دسویں صدی میں معتزلہ فرقے کے لیڈروں میں النظام کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے جس نے کہا تھا کہ تشکیک ہر علم کی پہلی اور مکمل ضرورت ہے۔ جس شخص نے معتزلہ عقائد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اور پرانے نقطہ نظر کو پھر سے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، وہ ابوالحسن الاشعری ہیں، انہوں نے بلا کیف کا نظریہ دیا جس کے مطابق مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بغیر کسی رد و کد کے قرآن حکیم کے مثالی پیرائے میں دی گئی تشریحات قبول کرلیں۔ اس اصول بلا کیف نے کچھ مفکرین کی نگاہ میں سائنسی ریسرچ اور آزادانہ سوچ و فکر پر مایوس کن اثرات مرتب کیے۔ الاشعری کے بعد الغزالی کا نام سامنے آتا ہے جو ۱۰۵۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ء میں انتقال کیا۔ ان کی بدولت تقلید پسندانہ عقائد یا کٹر عقائد (ORTHODOX) تعبیر اور استنباط بلند سطح پر پہنچ گئے ان کے کاموں نے فقہ کی اہمیت گھٹا دی اور اسے اس بلند مقام سے محروم کر دیا جو اسے پہلے حاصل تھا۔ انہوں نے یونانی زبان کو ایک افادی نظام کے رائج کرنے کے لیے ضروری قرار دیا۔ یہ الغزالی کا ایک زندہ جاوید کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے دو مکاتب فکر، یونانی فلسفہ اور توحیدی مذہب کے مابین مصالحانہ فضا پیدا کی اور انہیں یورپ میں ہم آہنگ عقائد بنا کر پیش کیا۔ اپنی

رسائی میں الغزالی عقیدے اور عقلیت کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۱۵۰ء سے قبل الغزالی کے کچھ کاموں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ان کے کاموں نے یہودی اور عیسائی مکاتب فکر کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ تھامس ایکوینس اور پاسکل بڑی حد تک غزالی کے نظریات سے متاثر تھے جو قدیم مسیحی عقائد کے بالکل قریب معلوم ہوتے تھے۔ پروفیسر حتی کے بیان کے مطابق الغزالی نے علیت کا جو خول تعمیر کیا اس نے مسلمانوں کو آج تک کے زمانے کے لیے اپنے اندر مقید کر ڈالا۔ جبکہ مسیحی دنیا اس خول کو اسی کی علیت کے ذریعے بالخصوص پروٹسٹنٹ انقلاب کے ذریعے توڑنے میں کامیاب ہو چکی ہے اور اسی وقت سے مشرق و مغرب کے مابین بُعد پیدا ہو گیا ہے۔ مغرب سائنسی میدان میں روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ جبکہ مشرق ساکن پارٹی کی طرح اپنی جگہ پر ابھی تک ٹھہرا ہے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کا حصہ

محمد زکریا ورک

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا عرصہ ۱۴۰۰ء سے ۱۵۰۰ تک محیط ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے ظہور پذیر ہونے میں چار عوامل کار فرما تھے (۱) یونان کے عالموں کے عہد قدیم کی کتابوں کی بازیابی (۲) چرچ کی سیاسی اتھارٹی اور علمی اثر پزیری میں کمی (۳) نئی دنیا کی دریافت اور (۴) پرنٹنگ پریس کی ایجاد۔ جہاں تک یونانی عہد قدیم کے عالموں کی کتابوں کی بازیابی کا تعلق ہے، اپنوں اور غیروں نے اس بات کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا ہے کہ عرب مسلمانوں ہی نے یونانی لٹریچر کو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچایا، بلکہ آٹھویں صدی کے بغداد میں ان کتابوں کے تراجم کر کے ان میں خود بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مسلمانوں نے جن یونانی عالموں کی کتابوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہونے سے بچایا، ان میں سے بطلیموس، اقلیدس، ارشمیدس، ارسطو، بقراط، افلاطون وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اصل یونانی زبان میں تو نادر کتابیں ناپید ہو گئیں، مگر عربی زبان میں محفوظ ہو گئیں جیسے بطلیموس کی کتاب المجسطی (Megale Syntaxis)۔

نشاۃ ثانیہ کا آغاز بھی ایسے ہوا کہ جب مسلمانوں پر ادبار آیا، تو اٹلی، جرمنی، فرانس، اسپین اور برطانیہ کے اسکالرز نے بارہویں صدی میں عربی زبان سیکھ کر ان کتابوں کی یورپ کی زبانوں، لاطینی، عبرانی، فرنچ، انگلش میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس بات کا اعتراف اسٹینلے لین پول نے کتاب یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ششم میں گولڈن ایج عربز کے باب میں کھلے بندوں کیا ہے۔ دوسرے یہ بات کہ چرچ کی اتھارٹی کا مزعومہ زوال تو در حقیقت صلیبی جنگوں اور ریفارمیشن تحریک کے ذریعے شروع ہوا۔ یاد رہے کہ مارٹن لوتھر، جس کو ریفارمیشن کا بانی قرار دیا جاتا ہے، وہ اسلامی کتب اور تہذیب سے اس قدر متاثر تھا کہ آرتھوڈاکس کرسچین اس پر خفیہ مسلمان

ہونے کا الزام عائد کرتے تھے۔ پھر جن لوگوں نے صلیبی جنگوں میں حصہ لیا، ان کا تعلق یورپ کے مختلف ممالک سے تھا، جب ارض مقدس (فلسطین) میں اُن کی مڈھ بھیڑ مسلمانوں سے ہوئی، تو وہ مسلمانوں کی برتر ثقافت اور تہذیب سے بہت متاثر ہوئے۔ یورپ واپس آ کر انہوں نے مسلمانوں کے اطوار کو اپنانا شروع کر دیا (جیسے صابن کا استعمال)، یوں ان کے طریق زندگی میں ریفارم کا آغاز ہوا، جس سے چرچ کی اتھارٹی کم زور ہونا شروع ہوگئی۔

ان صلیبی سپاہیوں کو شام، فلسطین، مصر، عراق کی اشیاء (جیسے عمدہ کپڑے، مصالحہ جات، پرفیوم) کا چسکا لگ چکا تھا، جب انہوں نے ان کا مطالبہ کیا تو تجارت کا آغاز ہوا اور اطالین قوم نے اس سے بہت مالی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد تین ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر بی ڈبلیو اسٹیونسن کہتا ہے کہ "The learning and art and science of the East, its public services, and methods of government, its bighly developes indusrties and comfort of dometic life exerted a powerful influence upon Europe in the Crusading period. یعنی مشرقی ممالک کے علم، ان کے آرٹ اور سائنسی علوم، ان کی پبلک سروسز، ان کے طریق حکومت، ان کی اعلیٰ قسم کی انڈسٹریز اور گھریلو زندگی میں سہولتوں نے صلیبی جنگوں کے عرصے میں یورپ پر گہرا اثر چھوڑا۔

تیسری بات یہ کہ نشاۃ ثانیہ میں نئی دنیا کی دریافت کا عمل بھی کارفرما تھا، تو یاد رہے کہ مسلمان، امریکا کی دریافت کرسٹوفر کولمبس کے ۱۴۹۲ء میں یہاں آنے سے قبل کر چکے تھے۔ چنانچہ ساؤتھ افریقا کے مشہور انتھراپالوجسٹ ڈاکٹر جیفری کی تازہ تحقیق سے عرب مسلمان، امریکا کولمبس سے پانچ سال قبل دریافت کر چکے تھے۔

چوتھی بات یہ کہ نشاۃ ثانیہ کے عمل میں آنے میں پرنٹنگ پریس کا براہ راست اثر تھا، تو یاد رہے کہ یورپ میں کاغذ کے استعمال کا رواج اسلامی اسپین سے شروع ہوا، جہاں کاغذ بنانے کی فیکٹریاں صدیوں سے کام کر رہی تھیں۔ اس بزنس سے منسلک لوگوں کے نام کے ساتھ "الورق" لکھا جاتا تھا۔ مقصد یہ کہ کاغذ کے بغیر پرنٹنگ پریس ایجاد نہ ہو پاتی۔ ملاحظہ فرمائیے درج ذیل حوالہ: Paper, without which the invention of printing would not have been made (The Early Middle Ages, by Jeff Hay, page 161, 2001) یورپ میں کاغذ بنانے کی پہلی فیکٹری اٹلی میں ۱۲۶۱ء میں لگی تھی اور مسلمانوں نے ہی کاغذ کپاس سے بنانا شروع کیا، چین کے لوگ کاغذ ریشم سے بناتے

تھے۔ انگلستان میں کاغذ بنانے کی پہلی فیکٹری ۱۴۹۴ء میں لگی تھی۔

مسلمانوں نے جس عظیم اور علمی تہذیب کی بنیاد اسپین میں رکھی، اس کا اثر فطری طور پر یورپ کے باقی ماندہ ممالک، جیسے فرانس، جرمنی، آسٹریا، برطانیہ کے ممالک پر بھی ہوا، مسلمانوں نے آرٹ، سائنس، زراعت، ادب، شاعری اور دوسرے علوم وفنون جیسے ریاضی ہیئت، فزکس، میڈیسن، کیمیا، جغرافیہ، ادب اور فلسفہ میں نئی دریافتیں کر کے ان علوم میں خاطر خواہ اضافہ کیا، جس سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آئی۔ اس مضمون کی قدرے جھلک پیش کی جارہی ہے۔

آٹھوی صدی سے تیرھویں صدی تک اسلامی تہذیب نے جن جلیل القدر عالموں کو جنم دیا، اُن میں سائنسی علوم میں جابر بن حیان، الکندی، ابن بیطار، ابن الہیثم۔ میڈیسن میں زکریا الرازی، ابن سینا، الزہراوی، ابن ظہر، ریاضی اور علم ہیئت میں الخوارزمی، ثابن ابن قرۃ، عمر خیام، ابوالوفا، نصیر الدین الطوسی، فلسفہ میں الفارابی، ابن سینا، الغزالی، ابن رشد، فخر الدین الرازی، علم تاریخ میں الطبری، ابن اثیر، ابن خلدون، جغرافیہ میں المسعودی، الادریسی، ابن حوقل کے نام قابل ذکر ہیں۔ اوران کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بارھویں صدی میں یورپ میں ان آفاقی عالموں اور سائنس دانوں کے نام سے ہر کس و ناکس واقف تھا۔ نیز ان کی سنہری تصنیفات کا مطالعہ کرنا ہر ایک کے لیے لازمی سمجھا جاتا تھا۔ یونیورسٹی آف وی آنا۔ یونیورسٹی آف پیرس اور مونٹ پالیئر (Montpelier) میں الرازی اور ابن سینا، الزہراوی کی کتابیں میڈیسن کے نصاب میں شامل تھیں۔ حکیم ابن سیناوہ دیوقامت سائنس داں اور ماہر طب تھا کہ یورپ میں لوگ اسے پرنس آف فزیشن اور ابن رشد کو ارسطو کی کتابوں کی تفاسیر لکھنے کی وجہ سے شارح اعظم کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

ان مسلمان عالموں کی شاہکار کتابوں نے جن یورپی عالموں کی علمی وفکری سوچ کو گہرے طور پر متاثر کیا، ان کے نام یہ ہیں: Pope Sylvester, II, Adelraed of Bath, Peter Abelard, Robert Grosstteste, Albert Magnus, Hales, Raymund Lull, St. Thomas Acquinas, Duns Sotus, Roger Bacon, Jhon Peckem, Willam of Occham, Blaise Pascal, Copemiucs Kepler.

بارھویں صدی میں دنیا میں عربی زبان کو وہی مقام حاصل تھا، جو آج کل انگلش کو ہے، یعنی عربی اس وقت دنیا کی سائنسی زبان تھی۔ کسی نے علمی یا سائنسی مقالہ لکھنا ہوتا، یا وہ چاہتا کہ اس

کے مقالے یا کتاب کی بہت سرکولیشن ہو، تو ایسی کتاب عربی میں لکھی جاتی تھی، جس کا ثبوت وہ عربی کتب ہیں، جو یہودی اور عیسائی عالموں نے عربی میں تصنیف کیں۔ گویا اس دور میں عربی زبان اظہار خیال کے لیے ایک بین الاقوامی زبان تھی۔ اس بارے میں ایک عربی عالم کا کہنا ہے کہ **At the beginning of 12th century no European could expect to be a mathematician or an astronomer, without a good knowledge of Arabic (Hist Mathematics, by C.Boyer, NY 1968)** قابل ذکر بات یہ ہے کہ آج اس وقت یورپ کی لائبریریوں میں ۲۵۰،۰۰۰ کے قریب عربی کتابیں اور مخطوطات محفوظ پڑے ہیں، جن میں مدفون انمول خزانوں سے ابھی دنیا مستفید نہیں ہوسکی۔ کاش کہ مسلمان اس طرف توجہ کریں اور اپنی علمی میراث کے ایک بار پھر مورث بن جائیں۔

راقم نے انٹرنیٹ پر آکسفورڈ یونیورسٹی کی باڈلین لائبریری کا مطالعہ کیا، تو معلوم ہوا، علاوہ دوسری کتابوں کے درج ذیل کتابیں ابھی تک وہاں محفوظ ہیں: القانون کا لاطینی ترجمہ جو جیرارڈ نے کیا اور وینس سے ۱۴۸۶ء میں طبع ہوا۔ ایک اور ترجمہ جو **Trechsel** نے کیا اور لیاآنز (فرانس) سے ۱۴۹۸ء میں طبع ہوا۔ ایک اور ترجمہ جو **Santorio** نے کیا اور وینس سے ۱۶۲۵ء میں طبع ہوا۔ ابن زہر کی کتاب التیسیر کے چار تراجم، جو ۱۴۹۰، ۱۴۹۷، ۱۵۱۴، ۱۵۳۱ء۔ زکریا الرازی کی کتاب المصوری جو وینس سے ۱۵۰۰ میں طبع ہوئی۔ الرازی کی کتاب الجدری والحصبہ کا انگلش ترجمہ جو **Richard Mead** نے کیا اور لندن سے ۱۷۴۸ء میں طبع ہوا۔ اسی طرح نیشنل لائبریری آف کینیڈا میں القانون کا ترجمہ موجود ہے، جو عبرانی میں ۱۴۹۲ء میں طبع ہوا۔

عربی کتابوں کے تراجم

بارہویں صدی کے آغاز میں اسپین کے یونیورسٹی ٹاؤن طلیطلہ **Toledo** میں باقاعدہ منظم تحریک کے مطابق عربی زبان میں موجود سائنسی کتب کے ذخیرے کا دوسری زبانوں میں تراجم کا کام شروع ہوا۔ اس شہر میں یہودی، عیسائی نیز مسلمان عالم و حکیم کثرت سے مقیم تھے۔ ترجمہ کرنے کی تحریک کا مقصد عربی کی تمام سائنسی کتب کو لاطینی یا عبرانی یا ہسپانوی زبانوں میں منتقل کرنا تھا۔ ترجمہ کرنے کا کام ایک مشہور عالم راہب **Gundisalvi** کی رہنمائی میں بڑے

منظم طریقے سے شروع ہوا۔ ترجمہ کرنے کا کام تینوں مذاہب کے مترجمین کرتے تھے، کسی کو اس بات سے سروکار نہ تھا کہ کون کس مذہب کا پیروکار ہے۔ بعض مترجمین عربی زبان سے نابلد تھے، اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے بعض دفعہ لفظی ترجمہ کر دیا اور جب کہیں ان کو عربی الفاظ سمجھ نہ آئے، تو انہوں نے ان الفاظ کو جوں کا توں لاطینی میں لکھ دیا۔ چنانچہ اس شہر میں سائنسی اور فلسفہ کی اہم کتب کے بہت شاندار تراجم کیے گئے۔

ان فاضل مترجمین میں سے چار کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جیرارڈ آف کریمونا Gerard of Cremona 1114-1187 اٹلی کا باشندہ تھا۔ مگر اس نے عربی زبان سیکھنے کی لگن میں (ٹولیڈو) اسلامی اسپین میں مستقل قیام کر لیا اور باقی کی زندگی اس نے یہاں کی ذہن کو جلا دینے والی علمی فضا میں بسر کی، اس کی وفات طلیطلہ میں ہی ہوئی، اس نے اکہتر عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جیسے جالینوس کی کتاب المجسطی کا ترجمہ اس نے ۱۱۷۵ء میں کیا، اس کے تراجم کے بعد جب ان ترجمہ شدہ کتب کا مطالعہ یورپ میں علماء اور اسکالرز نے کیا، تو یورپ اسلامی سائنس سے متعارف ہوا۔ جس طرح حنین ابن اسحٰق نے بغداد کے شہر میں آٹھویں صدی میں تراجم کا عظیم الشان کام کیا تھا، اسی طرح جیرارڈ نے یہاں طلیطلہ میں تراجم کا قابل تحسین کام کیا۔ انسانیت ان دو اشخاص کے علم اور علم دوستی کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔

ایڈیلارڈ آف باتھ (متوفی ۱۱۶۰ء) Adelard of Bath یہ انگریز بارہویں صدی میں عربی سائنس اور فلاسفی کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے عربی سے پندرہ کتب کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ اقلیدس کی المجسطی، الخوارزمی کی ستاروں کی زیج، اصطرلاب بنانے پر رسالہ، ۷۶ سوال اور جواب کہ اس نے عربوں سے کیا سیکھا، شاہین پر رسالہ۔ ان میں سے اصطرلاب پر رسالہ ابھی تک برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس وجہ سے المجسطی اور جدید ہیئت سے یورپ کے لوگوں کو رسائی حاصل ہوئی۔ اس نے شام، سسلی، اسپین کے سفر کیے، تا کہ اسلامی علوم سے خود کو متمتع کر سکے اور ۱۱۲۶ء میں برطانیہ واپس لوٹا۔ یاد رہے کہ المجسطی یورپ میں ریاضی کی پہلی نصاب کتاب تھی، جو ۱۴۸۲ء میں چھاپہ خانے پر زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔

رابرٹ آف چیسٹر (Robert of Chester) عربی علوم کے برطانیہ میں فروغ کے سلسلہ میں اس عالم نے اہم کردار ادا کیا۔ اس نے ۱۱۴۳ء میں قرآن کریم کے پہلے لاطینی ترجمے میں آرک بشپ پیٹر کے ساتھ تعاون کیا۔ اسپین میں تحصیل علم کے بعد وہ واپس اپنے وطن لوٹا، تو مندرجہ ذیل کتب کے تراجم کیے، الکندی کی کیمیا پر کتاب، الخوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ (یہ ترجمہ نیویارک سے ۱۹۱۵ء میں بھی شائع ہوا تھا)، اصطرلاب پر رسالہ لندن ۱۱۴۷ء الزرقا کی

زج لندن ۱۱۵۰ء، الخوارزمی کی زج (یعنی ہیئت کے جدول) یہ ترجمہ بورڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس کا سرسری مطالعہ وہاں کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر ۱۹۹۹ء میں کیا تھا)

(Constantine the African) (متوفی ۱۰۸۷ء) یہ عالم مراکش کا رہنے والا تھا، مگر سسلی میں ہجرت کر کے آباد ہو گیا تھا، اس نے اسلامی ممالک میں تیس سال تک قیام کیا اور مسلمان اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ یہ پہلا یورپی عالم تھا، جس نے عربی کی بہت سی کتب کے لاطینی میں عمدہ تراجم کیے۔ اس نے سالرنو کے شہر میں سب سے پہلے میڈیکل اسکول کی بنیاد رکھی، اس کے بعد فرانس میں مانٹ پلئیر اور پیرس میں ایسے اسکولوں کا آغاز ہوا۔ سائنس کی کتاب چوں کہ تمام کی تمام عربی زبان میں تھیں، اس لیے یورپ کی یونیورسٹیوں جیسے طلیطلہ، بولونیا، ناربون، پیرس میں عربی زبان کے سیکھنے کے لیے کورسز مہیا کیے جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ فرانس کا ایک عالم میرابلس (Mirabilis) اسلامی ممالک کے لمبے سفر کے بعد اسلامی نظام تعلیم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے یورپ واپس آ کر علی الاعلان نصیحت کی کہ یورپ کے طلباء اگر واقعی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو اسلامی ممالک کی تعلیمی درس گاہوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنی چاہیے، جو اس وقت قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ، قاہرہ اور دمشق میں پھل پھول رہے تھے۔

یاد رہے کہ ۱۴۵۴ء میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد اٹلی کی Medici Oriental Press نے عربی زبان میں اصل کتابوں اور ان کے تراجم کو کئی سو سال تک شائع کر کے یورپ کے جاہل لوگوں کو علم کے نور سے منور کیا۔ ان کتابوں کی اکثریت اب بھی Laurenziana Library-Florence میں محفوظ ہے۔ مثلاً عربی زبان میں بائبل کی ۱۵۰۰ کاپیاں اور اقلیدس کی کتاب، ایلی مینٹس کا عربی ترجمہ، جو نصیر الدین الطوسی نے کیا تھا، اس کی ۳۰۰۰ کاپیاں اس پریس نے شائع کی تھیں۔ ابن سینا کی شہرۂ آفاق کتاب، القانون فی الطب اصل عربی میں ۱۴۷۳ء میں یورپ میں پہلی بار یہیں طبع ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بائبل سے زیادہ ایک ہزار کے قریب کاپیاں فروخت ہو گئی تھیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ڈاکٹرز اور یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ عربی زبان پڑھ لکھ سکتے تھے، بلکہ بعض اطالوی اسکالر، جیسے Andreas Alpagos تو عربی زبان شام سے سیکھ کر آئے اور پھر عربی کتابوں کے تراجم کرنے شروع کیے تھے اور بعض روم میں خود عربی زبان سکھاتے تھے، جیسے G-Raimondi(1536-1614)

ایک مغربی خاتون اسکالر مارگریٹ اسٹل ویل Stiwell 1450-1550 کے عرصے میں یورپ میں پرنٹنگ کے پہلے سو سال میں شائع ہونے والی سائنسی کتب کا کٹیلاگ تیار کیا تھا، اس میں درجنوں اصل عربی کتابیں ہیں، جو بار بار شائع کی گئی تھیں۔ افسوس یہ کہ ان کتابوں کے مصنفین کے عربی ناموں کو لاطینی میں بدل دیا گیا، جیسے ابن سیناAvicenna ابن الہیثم Alhazen، جابر ابن حیان Geber، زکریا الرازی Rhazes، الزرقالی Arzachel، ابن رشد Averroes، تا کہ آنے والی نسلیں یہ سمجھیں کہ یہ مشاہیر اور قلم کے شہزادے گویا یورپین تھے اور مسلمانوں کو کوئی کریڈٹ ہی نہ ملے، جس سے مذہب اسلام کی فوقیت ظاہر ہو سکے۔

یورپی علم ہیئت پر اسلامی اثرات

مسلمان سائنس دانوں نے علم ہیئت میں سب سے دیرپا اور ٹھوس آلہ اصطرلاب ایجاد کیا تھا۔ یہ ایک طرح کی جیبی گھڑی یا قرون وسطیٰ کا کمپیوٹر تھا۔ اس مفید سائنسی آلے کے کئی فوائد تھے، ستاروں کے زیج (اسٹرانومیکل ٹیبلز) تیار کرنا۔ راستہ تلاش کرنا۔ بلڈنگ کی اونچائی معلوم کرنا۔ رات یا دن کا وقت معلوم کرنا، جب کہ گھڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ رات کے وقت ستاروں کی پوزیشن معلوم کرنا۔ کسی بھی شہر یا دنیا کی کسی بھی جگہ پر طلوع اور غروب آفتاب کے اوقات معلوم کرنا۔ خطہ ارض پر کسی بھی جگہ سے مکہ کا صحیح مقام تلاش کرنا۔ آسٹرالوجی کے چارٹ تیار کرنا۔ سمندر میں سفر کے دوران سمت معلوم کرنا، اس قسم کے اصطرلاب کو Meriner's astrolabe کہتے تھے۔ سترہویں صدی میں ٹیلی اسکوپ کی ایجاد کے بعد اس کا استعمال ختم ہو گیا۔

ایک مصنف A.L. Mayer نے اپنی کتاب Islamic Astrolabists میں اسلامی ممالک میں بننے والے تمام اصطرلابوں کی تفصیل بہ مع ان کے بنانے والوں کے پیش کی ہے۔ نیز یہ کہ دنیا کے مختلف میوزیم میں کہاں کہاں اب یہ اصطرلاب موجود ہیں۔ اس طرح ایک اور جرمن اسکالر Heinrich Suter نے اپنی کتاب میں پانچ سو کے قریب مسلمان ریاضی دانوں، ہیئت دانوں کے نام اور ان کی کتابوں کے نام پیش کیے ہیں۔

مسلمان ہیئت دانوں نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے، ان کی پہچان آسمان پر موجود مندرجہ ذیل ستاروں کے کنسٹیلیشن کے عربی ناموں سے ہوتی ہے۔ برج حمل (Aries)، برج ثور (Taurus)، برج جوزا (Gemini)، برج سرطان (Cancer)، برج اسد (Leo)، برج سنبلہ (Virgo)، برج میزان (Libra)، برج عقرب (Scorpion)، برج قوس

(Sagittarius)، برج جدی (Capricorn)، برج دلو (Acquarius)، برج حوت (Pisces) اور آسمان سب سے درخشندہ ستارے Betelgues & aldbran چاند کے کئی فرضی حصوں Craters کے نام مسلمان ہیئت دانوں کے ناموں سے منسوب ہیں۔

یورپ میں مسلمان ہیئت دانوں کے بنائے ہوئے کئی ایک اصطرلاب برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ جیسے اصفہان کے احمد ابن ابراہیم نے ۹۸۴ء میں جو اصطرلاب بنایا، وہ آکسفورڈ میوزیم میں موجود ہے، طلیطلہ (اسپین) کے ایک کاریگر ابراہیم بن سعید السلی نے ۱۰۶۶ء میں ایک منقوش اصطرلاب بنایا، جو وکٹوریہ میوزیم میں موجود ہے۔ اسی طرح مشہور شاعر چاسر نے جو اصطرلاب استعمال کیا تھا، وہ آکسفرڈ کے مرٹن کالج میں محفوظ ہے۔ امریکا میں شکاگو شہر کی جھیل کے کنارے پر واقع ایڈلر اسٹرانوی میوزیم ADLER جسے راقم الحروف نے ذیشان کے ہم راہ 2001ء میں وزٹ کیا تھا، اس میں قسم ہاقسم کے اکتیس دیدہ زیب اسلامی اصطرلاب میں نے خود دیکھے تھے، ان میں سے ایک آلہ جو لاہور کے باشندے نے بنایا تھا، اس کے اوپر کندہ ہے: عمل ضیاء الدین محمد ابن ملا اصطرلابی ہمایوں لاہوری ۱۶۴۷ عیسوی۔

اس کے علاوہ مسلمان ہیئت دانوں نے تمام اسلامی ممالک میں رصد گاہیں تعمیر کیں، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ رصد گاہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ انہوں نے آفتاب و ماہتاب کی روشنی، زمین کی حرکت، روشنی کی رفتار جیسے دقیق مسائل پر اظہار خیال کیا۔ سال اور ماہ کی مدت مقرر کی۔ کسوف و خسوف کے اسباب پیش کیے۔ اسپین کے فاضل اور عظیم ہیئت دان الزرقانی (۱۰۸۰ء) نے دعویٰ کیا کہ ستاروں کے مدار بیضوی ہوتے ہیں، یعنی وہ حرکت کرتے ہوئے انڈے کی شکل کے دائرے میں سفر کرتے ہیں، نہ کہ گول دائرے کے۔ یہ اس دور کا ایک انقلابی نظریہ تھا، جس کی تصدیق کئی سو سال بعد کوپرنیکس نے کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ البیرونی نے اپنی ایک کتاب میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا زمین اپنے مدار پر گھومتی ہے، افسوس کہ اس نے اس کا جواب پیش نہ کیا۔ ابن رشد نے مراکش میں قیام کے دوران سن اسپاٹس Sunspots دریافت کیے تھے۔

ابو العباس الفرغانی بہت عالی شان ہیئت دان تھا، وہ خلیفہ مامون الرشید کا منجم تھا، اس نے ہیئت پر کئی کتابیں قلم بند کیں، جیسے اصول علم والنجوم، المدخل الی علم ہیئت افلاک، کتاب الحرکات السماویہ والجوامع علم النجوم۔ مؤخر الذکر کتاب کا ترجمہ جیرارڈ آف کریمونا نے کیا ۱۵۳۷ء میں نیومبرگ سے، پھر ۱۵۴۶ء میں پیرس سے ۱۵۹۰ء میں فرانکفرٹ سے، ۱۶۶۹ء میں ایمسٹرڈیم سے شائع ہوا اور ۱۴۹۳ء میں ہسپانوی میں بھی اس کا ترجمہ منصۂ شہود پر آیا۔

اسحٰق الکندی کی علم ہیئت پر درج ذیل کتابیں مشہور ہیں: کتاب فی المناشر الفلکیۃ۔ رسالہ فی کیفیات نجوالمیتہ۔ کتاب فی امتناع مساحۃ الفلاک الاقصیٰ۔ رسالہ فی رجوع الکواکب۔ رسالۃ فی مطرح الشعاع۔ اس کے علاوہ ابو مشعر بلخی (Albumasar، ۸۸۶ء) خلیفہ معتمد (۸۷۰ تا ۸۹۲ء) کے بھائی کا منجم تھا، اس نے ہیئت پر ۲۴ کتابیں تصنیف کیں، جیسے ہیئت الفلک۔ کتاب اثبات النجوم۔ زج الکبیر، زج الصغیر۔ ان کتابوں کو لاطینی زبان میں جیراڈ نے ہی ڈھالا۔

علی ابن یونس مصری نے ۱۰۰۹ء میں وقت کی پیائش کا پینڈولم ایجاد کیا۔ عمر خیام نے ۱۰۷۴ء میں ایران کے کلینڈر کی اصلاح کی، جس کے مطابق ۳۷۷۰ سال میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔ یہ کلینڈر یورپ کے جولین اور گریگورین کلینڈروں سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اس کی کتاب الجبر والمقابلہ کا مطالعہ قرون وسطیٰ میں یورپ کی تمام جامعات میں کیا جاتا تھا۔ اس شاندار کتاب میں اس نے ریاضی کے ایک ایسے مسئلے کا حل اپنی ارفع علمی اور ذہنی قابلیت سے پیش کیا تھا، جس کا نام اب یورپ میں Pascal's Triangle ہے۔ اس کا فرنچ میں ترجمہ ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ اس نے Binomial theorem and co-efficients بھی ایجاد کیے۔ نیز جیومیٹری میں اس نے Theory of Parallelines پیش کی، جس کا استعمال نامور ریاضی داں ڈیکارٹ Descartes نے خوب کیا۔ علم ہیئت میں، زج ملک شاہی اور رسالہ مختصر طبیعیات اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

البا طنی (م ۹۲۹ء) نے بیالیس برس تک افلاک کے مطالعے کے بعد کتابیں قلم بند کیں، جیسے کتاب الزیج۔ مطالع البروج۔ زج البا طنی۔ رابرٹ آف چیسٹر نے البا طنی کی ایک کتاب کا جو ترجمہ کیا، وہ تو گم ہو گیا، البتہ اس کا ایک اور لاطینی ترجمہ بارہویں صدی میں Die Scientia Stellarum کے عنوان سے ہوا، جو ۱۵۳۷ء میں نیورمبرگ سے طبع ہوا۔ نادر ترجمہ ویٹیکن کی مشہور لائبریری میں نایاب کتابوں کے حصوں میں محفوظ ہے۔ ایک سو سال بعد اس کا ہسپانوی ترجمہ پلیٹو آف ٹیوالی (Plato of Tavoli) نے کیا، جو ۱۶۰۳ء) یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے دور میں البا طنی کی کتاب کا مطالعہ اہم بنیادی جز ہوتا تھا۔ جارج سارٹن کا کہنا ہے کہ البا طنی کے ستاروں کے مشاہدات نہایت ممتاز اور عمدہ تھے۔ اسپین کی سکوریال لائبریری میں اس کی عربی زبان میں زج ابھی تک محفوظ ہے۔ جرمن ہیئت داں جوہانس میولر (۱۴۷۶) Regiomontanus نے البا طنی کی زج کی مدد سے دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا، جس کے دقیق مطالعے اور رہنمائی سے کرسٹوفر کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا تھا۔

یاد رہے کہ قرون وسطیٰ کا ہر عالم ہیئت داں بھی ہوتا تھا، گویا اس کے مطالعے کے بغیر

عالم کہلانا ناممکن تھا۔ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد جو اسٹرانومی کی اہمیت کو ہر سائنس داں تسلیم کرتا ہے، شاید اسی وجہ سے اسے Queen of Sciences بھی کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر فی الحقیقت مسلمانوں کی شان دار کنٹری بیوشن کا اندازہ اٹلی کے اسکالر C.A. Nallino کی کتاب سے ہوتا ہے، جس نے عرب ہیئت دانوں کے حالات زندگی چار جلدوں میں روم سے ۱۹۱۱ء میں بڑے اہتمام کیے۔ اس کا عربی ترجمہ علم الفلک عبد العرب فی القرون الوسطیٰ مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

ستاروں کے جدول

قرون وسطیٰ میں علم ہیئت کے تمام اوزار اور جدولیں (astronomical tables) اسلامی ممالک سے یورپ پہنچے تھے۔ پھر علم کی اس شاخ کی تمام اصطلاحات (ٹرمنالوجی) عربی زبان سے اخذ تھیں۔ بڑے بڑے مسلمان ہیئت دانوں، جیسے الصوفی، الفرغانی، البیرونی، ابن سینا، الزرقالی، الطوسی، الوغ بیگ کی سکہ بند کتابوں کے تراجم لاطینی، اور عبرانی میں کیے گئے۔ البا طنی کی ستاروں کی زوج روم سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس نے افلاک کے طویل مشاہدات کے بعد یہ سائنسی حقیقت بیان کی کہ سورج کو گرہن ہر سال لگتا ہے۔ ۱۷۴۹ء یورپ کے ماہر ہیئت داں Dunthom نے البا طنی کی تھیوریز کی مدد سے چاند کے بارے میں تھیوری پیش کی، جس کا نام Secular acceleratoin of the movemnet of the moon ہے۔ البا طنی نے نئے چاند کے دیکھنے کی پیشگی تاریخ معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ اس نے ایک سال کی مدت ۳۶۵ دن، پانچ گھنٹے، ۴۸ اور ۲۴ سیکنڈ دی ہے۔

وہ پہلا سائنس داں تھا، جس نے اپنی سائنسی تحقیق میں ریاضی کی اصطلاحیں، جیسے Cine, cosine, tangent & cotangent استعمال کیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی ریسرچ میں جیومیٹری کی بجائے ٹریگو میٹری کو استعمال کیا۔

میڈرڈ (مجریط) کے رہنے والے ابو القاسم المجریطی (م ۱۰۰۷ء) نے الخوارزمی کی زج کی اصلاح کیا۔ ایڈیلارڈ آف باتھ نے اس کا ترجمہ بارہویں صدی (۱۱۲۶ء) میں کیا۔ اس نے اصطرلاب کی صنعت پر ایک رسالہ لکھا، جس کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ریاضی میں اس نے ایک کتاب، المعاملات لکھی، جو اکاؤنٹنگ کے موضوع پر ہے۔ اسپین کے ایک اور ہیئت داں البطر وجی کی کتاب الہیئت کا عبرانی زبان میں ترجمہ تیرہویں صدی میں موسیٰ بن طبون اور لاطینی میں

کیلو نے مس نے کیا۔اس کتاب کا آخری ایڈیشن ۱۵۳۱ء میں شائع ہوا۔

طلیطلہ (اسلامی اسپین) کے مشہور ہیئت داں ابو اسحٰق الزرقالی (م ۱۰۸۷ء) کے شہرہ آفاق زیج Toledan Tables کا ترجمہ بارھویں صدی میں کیا گیا۔اس نے ایک نادر اصطرلاب الصحیفہ کے نام سے ایجاد کیا، جس کے بنانے کی تفصیل کے کتابچے کا ترجمہ عبرانی اور اطالوی زبانوں میں کیا گیا۔لاطینی میں ترجمہ جیرارڈ آف کریمونا نے کیا اور ہسپانوی میں ترجمہ عالم شاہ الفانسو دہم نے خود کیا۔یورپ کی تمام جامعات میں یہ کتاب اس موضوع پر اتھارٹی سمجھی جاتی تھی۔کوپرنیکس جیسے آفاقی عالم نے اپنی انقلابی کتاب Die Revoltionnibus میں الزرقالی اور البا طنی کے علمی احسانات کا برملا و واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا تھا۔الزرقالی نے بہت سے آلات بنائے، جو اپنے عہد کے اعلیٰ ترین سائنسی آلات تھے۔نیز اصطرلاب بنانے پر جو مقالہ اس نے لکھا، اس کا حوالہ کوپرنیکس نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔اس کے ٹریگو میٹری ٹیبلز کا ترجمہ ۱۵۳۴ء میں نیورمبرگ سے طبع ہوا۔

ابو الحسن ابن یونس (۹۵۰ تا ۱۰۰۹ء) نے بہت سے فلکیاتی مشاہدات قاہرہ کی رصد گاہ میں کیے۔اس موضوع پر اس کی کتاب الزاج الکبیر الحا کی عمدہ تصنیف ہے۔جس میں ستاروں کے مشاہدات کا کیٹلاگ بھی دیا گیا ہے۔اس زیج کو مکمل کرنے میں اس نے سترہ سال صرف کیے۔اس میں چاند گرہن کے مشاہدے کا بھی ذکر ہے، جس کے مطالعے سے امریکی ہیئت داں سائمن نیوکومب Simon Newcomb (۱۹۰۹۔۱۸۳۵) نے اپنی لونری تھیوری پیش کی تھی۔فرنچ مصنف Sedillot نے اس کا فرنچ میں ترجمہ کیا تھا۔

ایرانی النسل عبدالرحمٰن الصوفی (۹۰۳ تا ۹۸۶ء) پہلا عالمی ہیئت دان تھا جس نے ۱۹۶۴ء اینڈرومیڈا گیلیکسی (Andromeda galaxy۳۱) دریافت کیا۔ہمارے نظام شمسی سے باہر کسی اور اسٹار سسٹم کا یہ پہلا ریکارڈ تھا جس کا ذکر اس نے اپنی تصنیف "کتاب الکواکب الثابت المصور" میں کیا۔یہی گیلیکسی سات سو سال بعد جرمن ہیئت دان Marius (d۱۶۲۴) Simon نے دسمبر ۱۶۱۲ء میں ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دریافت کی تھی۔الصوفی کی کتاب کے تراجم یورپ کی کئی زبانوں میں کیے گئے جس سے اس کتاب کا اثر یورپ کی اسٹرانومی پر دیرپا اور گہرا تھا۔

یگانہ روزگار سائنس دان ابن الہیثم (۹۶۵ء تا ۱۰۳۹ء) نے علیم ہیئت میں لباب (Resume of Astronomy) تحریر کی تھی، جس میں اس نے کروں کی حرکت کا فزیکل ماڈل پیش کیا۔یورپ میں اس کتاب کا اثر جو ہانس کیپلر کے زمانے تک قائم تھا۔نصیر الدین

الطوسی بھی اس کتاب سے متاثر تھا۔ ابو ریحان البیرونی نے ۱۰۰۰ء میں کتاب ''القانون المسعودی فی الھیت النجوم'' لکھی، جس میں ہیئت اور ٹریگانو میٹری کے نئے نئے تھیورم پیش کیے۔

اقلیم طب کے تاج دار، عالم بے بدل شیخ الرئیس ابن سینا نے ایران میں اپنی ریسرچ ایک رصدگاہ میں کی، جس کے آثار قدیمہ حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ اس نے ہیئت کے اوزار بنائے جیسے ورنیئر اسکیل (Vernier Scale) اس نے سیارہ زہرہ (Venus) ۱۰۳۲ء میں اپنے مشاہدہ اور غور و فکر کے بعد یہ سائنسی نتیجہ نکالا کہ یہ کرہ بجائے سورج کے زمین سے زیادہ قریب ہے۔ یورپ والوں کی دھاندلی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اس سائنسی نقطہ کے انکشاف کا سہرا انگلش اسٹرانومر جرمیا ہراکس (Jeremia Horrocks) کے سر باندھا۔ جس کا انکشاف اس نے ابن سینا کے سات سو سال بعد ۱۶۳۹ء میں کیا۔ ابن سینا نے یہ بھی کہا کہ روشنی کی ایک واضح رفتار ہوتی ہے اس لیے وہ پہلا سائنس دان تھا جس نے روشنی کی رفتار کا نظریہ پیش کیا۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ابن سینا نے فزکس، علم ہیئت اور میڈیسن کے سائنسی حل کے لیے ریاضی کا استعمال کیا جیسا کہ اب عام رواج ہو چکا ہے۔

نصیر الدین الطوسی (۱۲۰۱ء تا ۱۲۷۴ء) کی علم ہیئت معرفت کا سرچشمہ کتاب ''تذکرہ فی علم الھیت'' ہے، جس کا لاطینی ترجمہ Figure Cate کے عنوان سے چودھویں صدی میں کیا گیا۔ اس کتاب میں الطوسی نے بہت سی پرانی، فرسودہ تھیوریز پر کڑی تنقید کی، نیز اس نے اپنا تیار کردہ کروی ماڈل (Planetary Molder) پیش کیا۔ کوپرنیکس نے اپنا اس سے ملتا جلتا ماڈل پانچ سو سال بعد پیش کیا۔ الطوسی نے مراغہ (آذربائیجان) میں ۱۲۶۲ء میں رصدگاہ تعمیر کی، جس میں علاوہ سائنسی آلات کے ایک بارہ فٹ لمبا قواڈرنٹ (Quadrant) اور ایک Azimuth تھا، جسے اس نے خود تیار کیا تھا، اس نے بارہ سال کی دیدہ ریز شب و روز کی محنت کے بعد ستاروں کی ''زیج الخانی'' تیار کی، جس میں ۹۹۰ ستاروں کی کیٹلاگ تھی۔ کتاب ''تذکرہ فی علم الھیت'' میں اس نے چاند اور کروں کی حرکت (مرکری اور وینس) پر بطلیموس کے فرسودہ نظریات کو رد کر کے ایک جدید سسٹم تجویز کیا، جس کے مطابق کروں کے مدار بیضوی بنتے تھے۔ اس کو بنیاد بنا کر جوہانس کیپلر (Kepler) نے اپنا جدید نظریہ Heliocentric System (یعنی آفتاب کا مرکزی ہونا) پیش کیا تھا۔

روشن دماغ سلطان الوغ بیگ (متوفی ۱۴۴۹ء) ترکستان کا حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمہ ریاضی دان اور منفرد ہیئت دان بھی تھا۔ سمرقند کے شہر میں اس نے ایک عالی شان رصدگاہ تعمیر کی جو ۱۲۰ فٹ اونچی تھی، اس کا قطر ۲۵۰ تھا۔ اس کی صورت گول تھی۔ روسی ماہرین نے

اس کے آثار ۱۹۰۸ء میں دریافت کیے تھے۔ اس کی تصویر بیسویں صدی کے معروف ہیئت دان فریڈ ہوئیل کی کتاب اسٹرانومی، نیویارک ۱۹۷۲ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس رصدگاہ میں ہیئت کے گونا گوں آلات موجود تھے جیسے Amillary Sundials, Astrolabes, Sextant سلطان الوغ بیگ نے کتاب ''زیج الجدید سلطانی'' تصنیف کی، جس کا انگریزی میں ترجمہ Tables of Planetary Motions کے عنوان سے ۱۹۱۷ء میں کیا گیا۔ جارج سارٹن نے اس زیج کو اسلامی دنیا کا ماسٹر پیس آف آبزورینشنل اسٹرانومی کہا ہے۔ اس کا لاطینی ترجمہ ۱۶۵۰ء میں جے گریوز Greaves نے لندن سے شائع کیا۔ ''زیج الجدید'' میں ۹۹۲ ستاروں کی کیٹلاگ دی گی ہے۔

اسلامی اسپین کے شہر ویلنسیا کے باشندے ابراہیم السہدمی نے ۱۰۸۱ء میں گلوب (Celestial Globe) خود بنایا، جس کا ڈایا میٹر "۸۱۵" تھا، پھر اشبیلیہ کے شہر کی جامع مسجد کا مینار ہیرالڈا Giralda of Seville بنایا، جواب کیتھڈرل کا حصہ ہے۔ یہ تین سو فٹ اونچا مینار ہے۔ ایک زمانہ میں مؤذن گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی بالائی منزل پر جا کر اذان دیا کرتا تھا، کیوں کہ اس میں سیڑھیوں کی بجائے ڈھلان بنائی گئی تھی۔

یہاں مشہور ہیئت دان جابر ابن افلاح نے اپنی تصنیف ''اصلاح المجسطی'' کے لیے ستاروں کے مشاہدات ۱۲۴۰ء میں کیے گئے تھے۔ یہ کتاب یورپ میں مقبول عام تھی۔ فی الحقیقت ہیرالڈ یورپ کی سب سے پہلی رصدگاہ تھی۔ راقم الحروف نے یہ مینار ۱۹۹۹ء میں دیکھا تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی عربی زبان میں اس کی تعمیر کی تاریخ کی تختی دیوار پر نصب ہے جس کے مطابق یہ خلیفہ ابو یعقوب یوسف کے دور میں ۱۱۸۵ء میں مکمل ہوا تھا۔ مینار کے اوپر کی منزل پر ہر طرف کھڑکیاں ہیں جہاں سے انسان رات کے وقت ہر سمت سے اجرام فلکی کا مشاہدہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ دن کے وقت ٹورسٹ کا جم غفیر یہاں اب بھی رہتا ہے۔

انٹرنیٹ پر ٹائیکو براہے ۱۶۰۱-۱۵۴۶ء کے نام پر سرچ کرنے سے میں یہ دعویٰ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے دنیا کی سب سے پہلی رصدگاہ تعمیر کی تھی، جب کہ اسلامی ممالک میں رصد گاہیں خلیفہ المامون کے دور ہی میں تعمیر ہونا شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ اگلے سات سو سال میں جو رصدگاہیں مختلف اسلامی ممالک میں تعمیر ہوئیں، اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ قاسیون کے پہاڑ کی رصدگاہ ۸۳۰ء۔ شرف الدولہ کی بغداد میں رصدگاہ ۹۸۲ء۔ قاہرہ کی رصدگاہ (ابن یونس کے لیے) ۹۹۶ء۔ ہمدان کی رصدگاہ (ابن سینا کے لیے) ۱۰۲۳ء۔ ملک شاہ کی رصدگاہ (ایران) ۱۰۹۲ء۔ الافضل رصدگاہ (قاہرہ) ۱۱۰۱ء۔ ہیرالڈا ٹاور کی رصدگاہ (سپین) ۱۱۷۲ء۔ فیض، مراکش کی رصد

گاہ ۱۲۰۴ء۔ مراغہ کی رصد گاہ (الطوسی کے لیے) ۱۲۵۹ء۔ تبریز کی رصد گاہ (ایران) ۱۲۹۵ء۔ سمر قند کی رصد گاہ ۱۴۰۲ء۔ استنبول کی رصد گاہ ۱۵۷۷ء۔

مذکورہ بالا رصد گاہوں کے ماڈل کو سامنے رکھتے ہوئے یورپ میں رصد گاہیں بننا شروع ہوئیں۔ پیرس ۱۶۶۶ء، گردین وچ ۱۶۷۵ء، لیڈن ۱۶۳۲ء، کوپن ہیگ ۱۶۳۷ء۔ جرمنی کے بادشاہ (D۱۵۹۲) Wilhelm of Hesses نے کاسل کے شہر میں رصد گاہ بنوائی۔ جس میں استعمال ہونے والے تمام کے تمام آلات یا تو اسلامی ممالک سے لائے گئے تھے یا ان کی نقل کر کے نئے آلات بنائے گئے تھے۔ کوپرنیکس نے اپنی رصد گاہ میں جو آلات استعمال کیے وہ مراغہ کی رصد گاہ میں استعمال کیے گئے تھے، پھر ٹائیکو براہے (Brahe) نے یورانے برگ (Uraniborg) میں جو ہیئت کے آلات استعمال کیے، جیسے Amillary, Sphere Quadrant, Azimuth وہ بھی اسلامی تھے۔ اندلسی اسٹرانومر جابر ابن افلاح نے بھی ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس کا نام Torquetum تھا، جو یورپ میں بہت مقبول عام تھا۔

یورپ میں عربی کتب کا ذخیرہ

شاید کوئی قاری یہ ہے کہے کہ ان باتوں کا ثبوت کیا ہے کہ یہ کتابیں واقعی لکھی گئی تھیں اور یہ اساطیر الاولین والی بات نہیں ہے۔ تو بہ صد ادب گزارش ہے کہ برطانیہ کی درج ذیل عظیم الشان لائبریوں میں عربی کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ موجود ہے۔ انڈیا آفس لائبریری، برٹش لائبریری، بوڈلین لائبریری، (آکسفورڈ) ایڈنبرا یونیورسٹی (سکاٹ لینڈ) کی لائبریری۔ کیمرج یونیورسٹی اور ڈرہم یونیورسٹی کی لائبریری اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ صرف برٹش میوزیم کی اسلامی مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں ہے اور چار ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۹ء میں راقم الحروف نے بوڈلین لائبریری کو ایک دن کے لیے وزٹ کیا، جہاں داخلہ کے لیے کسی پروفیسر کے تعارفی خط کا ہونا ضروری ہے۔ پاسپورٹ کی فوٹو کاپی بنا کر، کچھ فیس کی رقم لے کر ایک دن کے لیے اجازت نامہ دیا گیا۔ پھر عاجز کو ایک کمرے میں بیٹھنے کی اجازت ملی جہاں پنسل اور قلم لے جانا ممنوع تھا۔ وہاں عہد وسطی کی عربی کتب کی بڑے سائز کی ایک کیٹلاگ تھی، جس میں سے عاجز نے الرازی، جابر ابن افلاح، الزہراوی، ابن ظہیر، ابن الہیثم، ابن سینا کی کتاب کا انتخاب کیا اور متعلقہ افسر مجھے یہ کتابیں کچھ وقفہ کے بعد لا کر دیتا رہا۔ میں تو اس بات کا شاہد ناطق ہوں کہ اس مضمون میں مذکورہ کتابیں واقعی لکھی گئی تھیں اور ابھی تک موجود ہیں۔

جرمنی میں صرف برلن لائبریری کے عربی مخطوطات کی فہرست دس ضخیم جلدوں میں

دستیاب ہے۔ ہر جلد میں ایک ہزار مخطوطات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ گوٹھنگن، بون، توبنگن، ہائیڈل برگ، ہمبرگ، میونخ کی جامعات کے کتب خانوں میں صدہا نادر اسلامی نسخے اور مخطوطات کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ اسپین کی میڈرڈ سے چالیس میل اسکوریال لائبریری اور میڈرڈ کی نیشنل لائبریری میں بھی صدہا مخطوطات موجود ہیں۔ (۱۹۹۹ء میں راقم السطور قرطبہ سے کار کے ذریعہ لمبا سفر کر کے اسکوریال، عربی کتب دیکھنے کے اشتیاق میں عبدالباسط کے ہمراہ گیا تھا، مگر اس روز لائبریری تو بند تھی، البتہ ہم نے خوب صورت محل نما عظیم الشان بلڈنگ کے باقی حصہ کی مایوس ہو کر سیر کی)۔

بورڈلین لائبریری نے اسلامی دنیا کی ایک ہزار سالہ پرانی نادر کتب میں پچاس کتب کی نمائش کا اہتمام ۱۹۸۱ء میں کیا، جو قرون وسطی کے علماء نے فلاسفی، میڈیسن، فزکس، ریاضی اور جغرافیہ جیسے علوم پر لکھی تھی۔ اس نمائش کا نام **The Doctrina Arabum** تھا جو ڈیونٹی اسکول کی پانچ سو سالہ عمارت پر لگائی گئی تھی۔ نمائش میں راجر بیکن کی کتاب **Opus Tertius** بھی تھی، جس میں اس نے ابن الہیثم اور الزرقالی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مائیکل اسکارٹ کی زوآلوجی پر ترجمہ کردہ کتب بھی تھیں، جو اس نے بادشاہ فریڈرک دوم کے حکم پر تصنیف کی تھی، یونانی عالم **Appolonius of Perga** کی کتاب **Conics** کے تین حصوں کا عربی ترجمہ تھا، جن کے مطالعہ سے ایڈمینڈ ہیلی (**Halley**) نے اپنی کتاب ۱۷۱۰ء میں شائع کی تھی۔ نمائش میں الوغ بیگ کی زیج عربی زبان میں تھی جس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے پروفیسر جان گریوز **Greaves** نے لاطینی میں ستاروں کی زیج تیار کی تھی۔ یہاں لاطینی زبان میں مینو اسکرپٹ بھی تھے، جو تیرہویں اور چودھویں صدی میں یورپ کی جامعات میں بہ طور نصاب شامل تھے۔

(۱۱) کہا جاتا ہے کہ اطالوی سائنس دان **Morgagni** فادر آف پیتھالوجی تھا، کیوں کہ اس نے سب سے پہلے مرض کی نوعیت کو بیان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام نے جو فاضل طبیب پیدا کیے، وہ دنیا کے سب سے پہلے پیتھالوجسٹ تھے۔ مثلاً ابن زہر اندلسی نے جن بیماریوں کی نوعیت بیان کیں، اس میں **Pleurisy, Pericarditis & TB** ہیں۔ ابو القاسم الزہراوی نے کئی **Congeital** بیماریوں کے علاوہ دماغ کے اوپر پانی (**Hydrocephalus**) کو اپنی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا۔ ابن نفیس نے دوران خون کی بیماریوں کی تفصیل وضاحت سے بیان کی۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ انیسوی صدی کا طبیب **Paul Ehrlich** پہلا شخص تھا جس نے ڈرگ تھراپی کا آغاز کیا، تاکہ مخصوص دوائیوں سے مائیکروب کو ہلاک کیا جا سکے۔ حقیقت

یہ ہے کہ مسلمان طبیب الرازی پہلا شخص تھا جس نے مرکری کے کمپاؤنڈ کو اینٹی سیپٹک کے طور پر استعمال کیا۔ اسی طرح بعض طبیبوں نے Scabies mite کو ختم کرنے کے لیے سلفر کا استعمال کیا، پھر مزید یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خالص الکحل جو ڈیسٹی لیشن کے ذریعہ بنائی جاتی ہے، اسے اسپین کے کیمسٹ Villanova نے تیرھویں صدی میں بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی الکحل مسلمان کیمسٹ دسویں صدی میں بنا چکے تھے۔ الرازی ان میں سے ایک کیمسٹ تھا جس نے الکحل کو سالونٹ اور اینٹی سیپٹک کے طور پر استعمال کیا تھا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے پہلی سرجری Inhalation anesthesia کے دوران امریکا میں ۱۸۴۵ء میں سی ڈبلیو لونگ نے کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی طبیب سے چھ سو سال قبل اسلامی اسپین میں الزہراوی اور ابن زہر اس طور پر لاتعداد سرجریاں کر چکے تھے، جس میں نارکوٹک سے بھرا اسپنج مریض کے منہ پر رکھنے سے مریض پر بے ہوشی وارد کر دی جاتی تھی۔

(۱۲) یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قرنطینہ کا آئیڈیا سب سے پہلے ۱۴۰۳ء میں کسی یورپی سائنس دان نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ وینس کے شہر میں قانون بنایا گیا کہ اجنبی مسافر شہر کے اندر کچھ عرصہ کے انتظار کے بعد داخل ہو سکتے تھے، پھر ان کے معائنہ کے بعد اگر کوئی بیماری نہ پائی جاتی تو ان کو شہر میں آنے دیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت یعنی ساتویں صدی میں جب ایک علاقہ میں طاعون پھیلی تو آپ نے لوگوں کو دوسرے شہروں میں جانے سے منع فرما دیا تھا۔ اسی طرح زکریا الرازی کو خلیفہ بغداد نے شہر میں اسپتال کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے کے لیے کہا تو اس نے شہر کے مختلف حصوں میں گوشت کے ٹکڑے لٹکا دیے، جس جگہ گوشت سب سے کم خراب ہوا تھا، وہاں اس نے اسپتال تعمیر کرنے کی سفارش کی، گویا اسے ہائی جین اور اسٹریلائزیشن کا مکمل علم تھا، پھر دسویں صدی میں اسلامی ممالک میں جو اسپتال تھے، ان میں متعدی بیماریوں والے مریضوں کے لیے علیحدہ وارڈ ہوتے تھے۔

یہ بھی بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ برٹش سرجن جوزف لسٹر نے سرجری میں اینٹی سیپٹک کا سائنسی استعمال ۱۸۶۵ء میں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دسویں صدی میں مسلمان طبیب اور جراح پیورفی فائیڈ الکحل زخموں پر لگاتے تھے۔ اسلامی طبیب کے سرجنوں نے سرجری سے پہلے اور بعد میں انٹی سیپٹک ادویات استعمال کی تھیں۔ پوسٹ آپریٹو پیریڈ کے دوران ہائی جین کے لیے خاص ہدایات جاری کرتے تھے۔ یاد رہے کہ الکحل عربی کا لفظ ہے۔

(۱۳) کہتے ہیں کہ سرجری کا بانی فرنچ Ambroise Pare تھا، جس نے زخم سے خون روکنے کے لیے اُبلتے ہوئے تیل کا استعمال کیا تھا، مگر یاد رہے کہ اندلس میں سرجری کے اس

قدر کامیاب آپریشن کیے جاتے تھے کہ یورپ کے مریض یہاں علاج کے لیے لمبے کٹھن سفر کر کے آیا کرتے تھے۔ الزہراوی نے سب سے پہلے ٹانکے لگانے شروع کیے جو Catgut جانوروں کی انتڑیوں سے بنے ہوتے تھے، پھر خون کو روکنے کے لیے اس نے کاٹن اور موم کا استعمال شروع کیا تا کہ زخم کا منہ بند کیا جا سکے۔ سرجری کے موضوع پر اس کی کتاب ''التصریف'' جو تیس جلدوں میں ہے، اس میں کئی ایسے طریقے بیان ہوئے ہیں۔ کتاب میں دو سو کے قریب سرجیکل آلات مع تصاویر بیان کیے گئے ہیں، جن میں تیس سے زیادہ اس نے خود بنائے تھے۔

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خون کی گردش کو ولیم ہاروے Harvey نے سترہویں صدی میں دریافت کیا۔ اس نے دل کے مختلف فنکشن، شریانوں اور نسوں کو صحیح طور پر بیان کیا، عہد قدیم کے طبیب جالینوس نے جو سرکولیٹری سسٹم بیان کیا تھا وہ غلط تھا، اس لیے ولیم ہاروے کو فزیالوجی کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغداد کے زکریا الرازی نے دسویں صدی میں وینز Venous سسٹم پر پہلا طبی مقالہ تصنیف کیا، جس میں شریانوں اور دل کے والوز کا صحیح فنکشن بیان کیا تھا، پھر دمشق کے ابن النفیس نے پرتگیزی ڈاکٹر Servet سے تین سو سال قبل خون کے سرکولیٹری سسٹم کو بیان کیا تھا۔ ولیم ہاروے نے اٹلی کی پاڈوا یونیورسٹی سے گریجویشن کی تھی جہاں کا طبی نصاب ابن سینا اور الرازی کی کتب پر مشتمل تھا۔ ہاروے نے یہ علم اسلامی کتب کے لاطینی تراجم سے حاصل کیا تھا۔

(۱۴) ایک جرمن اسکالر نے ۱۵۴۲ء میں فارموکوپیا کے نام سے پہلی کتاب شائع کی۔ ورلڈ بک آف انسائیکلوپیڈیا کے مطابق فارماکالوجی کا آغاز ۱۹۰۰ء کے شروع میں کیمسٹری کے علم کے آف شوٹ کے طور پر جڑی بوٹیوں، پودوں، درختوں کے تجزیہ سے شروع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہ قول مشہور عرب امریکی تاریخ دان فلپ کے حِتی ، نہ تو یونانی، نہ ہی یورپی عالموں نے پہلی ایسی کتاب لکھی بلکہ اس کے لکھنے والے مسلمان تھے۔ اس علم کا آغاز نویں صدی میں مسلمان اطباء نے کیا۔ مسلمان کیمسٹ، فارماسسٹ اور فزیشنز نے جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی ادویات پر ہزاروں صفحات لکھے، جس سے جدید فارماکالوجی کا آغاز ہوا۔ مثلاً ابن بیطار، سب سے عظیم مسلمان فارماسسٹ تھا، جس نے اپنی کتاب میں ۱۴۰۰ ادویاء کا ذکر کیا۔

پھر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ادویاء کا استعمال خاص عوارض کے علاج کے لیے سولہویں صدی میں سوئس فزیشن Paracelsus نے شروع کیا۔ نیز یہ کہ یہ پہلا فزیشن تھا جس نے عملی تجربہ کا مریض کے علاج میں ہونا ضروری سمجھا، بجائے صرف تھیوری کے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرگ تھراپی کا آغاز مسلمان اطباء جیسے الرازی، الکندی، ابن رشد، ابن سینا، الزہراوی، ابن زہر، ابن

بیطار، ابن الجزار، ابن جلجل اندلسی، ابن نفیس، ابن سہل نے کیا تھا۔ انگلش کا لفظ ڈرگ عربی سے مشتق ہے، اس لیے یہ تصوری اسلامی تھا۔ بہ قول جارج سارٹن کے، ماڈرن میڈیسن کی ترقی مکمل طور پر اسلامی ہے، کیونکہ نویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک مسلمان اطباء نے اس علم کو آگے بڑھایا۔

(۱) ہالینڈ کے سائنس دان والبراڈ سنیل (Wilbord Snell) نے ابن الہیثم کا لا آف ریفریکشن دوبارہ دریافت کیا، جواب مغرب کی کتابوں میں Snell's law کہلاتا ہے۔

(۲) اسکاٹ لینڈ کے نامور ریاضی دان جان پلے فیئر (Playfair) نے اقلیدس کی کتاب المجسطی کے ایڈیشن کا متبادل پیش کیا، جواب Playfair, a axiom کہلاتا ہے۔ یہ متبادل ابن الہیثم نے ایک ہزار سال قبل پیش کیا تھا۔ (رسالہ تہذیب الاخلاق، ستمبر ۱۹۹۵ء)

(۳) فرانس کے ریاضی دان Pierre Femat نے ایک نظریہ پیش کیا جواب Fermat's Principle of lesat time کہلاتا ہے۔ یہ نظریہ بھی ابن الہیثم نے پیش کیا تھا جو کتاب المناظر میں درج ہے۔ روشنی کی شعاع جب کسی میڈیم میں سے گزرتی ہے تو وہ نسبتاً آسان اور تیز راستہ اختیار کرتی ہے۔ (ڈاکٹر عبدالسلام کی کتاب آئیڈیلیز اینڈ ریالٹیز صفحہ ۲۸۳)۔ اسی طرح ابن الہیثم نے Law of inertia دریافت کیا جو بعد میں گیلیلیو اور نیوٹن کے لاز آف موشن کا حصہ بن گیا۔

(۴) ابن سینا نے ۲۴ رمئی ۱۰۳۲ء کو وینس کرے کا اپنی آنکھ سے خود مشاہدہ کیا تھا، مگر اس کا سہرا یورپ میں انگلش اسٹرالومر Horrocks کو دیا جاتا ہے۔

(۵) ریاضی میں ابن الہیثم نے ایک عقدہ حل کیا جس کو Problems involving congruences کہا جاتا ہے، مگر اس کو اب یورپ میں Wilson's theorem کہا جاتا ہے۔

(۶) راجر بیکن کی کتاب Opus Majus کا پانچواں باب اس کی اپنی تخلیق نہیں بلکہ یہ ابن الہیثم کی کتاب المناظر کی صریح نقل اور شرح ہے۔ یہ کتاب کوئنز یونیورسٹی، کنگسٹن کی اسٹافر لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا مطالعہ میں نے کیا ہے۔ پارٹ فائیو کا عنوان آپٹیکل سائنس ہے، اس میں راجر بیکن الہیثم کے علاوہ ابن سینا اور ابن رشد کے علم بصریات

پر نظریات کا ذکر بھی بار بار کرتا ہے۔

(۷) عمر خیام نے ریاضی میں ایک تہلکہ خیز کنٹری بیوشن کی، جس کو Binomial Coefficients کہتے ہیں۔ یورپ میں اس دریافت کا نام Pascal's triangle رکھ دیا گیا ہے۔

(۸) جدید محققین جیسے ایڈورڈ کینیڈی اور آٹو نیو گے برگر نے تسلیم کیا ہے کہ کوپرنیکس (وفات ۱۵۴۳ء) نے جدید اسٹرانومی کی جو عمارت تعمیر کی تھی وہ صرف اقلیدس کی کتاب ''عناصر'' اور جالینوس کی کتاب ''المجسطی'' کے مطالعہ سے ہی ممکن نہ ہوئی تھی، بلکہ اس میں دو تھیوریوں کا بہت دخل تھا۔ یہ تھیورم کوپرنیکس سے تین سو سال قبل اسلامی ممالک میں وضع کیے گئے تھے، جن کا مقصد یونانی علم ہیئت کی اصلاح تھا۔

تھیورم آف نصیر الدین کا نام Tusi Couple بھی ہے، جسے عالم بے بدل نصیر الدین الطوسی نے ۱۲۴۷ء میں وضع کیا تھا۔ اس تھیورم کی وضاحت کے لیے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جہاں اس موضوع پر معلومات کا بیکراں ذخیرہ موجود ہے۔ مختصر یہ کہ یہی تھیورم کوپر نیکس نے سولھویں صدی میں اپنی شاہکار کتاب میں پیش کیا اور جہاں الطوسی نے اپنی ڈایا گرام میں ''الف'' لکھا تھا، کوپرنیکس نے اسے A لکھا، جہاں الطوسی نے ''ب'' لکھا تھا اس نے B لکھا اور ہو بہو وہی ڈایا گرام پیش کی۔

دوسرے تھیورم کا نام الازدی تھیورم Al-Urdi ہے، جو محی الدین الازدی (وفات ۱۲۶۶ء) نے ۱۲۵۰ء میں پیش کیا تھا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ یہی تھیورم کوپرنیکس کی کتاب میں تین سو سال بعد نظر آتا ہے، طرفہ یہ کہ الازدی نے یہ تھیورم ایک نئے تصور کی صورت میں پیش کر کے اس کا حسابی ثبوت بھی پیش کیا، جب کہ کوپرنیکس نے اس کا ثبوت پیش نہ کیا، چنانچہ کیپلر Kepler اور اس کے استاد Meastlin کے درمیان خط و کتابت میں کیپلر نے اس کا ثبوت کیوں نہ پیش کیا تھا؟ چنانچہ اس کے استاد نے اس کا ثبوت خود پیش کر دیا۔ بہر حال یہ دونوں تھیورم کوپرنیکس کی اسٹرانومی میں اس قدر بنیادی ہیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن ہے۔

(۹) غیاث الدین الکاشی (متوفی ۱۴۵۰ء سمرقند) نے ریاضی اور اسٹرانومی میں اہم کنٹری بیوشنز کیں، خاص طور پر اس نے ڈیسی مل فریکشن میں اتنی اہم باتیں بیان کیں کہ وہ خود کو اس کا موجد تصور کرتا تھا۔ اس کو لمبی لمبی کیلکولیشن نکالنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ایکوایشن کے حل کرنے کا ایک ایسا نیا طریقہ ایجاد کیا جسے اب Homer's method کہا جاتا

ہے۔

(۱۰) ابن شاطر نے چاند کا جو ماڈل پیش کیا اور اس نے مرکری کے سیارہ کی حرکت کے بارے میں جو ماڈل تیار کیا، وہ ہو بہو وہی ہے جو کوپرنیکس نے پیش کیا تھا۔

(۱۱) جابر ابن افلاح اندلس کا ایک عظیم ریاضی دان تھا، جس نے پلین اور سفیریکل ٹریگو میٹری میں بہت اضافے کیے۔ اس کی کتابوں کے تراجم لاطینی اور عبرانی زبانوں میں کیے گئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ اس کے ٹریگو میٹری کے مسائل کو حل کرنے کے پیچیدہ طریقے پندرھویں صدی کے عظیم ریاضی دان جوہان مولر Muller (متوفی ۱۴۷۶ء) کی کتاب Die Triangulis (۱۴۶۴ء) میں پائے گئے۔ اس نے بعض پیراگراف تو ہو بہو نقل کر دیئے، چنانچہ اٹلی کے ریاضی دان کارڈانو (متوفی ۱۵۷۶ء) G. Cardano نے اس علمی سرقہ کو اپنی کتاب میں بے نقاب کر دیا۔ مزے کی ایک اور بات یہ ہے کہ کوپرنیکس نے اپنے علمی شاہکار میں جس قسم کی ٹریگو میٹری اپنی کتاب کے شروع میں ذکر کیا ہے۔ اس کی انسپریشن اسے جابر کی اصلاح المجسطی سے ملی، جو اسے کسی دوست نے تحفہ میں دی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کوپرنیکس نے جابر کی طرح جالینوس کے نظریات پر تنقید کر کے ایسے نظام کا خاکہ پیش کیا جس کا مرکز سورج تھا۔

(۱۲) مسلمان ریاضی دانوں کو اقلیدس کے پانچویں مفروضے کو دریافت کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس ضمن میں نصیر الدین الطوسی نے ایک جیومیٹرک کنسٹرکشن دریافت کی۔ الطوسی کی اس دریافت کو نیوٹن سے پہلے، برطانیہ کے عظیم ریاضی دان جان والس (۱۶۱۶۔۱۷۰۳) J. Wallis نے اپنی ریسرچ میں استعمال کیا۔ اس کے بعد ایک اور ریاضی دان (۱۷۳۳۔ ۱۶۶۷) Saccheri نے بھی استعمال کیا، مگر کسی نے بھی اس کا کریڈٹ الطوسی کو نہ دیا۔

(۱۳) بغداد کے مشہور ریاضی دان ثابت ابن قرۃ (متوفی ۹۰۱ء) amicable numbers تلاش کرنے کے لیے ایک منفرد فارمولا دریافت کیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ سات سو سال بعد فرانس کے ممتاز ریاضی دان پیئر فیرمٹ Pierre Femat (۱۶۰۱۔ ۶۵) نے ثابت ابن قرۃ کے عین فارمولا سے ملتے جلتے کو استعمال کر کے Second Pair of amicable numbers دریافت کیے، مگر آف کورس اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہ دیا۔

(۱۴) ایرانی ہیئت دان ابوالوفا نے اسٹرانومی میں ایک بنیادی چیز دریافت کی جسے اختلال قمر (lunar third indequality) کہا جاتا ہے، مگر اس کا سہرا بھی یورپ میں ڈینش اسٹرانومر ٹائیکو برائے (وفات ۱۶۰۱ء) کے سر باندھ دیا گیا ہے۔ (مسلم کنٹری بیوشن ٹو سویلائزیشن صفحہ ۱۲۰ از قلم حیدر بامیت، جنیوا ۱۹۶۲ء)

(۱۵) ابوریحان البیرونی دنیا کا پہلا ریاضی دان تھا جس نے ٹریگو میٹری کو ریاضی کی الگ شاخ تسلیم کیا تھا۔ اس نے علم مثلث کے بعض اہم ترین مسائل کی کتاب القانون المسعودی میں وضاحت کی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام نظریہ عوامل یعنی تھیوری آف فنکشن ہے۔ یہ آج کے دور میں جس طرح لکھا جاتا ہے، اس کا سلسلہ لامتناہی ہے، مگر البیرونی نے اسے صرف تین درجے تک لکھا ہے۔ اس کلیہ کو یورپ میں نیوٹن اور اس کے چند ایک ہم عصر ریاضی دانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (مسلمان سائنس دان از قلم ابراہیم عمادی ندوی، دہلی ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۹۶)

اس مضمون کو ہم پاکستان کے یگانہ روزگار سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کے ان سنہری الفاظ پر ختم کرتے ہیں: سائنس ایک مشترک تخلیق ہے اور ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ جہاں تک کوئی معاشرہ اس کی حوصلہ افزائی کرے گا، یہ اس کے اندر اپنی نشوونما کے عمل کو جاری رکھے گی۔"

سائنس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ تمام انسانیت اس میں شامل ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، کرۂ ارض کی تمام قوموں، نسلوں نے اس کی آبیاری میں حصہ لیا ہے اور لیتے رہیں گے۔ آج اگر مغرب اس کے پھلوں سے متمتع ہو رہا ہے تو یاد رہے کہ زمانہ کے بے رحم ہاتھ اسے چھین کر کسی اور قوم یا علاقہ کو دے بھی سکتے ہیں۔ اس مضمون میں جہاں مسلمانوں کے شان دار ماضی کی جھلک سامنے آتی ہے وہاں اس خواہش کا اظہار بھی ہے کہ کاش ہماری ملت کو پھر سے ایسے مواقع میسر ہوں کہ ایک بار پھر ہمارے اندر ایسے عالی دماغ سائنس دان پیدا ہوں، جن پر آنے والی نسلیں ناز کر سکیں۔

مسلمان سائنسی علوم کے وارث

پروفیسر راشدہ قریشی

علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا۔

''مذہب اقوام کی متوازی سیرت کا باعث ہے جو حیات ملی کا انمول سرمایہ ہے۔ یورپ نے تعلیم و تربیت میں سے مذہب کی اعلیٰ ترین رہنمائی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کی بے لگام انسانیت کا حشر کیا ہوگا۔''

بڑے بڑے دانشوروں اور عالموں نے بحر حال نسلوں کی آبیاری کا حامل مذہبی تعلیمات ہی کو مانا ہے۔ تعلیم مخصوص معاشی ہی نہیں بلکہ معاشرتی و ملی اعتبار سے وہ جزو لاینفک ہے جو نظریاتی و دینی مرکب سے ترتیب پاتا ہے۔ درس و تدریس کے عمل سے مذہبی و نظریاتی تعلیم سے اعتراض برتا جائے تو سماج کا معاشی اور اقتصادی پہلو تو قائم رہ سکتا ہے لیکن ایسی تعلیم ملکی بنیادوں جو کسی قوم کی ملی حیات کی سلامتی کے لیے اہم ہے کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ تعلیم نسلوں کی فکری آبیاری کا عمل اور سیرت و کردار کی تشکیل کا ذریعہ ہے۔ تعلیمی نصاب ڈھانچہ کو مذہبی و قومی امنگوں کے عین مطابق ہونا ہی قوموں کی راست ترتیب کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے ممالک، حتیٰ کہ امریکہ کی تعلیم کا اصل مرکوز بھی ان کی ملکی و فکری و دینی ضرورتوں کا آئینہ دار ہے۔

دراصل دین و دنیاوی تعلیم کا فرق مسیحی تصور ہے جو پاپائے روم کے استبداد کے خلاف مسیحی حکمرانوں اور اقوام کی بغاوت کو فکری جواز فراہم کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا اور یہ ہی سیکولر ذہن کی بنیاد بنا۔ ہمارے ہاں بھی اسی مسیحی سوچ کے حامل بعض طبقے سیکولر سوچ و فکر کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ طبقے مغرب کی ظاہری و مادی کھنک سے مرعوب ہو کر مغرب کو تہذیبی و فکری برتری دیتے ہیں اور مغرب ہی کو سولائزیشن یعنی مہذب ملکوں کا علمبردار سمجھتے ہیں دینی فکر کو دقیانوسی (Out dated) کہہ کر اپنی جان چھڑاتے ہیں۔ دوسری طرف مغرب میں مسیحی مشنری جماعتیں

دن رات اپنے عقائد و مذہبی نظریات کا پرچار کرنے میں سرگرم عمل ہیں یہاں تک کہ مسیحیوں نے تمام دنیا میں اپنے مذہبی بنیادی عقائد (Fundamental religious) کی ترسیل کے لیے تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں اور اربوں روپے مالی معاونت کے طور پر ان اداروں کو مسیحی مشنری سپرٹ کے فروغ کے لیے مختلف سماجی، غیر سیاسی و سیاسی حلقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنے مذہبی و دینی عقائد کی ترسیل کا کام کرتے وقت عدم اطمینان اور تذبذب کا شکار کیوں رہتے ہیں......؟ ہم اپنی تعلیم میں دینی تعلیمات ہی کو غیر اہم سمجھنے پر کیوں مجبور ہیں۔

اسلام ایک ایسا عظیم مذہب ہے جو ہمیں مکمل ضابطہ حیات دیتا ہے۔ اخلاقی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سیاسی و سماجی، تہذیبی و فکری عدالتی و خاندانی غرض ہر پہلو پر رہنمائی دیتا ہے اگر مسلمان ہر میدان زندگی میں رہنمائی کا اصل حاصل دین اسلام کو بنالیں تو نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر حکمران و فاتح بن جائیں گے اور یہ نقطہ شاید مغرب کے کرتا دھرتاؤں کو معلوم ہے اسی لیے وہ اسلام سے اور دین سے رغبت رکھنے والے مسلمانوں سے خائف رہتے ہیں اور یورپ و مغرب کی پوری کوشش ہے کہ وہ دین اسلام کو ایک گوشے میں محدود کر دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مغربی اقوام نے ہمیشہ اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کو اس بحث میں الجھا رکھا ہے کہ ملک میں اسلامی تعلیمات ہونی چاہیے یا نہیں ہونی چاہیے...... سائنسی علوم کو کمپلسری کیا جائے یا آرٹس و کلچر کی تعلیمات کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھال دیا جائے یا پھر نصاب تعلیم سے دینی تعلیمات کو خارج کر دیا جائے...... وغیرہ وغیرہ......؟

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں آئیڈیالوجی آف اسلام کو آئیڈیالوجی آف پاکستان قرار دیا اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پہلی تعلیمی کانفرنس میں قرار پایا کہ ملک کا نظام تعلیم اسلامی ہوگا اور اسلامی تعلیمات کو نصاب تعلیم میں لازمی رکھا جائے گا یہی نہیں بلکہ ملک کی بنیادی اساس نظریہ پاکستان کے مضمرات نوجوان نسل کو بتانے کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے تشکیل پاکستان سے لیکر اب تک نظریہ پاکستان کے مخالفین وطن عزیز کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے ہر طرح سازشوں کے بیج بوتے چلے آئے ہیں اور نظریہ پاکستان کی مختلف النوع تعبیریں دیتے آئے ہیں۔ کوئی اسے برصغیر کے مسلمانوں کی اقتصادی معاشی ضرورت قرار دیتا ہے۔ کوئی نظریہ پاکستان کو کانگرس کی متعصبانہ روش کا ردعمل قرار دیتا ہے۔ کوئی اسے محض سیاسی ضرورت کا نام دیتے ہیں اور اب تو کچھ نام نہاد دانشوروں نے یہ کہہ کر حد ہی کر دی کہ نظریہ پاکستان کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور یہ لفظ پاکستان بننے کے ۲۵ سال بعد جماعت اسلامی نے ۱۹۶۹ء میں استعمال کیا۔ اسی کشمکش میں مبتلا ہو کر ہم اپنی نوجوان نسل کو نظریہ پاکستان اور

اسلامی تعلیمات سے دور کر رہے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل کو اس بات سے آگاہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی سے دوقومی نظریہ کی ابتداء ہوگئی تھی۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان خود کو کبھی بھی ہندوستانی قومیت کے سانچے میں نہ ڈھال سکے بلکہ انہوں نے اپنا الگ وجود برقرار رکھا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یہ درست فرمایا تھا کہ ہندوستان میں نظریہ مسلم قوم پرستی اسی وقت معرض وجود میں آ گیا تھا جب یہاں کا پہلا فرد حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا اور مسلمانوں نے اپنا معاشرتی کردار ہندوانہ تہذیب و تمدن میں مدغم نہ ہونے دیا۔ مشہور مورخ و سیاح البیرونی نے اپنی کتاب ''الہند'' میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی عادات و روایات مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ کتاب ''الہند'' میں البیرونی نے تفصیل کے ساتھ دونوں قوموں کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کو بیان کر دیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مذہبی عقائد اور تہذیبی اقدار کا تضاد ہی تھا کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم کے دھارے میں نہ بہہ سکے۔ سیکولرازم کا تصور بری طرح ناکام ہوا اور قومی افق پہ فسادات نمایاں رہے۔ غیرملکی قوت نے جب ہندوستان پر غلبہ حاصل کیا تو سر سید احمد خاں نے اپنے شروع کے دور میں بڑی کوشش کی کہ برصغیر میں مسلمان و ہندو ایک قوم کی صورت زندگی گزار سکیں۔ لیکن ان کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ حقیقت میں ایسا ممکن نہیں ہوسکتا سرسید نے تعلیمی درس گاہوں میں دوقومی نظریہ کی تبلیغ کرنا شروع کر دی تھی۔ سرسید احمد خان وہ مسلم دانشور اور مسلمانوں کے قائد ہیں جنہوں نے جدید علوم کو مسلمانوں کے لیے اہم سمجھا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کی اور تعلیم کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے علاوہ دینی علوم کو مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا۔ ہم سرسید کے مطابق جدید علوم حاصل کرنے سے بین الاقوامی سطح پر برابری کے قائل ہوسکتے ہیں لیکن اپنی روایات و مذہبی اقدار کے ساتھ جدید علوم سے آراستہ و پیراستہ ہوکر مسلمان برابری کی سطح ہی پر نہیں بلکہ پروقار انداز میں عالمی برادری میں اپنی شناخت قائم کرسکیں گے۔

اسلامی تاریخ کا مشاہدہ اس بات کا غماز ہے کہ جب تک مسلمانوں کا تعلیمی نظام ٹھوس بنیادوں پر استوار رہا مسلمان ہر تحریک میں کامیاب ہوئے ہر تصادم کے فاتح ٹھہرے اور پوری دنیا کے علمبردار ہوئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سائنس کے علوم سے روشناس کرانے کی ترغیب مسلمانوں کو دینا ایک عجیب سی بات معلوم ہو رہی ہے کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ خود بتا رہی ہے کہ سائنسی علوم کی ابتداء اور تحقیق و ایجادات مسلمان سائنسدانوں کے ہاتھوں ہی سے ہوئی ہیں۔ جابر بن حیان، موسیٰ بن الخوارزمی، یعقوب الکندی، محمد بن زکریا الرازی، ابن الہیثم اور بوعلی سینا جیسے

مسلمان سائنسدانوں و محققین نے علم کی دنیا میں اپنا سکہ منوایا۔ جس جدید سائنس کے علوم حاصل کرنے کی ترغیب مسلمانوں کو دی جارہی ہے اور مسلمانوں کو سائنسی علوم سے بے بہرہ ہونے پر پسماندہ قرار دیا جارہا ہے حقیقت میں وہی مسلمان جدید سائنس کے اصل موجد ہیں۔ مسلمان مفکرین پر سائنسدانوں و مشاہیر کی تصانیف آج بھی یورپ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ذرا اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جس وقت عالم اسلام دینی و سائنسی و جدید علوم کی روشنی سے منور تھا، اس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت علمی میدان میں مسلمانوں کا عروج حکمرانوں کی علم دوست پالیسیوں کے سبب تھا۔ اس وقت مسلمانوں پر دینی و دنیاوی ضرورتوں سے ہم آہنگ علم پرور حکومتیں تھیں۔ یہ حکومتیں اپنے تشخص، اپنی شناخت اپنی ایکتا اکائی اور اپنی پہچان سے واقف تھیں...... اور ان عظیم رہنماؤں کو اپنے مذہب اقدار و دینی اصولوں سے قلبی رغبت تھی۔ اگر آج بھی ہم اسلام کی روح کو اپنے قلب و نظر میں ڈھال لیتے ہیں تو ہماری سربلندی یقینی ہے کیونکہ مسلمان اسلام کو سربلند نہیں کرتا بلکہ اسلام نے ہمیشہ مسلمان کو سربلند کیا ہے اور اسلامی تعلیمات و جدید علوم کو ضد بنا کر ہم خود ہی اپنی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے پر تل گئے ہیں۔ محمد علی جناح نے پاکستان ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے تشکیل نہ دیا تھا بلکہ انہوں نے ایک ایسی ریاست کا قیام چاہا تھا جہاں اسلامی اصولوں کو آزمایا جا سکے۔ چنانچہ ان اصولوں کو اپنی نوجوان نسل کے سامنے واضح کرنے کے لیے ہمارے نصاب تعلیم کا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک موقع پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقت میں مسلمانوں کو بچایا اور آج بھی اگر مسلمان اپنے تصور کو اسلام پر مرکوز کریں اور اس سے زندگی کی امنگ حاصل کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاریں تو آپ کی پراگندہ قوتیں ازسرنو حیات پاسکتی ہیں اور انتشار سے جو کال ہلاکت ہے سے بچ کر ایک عظیم وفعال قوت بن سکتے ہیں۔''

اسی نکتہ کے پیش نظر تعلیمی نصاب میں حالیہ متوقع تبدیلی جو کہ وفاقی وزارت تعلیم نے ایس ڈی پی آئی۔ Sustainable Development Policy Instituite کی رپورٹ کی روشنی میں کرنے کا خیال باندھا ہے۔ پوری قوم نے مسترد کر دیا ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ نصاب تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور وہ اسلامی تعلیمات کی اہمیت سے انحراف کر کے دراصل اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ جدید علوم و سائنسی فکر و ہنر کی اہمیت اپنی جگہ لیکن دینی تعلیمات کو سائنسی و جدید علوم کی آبیاری پر قربان کرنے کی گمراہ کن سوچ پہ افسوس ہوتا ہے۔ پوری قوم یہ ہی چاہتی ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم

اسلامی اور دو قومی نظریہ کی اساس پر قائم ہو۔

نصاب تعلیم ہی کے ذریعے ہم اپنی نسلوں کو اپنے دینی و قومی مسلک سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ پرائمری و مڈل کلاسوں کے چند طلباء کے والدین سے ملاقات کی گئی اور ان سے جب نصاب تعلیم سے دینی تعلیمات کے حذف کرنے پر استفسار کیا گیا تو والدین نے یہ ہی کہا کہ یہ ہماری نسل کو مذہب سے دور رکھنے کی سازش ہے اور ہمیں سیکولر سوچ کا حامل بنایا جا رہا ہے۔ والدین نے کہا کہ اگر نصاب تعلیم سے دینی و نظریاتی علوم کو حذف کرنے کی مذموم کوشش کی گئی تو ہم اپنے وجود کی نفی کرنے کے مرتکب ہوں گے...... اور ہم ہرگز ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

مسلمان اور جدید علوم وفنون

پروفیسر عبدالاحد رفیق

کائنات کے مسخر کرنے اور سورج، چاند، ستاروں اور تمام ارضی وسماوی مخلوق کا انسان کے خدمت گار ہونے کا نظریہ اسلام نے اس وقت دنیا کو دیا تھا جب کہ مشرقی اور مغربی دنیا کی بہت سی قومیں سورج، چاند اور ستاروں کو ایک مافوق الفطرت طاقت سمجھ کر ان کے آگے سر جھکائے ہوئے تھیں اور انہیں اپنا معبود تسلیم کرتی تھی اور دوسری طرف مطالعہ فطرت اور کائنات کے سربستہ رازوں کی دریافت کو کفر والحاد قرار دیتی تھیں۔ اقوام عالم جس وقت سائنس کے عناصر آگ، پانی، ہوا، بجلی، دریا، پہاڑ، سورج وغیرہ کو مافوق القوۃ اور مقدس اشیاء سمجھ کر ان کی پرستش میں لگی تھیں، سب سے پہلے قرآن نے ہی یہ اعلان کیا تھا:

> ''وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو زمین میں ہے۔'' (البقرۃ:۲۹)

اور سب سے پہلے قرآن نے ہی عقل وخرد سے کام لینے کی دنیا بھر کو دعوت دی تھی اور فرمایا تھا:

> '''' بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن رات کے الٹ پھیر میں بڑی نشانیاں ہیں، عقل مندوں کے، لیے۔ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر، اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! تو نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔'' (آل عمران:۱۹۰،۱۹۱)

اور دنیا کی تمام جائز اور پاکیزہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لیے قرآن ہی نے سب سے پہلے تعلیم دی تھی:

''کہو کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی، اور کھانے پینے کی پاک صاف چیزیں، کہیے یہ سب چیزیں اہل ایمان کے لیے ہیں دُنیا کی زندگی میں اور آخرت کی زندگی میں ان ہی کے لیے ہیں سب نعمتیں۔'' (الاعراف ۷:۳۲)

دشمنوں کی مدافعت اور اپنے وجود کے باقی رکھنے کے لیے ہر قسم کے جنگی سامان تیار کرنے اور ضروریات زمانہ کے مطابق وسائل وذرائع اختیار کرنے اور پیش آمدہ حاجات کے لیے ایجادات واختراعات کا حکم بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے اپنے پیروؤں کو دیا تھا:

''جہاں تک ہو سکے قوت وطاقت کے سامان پیدا کر کے اور گھوڑے تیار کر کے دشمنوں کے مقابلے کے لیے تیار رہو، اس تیاری سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا کر رکھو گے اور ان لوگوں پر بھی جن کی تمھیں خبر نہیں لیکن اللہ جانتا ہے۔'' (الانفال ۸:۶۰)

اسلام کی یہی وہ تعلیم اور یہی وہ پیش کردہ تخیل تھا جس کی بنا پر مسلمانوں نے بعد میں ضروریات زمانہ کے مطابق علوم وفنون حاصل کیے اور ان کو درجہ کمال تک پہنچایا۔

منطق، انجینئرنگ، ریاضی، الجبرا، ہیئت، نجوم، طب، فلسفہ، فن تعمیر، صناعی، ادب، شاعری غرضیکہ ہر قسم کے علوم وفنون سیکھے اور دنیا کو ایک نیا اور اعلیٰ تمدن دیا۔

مسلمانوں کے یہی علوم وفنون تھے، جنہوں نے بالآخر مغربی دنیا کو اس قابل بنایا کہ اس نے سائنس کے جدید ایجادات واکتشافات میں دنیا بھر کی امامت حاصل کی اور مسلمانوں نے اپنی غفلت اور عاقبت نااندیشی سے جب سے قرآن کو چھوڑا تو ایک طرف روحانی اور اخلاقی دولت سے تہی دست ہو گئے تو دوسری طرف علوم وفنون اور سائنس کو بھی چھوڑ بیٹھے۔ اس طرح دین ودنیا دونوں کا نقصان اٹھایا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان نے ہی یورپ کو نشاۃ ثانیہ کے قابل بنایا ہے۔ اس کے ثبوت میں مغربی محققین اور مستشرقین ہی کے بیانات کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ جان ڈیوٹ ریورٹ لکھتا ہے:

''تمام علوم مثلاً طبعیات، نجوم، فلسفہ اور ریاضی جو چودھویں صدی عیسوی مدارس سے منقول ہیں۔ اس بنا پر ہسپانیہ کو یورپی فلسفہ کا موجد تسلیم کرنا چاہیے۔''

پروفیسر فلپ اپنے مذہبی تعصب کے باوجود قرون وسطیٰ کے عربیوں کے حالات بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی مسلمان آگے چل کر قرون وسطیٰ میں یورپ کو ایسے ذہنی اثرات کے منتقل کرنے کا وسیلہ بنے جنھوں نے مغربی دنیا کو بیدار کر کے اسے نشاۃ جدید کی شاہراہ پر گامزان ہونے کے قابل بنا دیا۔''

''انسانیت کی بہتری اور بھلائی کے لیے جیسی خدمات عربوں نے قرون وسطیٰ کی ابتدا میں انجام دی ہیں ویسی خدمت کسی اور قوم نے انجام نہیں دی۔''

اس زمانہ میں جب کہ عرب علماء ارسطو کا مطالعہ رہے تھے، یورپ میں شارلیمان اور اس کے امراء اپنے نام کے ہجے سیکھ رہے تھے، ایک اسلامی شہر قرطبہ ہی میں سترہ بڑے کتب خانے تھے اور ان میں سے ایک ایک کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں، ایسے زمانے میں جب کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے علماء حمام میں غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم جانتے تھے، اسی قرطبہ کے مسلمان سائنس دان پر تکلف اور نزہت بیز حماموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مسلمانوں کے علوم و فنون کا حال پروفیسر حتی نے اپنی کتاب History of Arabs میں تفصیل سے لکھا ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''خلیفہ المقتدر کے حکم سے ۹۳۱ء میں طبیبوں کا امتحان لینے کی غرض سے شہر بغداد میں ایک ممتاز طبیب سنان بن ثابت بن قرۃ کا تقرر عمل میں آیا، اس طبیب کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صرف ایسے ہی طبیبوں کو علاج و معالجہ کا اجازت نامہ عطا کرے جو مقررہ شرطوں پر پورے اتریں، شہر بغداد کے آٹھ سو سے بھی زیادہ طبیبوں نے اس عمل امتحان میں کامیابی حاصل کی اور سارا دارالخلافہ غیر مستند اور اناڑی طبیبوں سے پاک ہو گیا۔''

ان حقائق سے صحت عامہ میں عربوں کی دانشمندانہ دلچسپی کی شہادت ایک ایسے زمانہ میں ملتی ہے جب کہ ساری دنیا ابھی اس کوچے سے نا آشنا تھی۔

رازی (متوفی ۹۲۹ء) نہ صرف پوری دنیائے اسلام میں بلکہ تمام قرون وسطیٰ کے بدیع مفکروں اور طبیبوں میں سب سے زیادہ ذہین اور طباع مفکر اور طبیب ہوا ہے، وہ بغداد کا سب سے بڑا طبیب تھا، کہتے ہیں کہ بغداد کے ایک نئے بڑے شفاخانے پر گوشت کے ٹکڑے لگا دیتے تھے اور اس مقصد کے لیے اس نے اسی مقام کو منتخب کیا تھا، جہاں گوشت کے سڑنے کی علامتیں

سب سے کم پائی گئی تھیں۔ جراحی کی وہ سوئی جس سے زخم کھولا جاتا ہے اور جن کو انگریزی میں Seton کہتے ہیں اس کی ایجاد بھی جاتی ہے۔ الکیمیا پر اس نے عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب الاسرار بھی ہے، یہی کتاب الاسرار چودھویں صدی تک کیمیائی معلومات کا ایک زبردست سرچشمہ بنی رہی لیکن رازی کا اہم ترین کارنامہ اس کی جامع کتاب الحاوی ہے، یہ کتاب طبی معلومات کی قاموس کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس میں ان تمام معلومات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جو اس زمانہ تک یونانی، ایرانی، اور ہندوستانی طبی ادب سے عربوں نے حاصل کی تھیں۔
عربی طب کی تاریخ میں رازی کے بعد دوسرا ممتاز نام ابن سینا کا ہے، جسے یورپ والے Avicenna کہتے ہیں، اس کی سب سے بلند پایہ قاموسی کتاب القانون فی الطب ہے جس کا ترجمہ یورپ میں Canon کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس زمانہ کے طبی ادب میں اس کتاب نے بتدریج وہ قدر و منزل حاصل کر لی تھی کہ یورپ کی تمام طبی درسگاہوں میں اس کو درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، بارھویں دی سے سترھویں صدی تک مغربی دنیا میں اس کتاب کو ایک زبردست طبی رہبر کی حیثیت حاصل رہی ہے، ڈاکٹر وسیم اسلر کے الفاظ میں یہ کتاب تمام دوسری طبی کتابوں کے مقابلہ میں طویل ترین مدت تک طب کی انجیل بنی رہی ہے۔

اسی صدی آٹھویں کے وسط میں خلیفہ مامون نے بغداد کے اندر اور دمشق کے باہر فلکیاتی رصدگاہیں قائم کرائیں، اس زمانے کی صدرگاہوں کا ساران سامان حزولہ اضطراب، مقیاس الارتاع اور کرے پر مشتمل ہوتا تھا۔ خلیفہ کے ہیئت دانوں نے زمین کی مساحت کا ایک نازک ترین عمل یعنی ارضی زاویہ کے درجہ کا طول معلوم کیا، یہ ہیئت دان زمین کی گولائی کے مفروضے پر زمین کی جسامت اور اس کا محیط متعین کرنا چاہتے تھے، یہ پیائش دجلہ کے شمالی میدان اور تدمر (Palmyra) کے قریب عمل میں لائی گئی تھی یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نصف النہار کے ایک درجہ کا طول ۵۶ ۲/۳ عربی میل ہے، بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ نتیجہ تقریباً صحیح نکلا کیوں کہ اس مقام پر نصف النہار کے ایک درجہ کا جو حقیقی طول ہے اس سے ان ہیئت دانوں کا دریافت کیا ہوا طول صرف ۳۸۷۷ فٹ زیادہ ہے، الخوارزمی کی قدیم ترین فلکیاتی جدولیں وغیرہ ریاضی اور الجبرا کی قدیم ترین درسی کتابوں کی حیثیت سے پڑھائی، اسی ترجمہ کی بدولت یورپ الجبرا کے نام اور اس کے علم سے روشناس ہوا۔

جابر بن حیان کو جسے یورپ والے Geber کہتے ہیں، عربی الکیمیا کا موجد سمجھا جاتا ہے، جابر نے تحویل اور تجزیہ جیسے دو اہم کیمیائی تعاملات کی سائنٹفک طریقے پر تشریح کی ہے وہ تمام سلفیورک اور نائٹرک ترشوں (گندھک) اور شورے کے تیزاب کی تیاری سے واقف تھا، ان

دونوں ترشوں کو ملا کر ماء الملوک تیار کرنا بھی اسے آتا تھا جس میں سونے اور چاندی کو حل کیا جا سکتا تھا، مجموعی طرح ترمیم کی کہ یہ نظریہ معمولی ردوبدل کے ساتھ جدید کیمیا کی ابتداء یعنی اٹھارھویں صدی تک مروج ومقبول رہا۔

بطلیموس کی کتاب جغرافیہ کا عربی میں کئی بار ترجمہ راست یونانی یا سریانی سے کیا گیا اور اسی سے الخوارزمی نے زمین کا نقشہ تیار کیا، اصل میں یہ دنیا کا نقشہ تھا اسے خوارزمی اور دوسرے ساٹھ علماء نے مل کر تیار کیا تھا، اور یہ اسلام میں کرۂ ارض اور اجرام فلکی کا سب سے پہلا نقشہ تھا۔

مسلم اسپین کا سب سے زبردست اور جید عالم اور بدیع مفکر علی ابن حزم گزرا ہے۔ یہ ۹۹۴ء میں تولد ہوا اور ۱۰۶۴ء میں فوت ہوا، علی بن حزم کا شمار ایسے دو تین اسلامی مصنفوں میں ہوتا ہے جن کا ذہن نہایت شادات اور جن کی تصانیف بے شمار ہیں، سوانح نگاروں نے تاریخ، فقہ حدیث، منطق، شاعری اور متعلقہ موضوعات کی کوئی چار سو کتابیں اس نے مکتوب کی ہیں۔

مغربی مسلمانوں نے ادب اور تاریخ کے میدان میں جو کمال دکھائے ہیں ان میں بنی نصر کے دربار کے دو عہدہ دار دوستوں یعنی ابن الخطیب اور ابن خلدون کا مرتبہ بہت بلند ہے، ابن خطیب نے شاعری، تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر ساٹھ کتابیں لکھی ہیں۔

ابن خلدون کو اپنے مقدمہ (تاریخ) کی بنا پر بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں اس نے پہلی بار تاریخ کے ارتقاء کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس نظریہ میں اخلاقی اور روحانی قوتوں کے سوا آب وہوا جغرافیہ کے طبعی حقائق میں پورے وقوف وآگہی کے ساتھ بیان کیے ہیں، قومی عروج وزوال کے قوانین کی دریافت اور ان کی تدوین کی سب سے پہلی کوشش ابن خلدون ہی نے کی ہے، اس لیے ابن خلدون کو...... جیسا کہ خود اس نے دعویٰ کیا ہے فن تاریخ کی اہمیت اور اس کی وسعت کا انکشاف کرنے والا کم سے کم عمرانی علوم کا حقیقی بانی کہا جا سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ابن خلدون سے پہلے تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ایسی وسیع اور فلسفیانہ نظر، یورپ والوں کا ذکر ہی کیا کسی عرب مصنف نے بھی ایسی نظر نہیں ڈالی تھی، ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں وفات پائی، دنیا نے اس کے کارناموں پر جتنی تنقیدیں اور تبصرے کیے ہیں ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ وہ اسلام کا عظیم ترین اور دنیا کا زبردست مفکر تاریخ گزرا ہے۔

"اشبیلیہ کے ابن العوام نے بارھویں صدی کے آخر میں زراعت پر ایک رسالہ لکھا ہے، اسے موضوع پر نہ صرف اہم ترین اسلامی رسالہ مانا جاتا ہے، بلکہ سارے قرون وسطیٰ میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں منظر عام پر آئیں ان سب میں اس رسالہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

اسپین بلکہ اسلامی دنیا کا مشہور ترین عطار اور ماہر نباتیات عبداللہ بن احمد بن بیطار گزار

ہے۔ الکندی کا کارنامہ بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے، فلسفی کی حیثیت سے انہوں نے افلاطون اور ارسطو کے نظریوں کو نو افلاطونیوں کے انداز میں باہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی اور نوفیثا غورثی ریاضیات کو وہ پورے سائنس کی اصل سمجھتا تھا۔ وہ کیمیادان اور ماہر بصریات بھی تھا، بصریات کے موضوع پر اس کی ایک اہم کتاب جو اقلیدس کی کتاب بصریات (Optics) پر مبنی ہے، ایک عرصہ تک مشرق اور مغرب میں کثرت سے مستعمل رہی، راجر بیکن بھی اس کتاب سے متاثر ہوا ہے۔

خورستان کے شہر تستر اور سوس میں کئی کارخانے ایسے تھے جو دمشق (کپڑے کی ایک قسم) جو ابتدا میں دمشق میں تیار ہوتا تھا۔ اس کی زردوزی اور نقلی ریشم کے پردوں کے لیے مشہور تھے، شیراز میں اُون کی دھاری دار عباؤں کے سوا جالیاں، کمخواب اور زربفت کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، قرون وسطٰی کی یورپین خواتین اپنے شہروں کی دوکانوں سے ایرانی ریشمی کپڑا خریدا کرتی تھیں۔

مشرق میں مسلمان تاجروں کے قافلے چین تک پہنچ گئے تھے، یہاں ان کی تجارت ریشم پر مبنی تھی، ایران اور عراق کے اکثر علاقوں میں اعلیٰ درجہ کے قالین اور کپڑے تیار ہوتے تھے، کوفہ میں ریشم پیدا ہوتا تھا، یہاں سر کے ریشمی رومال بھی بنے جاتے تھے۔

صوبہ صید اور دوسرے شامی شہروں کے شیشے صفائی اور نزاکت کے لحاظ سے ضرب المثل بن گئے تھے۔ شام میں شیشے اور دھات کے جو ظروف بنائے جاتے تھے ان کی مانگ برتنے اور تزئین و آرائش کے لیے بہت زیادہ تھی۔

اسلامی اندلس اور اطالیہ سے بارھویں صدی میں کاغذ سازی کی صنعت نصرانی یورپ میں منتقل ہوئی اور یہاں متحرک ٹائپ کے ذریعہ طباعت کی دریافت ہوئی۔ اس صنعت نے تعلیم عام کی اشاعت کے امکان پیدا کیے جس سے آج یورپ اور امریکہ دونوں بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

مولانا حالی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے:

وہ بلد کہ فخر بلاد جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا
عراق جس سے رشک جناں تھا
اُڑا لے گئی باد پندار جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار جس کو

سمر قند سے اندلس تک سراسر
انہیں کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیون پر
زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں
مورخ ہیں جو آج تحقیق والے
تفحص کے ہیں جن کے آئین نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے
زمیں کے طبق سربسر چھان ڈالے
عرب ہی نے دل ان کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترانے
اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا
ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
درایت کے سورج پہ ابر آ رہا تھا
شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا
سر رہ چراغ ایک عرب نے جلایا
ہر ایک قافلہ کا نشاں جس نے پایا

فلکیات میں مسلمانوں کی تحقیقی کاوشیں اور ان کے اثرات

مزمل حسن صدیقی

کائنات اور اس میں موجود تمام اجرام فلکی کے سائنسی بنیادوں پر مطالعہ کو ہیئت و فلکیات (Astronomy) کہا جاتا ہے۔ اس میں سورج، چاند، سیارے، دمدار ستارے اور سیارچے، مختلف کہکشائیں، کائنات میں موجود ہال یعنی نیبولا اور شہاب ثاقب وغیرہ کا مطالعہ شامل ہے۔ مسلم عہد میں اسے خاص طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا جسے ''علم الھیئت'' یعنی کائنات کی ہیئت کا علم اور ''علم الافلاک'' یعنی کرات سماوی کا علم کہا جاتا تھا۔ اس کے تحت اجرام فلکی کے مطالعہ کے بعد ان کے قواعد وضوابط مرتب کیے جاتے ہیں۔ ان کے اجرام کی حرکات کی توضیح کے لیے متحرک نمونے یعنی Models تیار کیے جاتے جنہیں تصنیف کی شکل میں جمع کر دیا جاتا۔ اس کو زیج یا جدول کا نام دیا جاتا اور ان میں مشاہدے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی تمام معلومات جمع ہوتی تھیں۔ ان زیجوں کی مدد سے کہیں بھی کوئی ہیئت دان مزید تحقیق کر سکتا تھا۔ سائنس کے اس قدیم ترین مضمون کو مسلمانوں نے پہلی مرتبہ بے بنیاد مفروضات و خیالات سے علیحدہ کر کے سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور اس قابل بنا دیا کہ سائنس کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے۔

ظہور اسلام سے قبل اور مسلم عہد کے ابتدائی دور کے عرب ستاروں سے دلچسپی اور ایک حد تک ان کے متعلق علم بھی رکھتے تھے۔ عرب کے صحراؤں میں منزل کے تعین کا اہم ترین ذریعہ ستارے ہی تھے جن کی مدد سے سفر کرنیوالے قافلے اپنا راستہ تلاش کرتے تھے۔ اگرچہ عرب عموماً ان پڑھ تھے لیکن ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ وہ سال کے مختلف موسموں میں نظر آنے والے ستاروں سے خوب واقف تھے اور ان کے نام و مقامات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔

مسلم عہد میں فلکیات کی باقاعدہ تحقیقی سرگرمیوں کا آغاز کم وبیش ۱۵۴ھ/۷۷۱ء میں دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کے عہد سے ہوا جب کہ بعض روایات کے مطابق فلکیات کے ہندی مسودے ''سدھانت'' کو بغداد کے دربار میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ مسلمانوں نے ہیئت و فلکیات کی قدیم معلومات جن ذرائع سے حاصل کیں ان میں ہندوستانی اور ایرانی ذرائع کو اولیت حاصل ہے۔ مذکورہ بالا ہندی مسودے ''برہم سپھت سدھانت'' کا پہلا عربی ترجمہ المنصور کے حکم پر شاہی منجم ابوابراہیم انفراری نے کیا۔ اس کتاب کا مصنف برہم گپت تھا اور اس نے یہ ۶۲۸ء میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا ایک اور ترجمہ یعقوب بن طارق نے کیا۔ عباسی دربار میں موجود ایرانی عنصر کی بدولت فلکیات پر ایرانی تصانیف بغداد پہنچیں۔ ایران میں ساسانیوں کے عہد میں ہیئت و فلکیات کی تحقیق کو عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں جندے شاپور (موجودہ اہواز کے قریب) کو علمی حیثیت حاصل رہی۔ اس دور کی اہم تصنیف ''زیک شتر واریا'' (زیج الشہر یار) کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ یہ دونوں ماخذ یونانی فلکیات ہی سے متاثر تھے جن کی طرف بعد میں توجہ کی گئی۔ یونانیوں کی تصانیف کے حصول کی طرف مامون الرشید نے کافی توجہ دی، اسے ان علوم کے فروغ میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ یونانی تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت اسکندریہ کے بطلیموس کی المجسطی کو حاصل تھی اس تصنیف کا پہلا قابل ذکر ترجمہ مامون کے عہد میں حجاج بن مطر نے ۸۲۷-۸/۲۱۲ھ میں کیا اور اس کے بعد ایک اور ترجمہ حسین بن اسحاق نے نویں صدی عیسوی کے وسط میں کیا جس پر نظر ثانی بن قرہ نے کی۔ اس کے علاوہ دوسرے یونانیوں مثلاً ارسطا سالیس بابرکس ثاون الاسکندری اوطولوقس ذوسیوس وغیرہ کی تصانیف کے تراجم کیے گئے۔

ابوابراہیم انفراری کو مسلم تاریخ کا پہلا قابل ذکر ہیئت دان تسلیم کیا جاتا ہے۔ المنصور کی وفات کے بعد مہدی اور ہادی کا دور حکومت مختصر رہا۔ ہارون الرشید کے دور خلافت میں فلکیات سے متعلق سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں بہت سی تصانیف کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ لیکن فلکیات کی تحقیقات کو معراج مامون الرشید کے عہد میں حاصل ہوا، جب علوم وفنون کے فروغ کے لیے ''بیت الحکمت'' کی تشکیل کی گئی۔ مامون الرشید کی عقلیت پسندی سے کسی حد تک اسلام کو نقصان بھی پہنچا۔ لیکن اس کے دور میں سائنسی تحقیق میں بہت زیادہ پیش رفت ہوئی۔ اس کے عہد میں مسلم عہد کی پہلی رصدگاہ تعمیر کی گئی۔ بغداد کی رصدگاہ سے حباش الحاسب نامی ہیئت دان منسلک تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے چالیس برس فلکی مشاہدات میں صرف کیے۔ مامون ہی کے عہد میں موسیٰ بن شاکر نامی ریاضی دان کے تین بیٹے محمد بن موسےٰ، احمد بن موسےٰ اور حسن بن

موسے بغداد میں فلکی مشاہدات میں مصروف تھے، متوکل کے عہد میں ابومعشر البلخی اور احمد کثیر فرخانی گزرے ہیں۔ ابومعشر کی اور تصانیف کے علاوہ ''کتاب المدخل الکبیر'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ احمد کثیر نے اپنے فلکی مشاہدات کی بنیاد پر ''جوامع العلوم'' مرتب کی تھی۔ عہد عباسیہ کا ایک عظیم ہیئت دان ابوعبداللہ البتانی تھا۔ جس نے دریائے فرات کے کنارے رقہ کے مقام پر ۸۷۷ء سے ۹۱۸ء تک فلکی مشاہدات کیے اور اس کے نتیجے میں ''زیج البتانی'' تصنیف کی۔ یہ شخص اپنے مشاہدات میں نہایت محنت اور احتیاط کرتا تھا۔ البتانی نے بطلیموس کی ''المجسطی'' کی کئی غلطیوں کی اصلاح کی۔

جب آل بویہ نے بغداد پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی ہیئت وفلکیات کی تحقیقی سرگرمیوں میں دلچسپی لی اور بہت سے ہیئت دانوں کو اپنے دربار میں جمع کر لیا۔ اس دور کی اہم شخصیات میں عبدالرحمٰن الصوفی، ابن اعلم، ریجن بن رستم، احمد الساغانی اور ابوالوفا شامل تھے۔ عبدالرحمٰن الصوفی کی تصنیف ''صور الکواکب'' مشاہداتی فلکیات میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ مسلم ہیئت کی معلومات کا اہم ذریعہ بھی تھی۔ ابوالوفا بوزجانی کو ریاضی اور فلکیات پر مکمل عبور حاصل تھا۔

اسی زمانے میں غزنی کے مقام پر البیرونی موجود تھا جس کی شخصیت ایک ''دائرہ المعارف'' کی حیثیت رکھتی تھی۔ البیرونی دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ ریاضی اور فلکیات کا بھی بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی کتاب ''قانون مسعودی'' مسلم فلکیات کی عظیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ''کتاب التفہیم'' بھی تصنیف کی جو عربی اور فارسی دو زبانوں میں لکھی گئی۔ ایک اور شخصیت جسے اس کی علمی قابلیت کی بنا پر ''شیخ الرئیس'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ابن علی سینا تھا۔ جہاں اس نے طب میں ''القانون'' جیسی معرکتہ الآرا کتاب تصنیف کی وہاں فلکیات اور ریاضی کا بھی وہ بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے بخارا میں ''المجسطی'' کی تعلیم اپنے استاد عبداللہ الناتلی سے حاصل کی تھی۔ آخر عمر میں ابن علی سینا نے متحرک پیمانے (Vehmeir) کی طرز کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا۔

فاطمی عہد حکومت میں مصر میں ہیئت وفلکیات کی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ فاطمی حکمران العزیز اور اس کے بیٹے الحاکم کو تاریخ میں اس حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں علوم وفنون کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عالم اسلام کا مشہور ہیئت دان ابن یونس انہی کے دور میں ان مشاہدات کے نتیجے میں جدول مرتب کی اور الحاکم کی نسبت سے اس کا نام ''الزیج الکبیر الحاکمی'' رکھا۔ ابن یونس غالباً پہلا شخص تھا جس نے پنڈولم کی

حرکت کا ٹھوس سائنسی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا اور اسے اپنے سائنسی تجربات میں استعمال کیا۔ ابن یونس کا ہم عصر ابن الہیثم تھا جو ہیئت دان ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر طبیعیات اور انجینئر بھی تھا۔ ابن الہیثم نے فضا کا مطالعہ کیا اور اس کا ارتفاع معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے قضائی انعطاف کی تشریح کی اور معلوم کیا کہ سورج اس وقت تک نظر آتا رہتا ہے جب تک وہ افق سے 19° درجے نیچے نہیں چلا جاتا۔ اس کے علاوہ افق کے قریب سورج اور چاند کی ظاہری جسامتوں سے اضافے کی وجہ دریافت کی ابن الہیثم پہلا شخص تھا جس نے محدب عدسوں کا اصول دریافت کیا اور بتایا کہ عدسوں میں یہ قوت ہے کہ کسی چیز کو اس کی اصلی جسامت سے کئی گناہ بڑا کر کے دکھائیں۔ تصنیف ''سائنس کے دو ہزار سال'' میں ہاروے اور گبن لکھتے ہیں۔

''ابن الہیثم کی اس دریافت کی بدولت عدسوں کی تیاری ممکن ہوئی جس نے دور بین اور خورد بین کی ایجاد کی راہ ہموار کی۔''

اندلس کو مسلم عہد میں سائنسی علوم کے نہایت اہم مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہاں ہیئت و فلکیات کی تحقیق میں مسلمانوں کی دلچسپی کا اندازہ ''یورپ میں مسلمانوں کی سلطنت'' کے امریکی مصنف ایس پی۔ اسکاٹ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے قرطبہ کے بارے میں رقم کیے تھے۔

> ''میں محسوس کر رہا تھا کہ تمام شہر میٹھی نیند سو رہا ہے اور اونچے اونچے میناروں پر علمائے ہیئت بروج آسمانی کے نقشے لے رہے ہیں۔ کواکب کی حرکات دیکھ رہے ہیں۔ ستاروں کے درمیانی فاصلوں کو ناپ رہے ہیں اور کسوف و خسوف کا حساب لگا رہے ہیں۔ ان ہیئت دانوں کے احکام کے وثوق، تحدیدات کے تیقن اور ان کے مفید ہونے پر آج تک کسی نے شک نہیں کیا۔''

اس خطے میں ہیئت و فلکیات کی تحقیق کا باقاعدہ آغاز دسویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ اموی خلیفہ ہشام ثانی کے عہد میں ہیئت دان ابوالقاسم مسلمۃ المجریطی پہلا قابل ذکر ہیئت دان ہوا ہے جس نے ۱۰۰۷ء میں وفات پائی۔ اس نے بغداد کے ہیئت دان موسیٰ الخواری کی تصنیف کردہ زیج کی تصحیح کی اور اسے دوبارہ مرتب کیا۔ اس کا شاگرد ابن السمح بھی اندلس کے قابل ذکر ہیئت دانوں میں سے تھا۔ ایک اور ہیئت دان ابو القاسم اصبغ بن محمد بھی اسی زمانے میں تھا، جس کا ذکر لسان الدین الخطیب نے علم ہیئت، علم الافلاک اور علم النجوم کے امام کی حیثیت سے کیا ہے۔ قرطبہ میں اسی عہد میں عباس بن فرناس نامی ہیئت دان بھی موجود تھا جس نے ہوا میں اڑنے کا تجربہ کیا۔

اس مقصد کے لیے پروں والی ایک مشین بنائی جس کی مدد سے ذرا سا اڑنے میں کامیاب بھی ہوا۔ اس نے وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ بھی بنایا جو مثقال کہلاتا تھا۔ عباس بن فرناس نے اپنے گھر میں کائنات کا ایک ماڈل بنایا تھا جس کے متعلق ''المقری'' کے الفاظ ہیں۔

''اس نے اپنے گھر میں ہیئت آسمانی بنائی تھی جس میں ستارے، ابر، برق و رعد معلوم ہوتے تھے۔'' اس طرح کے ماڈل کو آج کے دور میں (PLANETERIUM-) کہا جاتا ہے۔ نسبتاً بعد کے دور سے تعلق رکھنے والے ہیئت دانوں میں الزرقالی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ اوج شمس ستاروں کے مقابلے میں تغیر پذیر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مقصد کے تحت اس نے چار سو سے زائد مشاہدات کیے تھے۔ ایک اور ہیئت دان البطروجی نے بطلیموس کے فرض کردہ نظام شمسی پر ٹھوس تنقید کی تھی۔ اشبیلیہ کا رہنے والا ہیئت دان جابر بن افلح اندلسی ہیئت کی تاریخ میں خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ۱۱۴۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیانی عرصے میں وفات پائی۔ اس کی شہرت کا ایک سبب اس کی تصنیف ''کتاب الہیئت'' ہے جس میں البطروجی کی طرح بطلیموس کے نظام شمسی پر تنقید کرنے والوں کا ایک علیحدہ مکتب فکر تھا جس میں کئی ہیئت دان اور فلسفی شامل تھے۔ ان لوگوں میں ابن طفیل اور ابن ماجہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے سائنسی اور فلسفیانہ بنیادوں پر بطلیموس کے نظام شمسی کو نشانہ تنقید بنایا اور ایک دوسرے ہیئت دان ارسطا طالیس کے فرض کردہ نظام شمسی کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا جس میں زمین کی جگہ سورج کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

ایران میں ہیئت و فلکیات کی سرگرمیاں مختلف ادوار میں جاری رہیں، عالم اسلام کے ایک قابل ریاضی دان اور ماہر فلکیات عمر خیام کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ عمر خیام سلجوق بادشاہ جلال الدین ملک شاہ کے دربار سے منسلک تھا۔ اس کا ایک اہم کارنامہ نئے شمسی کیلنڈر کی تشکیل تھا جس کا نام اس نے جلال الدین کی نسبت سے ''التاریخ الجلالی'' رکھا۔ اس دور کے وسائل کے اعتبار سے یہ کیلنڈر حیرت انگیز حد تک درست تھا۔ اس میں پانچ ہزار سال میں صرف ایک دن کا فرق پڑتا تھا۔ سقوط بغداد کے تقریباً ایک سال بعد ایران میں مراغہ کے مقام پر ہیئت و فلکیات کی تحقیقی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہ دور اگرچہ مختصر ہے تاہم اس کے فلکیات پر گہرے اثر مرتب ہوئے۔ نصیر الدین طوسی نامی ہیئت دان ہلاکو خان کے دربار سے منسلک ہو گیا اور اس کی سرگرمیوں کے نتیجے میں مراغہ کی رصدگاہ معرض وجود میں آئی۔ اس نے یہاں فلکی تحقیقات کیں اور ایک زیج تصنیف کی جس کا نام ''زیج ایلخانی'' رکھا۔ اس زیج کو طویل عرصے تک فلکیات میں اہمیت حاصل رہی۔ نصیر الدین طوسی کے ساتھ چند اور ہیئت دان بھی مراغہ میں موجود تھے جن میں قطب الدین شیرازی،

معی الدین الاردی اور محی الدین المغربی کے نام قابل ذکر ہیں۔ طوسی اور اس کے شاگرد شیرازی نے بطلیموس کے نظام شمسی کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ مصر کے ایک ہیئت دان ابن الشاطر نے نصیر الدین طوسی کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ مسلم فلکیات کی تاریخ کا آخری اہم ہیئت دان سمرقند کا الغ بیگ تھا جو عظیم حکمران بھی تھا۔ الغ بیگ نے ہیئت و فلکیات میں نہ صرف خود مشاہدات کیے بلکہ اس نے اپنے ہاں بہت سے قابل ہیئت دانوں کو جمع کر رکھا تھا، ان میں سے ایک غیاث الدین کاشانی بھی تھا، جس نے ''زیج خاقانی'' مرتب کی تھی۔ اس کے علاوہ حسن چلپی قاضی زادہ، مرہم چلپی اور معین الدین کاشانی بھی سمرقند میں موجود تھے۔ ان ہیئت دانوں نے ''زیج جدید سلطانی'' تصنیف کرنے میں الغ بیگ کی معاونت کی۔ الغ بیگ کی تصنیف کردہ زیجات اٹھارہویں صدی میں برصغیر میں جے پور کے مہاراجہ سنگھ نے اپنی رصدگاہوں میں استعمال کی تھیں جو اس نے دہلی، جے پور، اجین، اور متھرا میں تعمیر کروائی تھیں۔ الغ بیگ کی وفات کے ساتھ ہی مسلم ہیئت کی تاریخ کا درخشاں دور ختم ہو گیا۔

تعلیمی ادارے، رصدگاہیں اور آلات رصد:

مسلمانوں کو اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ سائنسی علوم کا فروغ یونانیوں کی طرح صرف غور و فکر اور مظاہر کائنات کی فلسفیانہ توجیہات سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مسلم عہد میں ہیئت و فلکیات کی تحقیق کی غرض سے کئی رصد گاہیں قائم کی گئیں۔ یہ رصدگاہیں تعلیمی اداروں کا کام بھی دیتی تھیں جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ علمی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ رصدگاہوں کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں مسلم تاریخ کی پہلی رصدگاہ بغداد میں قائم کی گئی جو بیت الحکمت سے منسلک تھی۔ رصدگاہوں کے علاوہ مسلم عہد کی بعض جامعات یعنی یونیورسٹیوں میں بھی فلکیات کی تعلیم کے لیے علیحدہ شعبے موجود تھے۔ ایسے تعلیمی اداروں کے ساتھ رصدگاہیں بھی تعمیر کی جاتی تھیں تاکہ طلباء فلکیات کی تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور آلات رصد کا نہ صرف استعمال سیکھ سکیں بلکہ ان کی مرمت اور تیاری کے فن سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ مسلم تاریخوں کے حوالے سے فلپ کے حتی نے اپنی کتاب ''تاریخ عرب'' میں اندلس کی دو جامعات کا ذکر کیا ہے جن میں ہیئت و فلکیات کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ان میں سے ایک قرطبہ کی مشہور درس گاہ ''جامعہ قرطبہ'' تھی جس میں ریاضی اور فلکیات کے علیحدہ شعبے موجود تھے۔ قرطبہ کی یہ درس گاہ یورپ کی پہلی

یونیورسٹی تھی جہاں ہیئت وفلکیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ غرناطہ میں الموحد خاندان کے عہد حکومت میں "جامعہ غرناطہ" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں بھی ریاضی اور فلکیات کے علیحدہ شعبے موجود تھے۔ ان دونوں تعلیمی اداروں کی اپنی اپنی رصدگاہیں بھی تھیں۔ ان میں نہ صرف اندلس کے رہنے والے مسلم، عیسائی اور یہودی باشندے تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ یورپ ایشیا اور افریقہ سے بھی مسلم اور غیر مسلم طلبا تعلیم کے حصول کی غرض سے وہاں جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اندلس کے مختلف شہروں میں کئی تعلیمی ادارے قائم تھے، جہاں فلکیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان شہروں میں طلیطلہ، ملاگا، اشبیلیہ، سرقسطہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہیئت وفلکیات کی تعلیم انفرادی طور پر بھی دی جاتی تھی۔ مختلف سلاطین اور امرا کی سرپرستی میں بڑے بڑے ہیئت دان بھی اپنی ذاتی رصدگاہیں قائم کیے ہوئے تھے۔ جو تمام ضروری آلات رصد سے آراستہ ہوتی تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے متمنی طلبا ایسے ہی کسی ہیئت دان سے منسلک ہو جاتے اور حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ مشاہدات میں بھی اپنے استاد کی معاونت کرتے تھے۔ اس طرح وہ چند سالوں میں فلکیات کی نظری اور عملی تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔

مسلم تاریخ میں پہلی رصدگاہ مامون الرشید کے عہد خلافت میں قائم ہوئی۔ یہ رصدگاہ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے محلہ شماسیہ میں یا اس کے قریب قائم کی گئی تھی۔ مامون ہی کے عہد میں ایک اور رصدگاہ دمشق سے تقریباً اڑھائی میل کے فاصلے پر قائم کی گئی۔ یہ رصدگاہ چونکہ ایک نیم پتھریلی پہاڑی پر قائم کی گئی تھی جس کا نام "قاسیون" تھا، اسی لیے اسے "قاسون کی رصدگاہ" کا نام دیا گیا تھا۔ شماسیر کی رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ عباس بن سعید جوہری نامی ہیئت دان تھا اور یحییٰ بن منصور اس کا نائب تھا۔ قاسیون کی رصدگاہ کے قیام کے بعد یحییٰ بن منصور کو اس کا منتظم اعلیٰ بنایا گیا۔ ان دونوں رصدگاہوں میں فلکی مشاہدات کے بعد "زیج الممتحن" تصنیف کی گئی جس میں یحییٰ بن منصور کا بہت حصہ تھا۔ بغداد ہی میں موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں محمد بن موسیٰ، احمد بن موسیٰ اور حسن بن موسیٰ نے اپنے گھر میں ذاتی رصدگاہ قائم کی تھی جسے ان کے عہد میں کافی شہرت حاصل رہی۔ مشہور ہیئت دان البتانی کی اپنی رصدگاہ "رقہ" کے مقام پر قائم تھی جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ جب آل بویہ نے بغداد پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی یہاں آ کر ایک رصدگاہ تعمیر کروائی۔ یہ رصدگاہ شرف الدولہ کے حکم پر قائم کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر اور آلات رصد کی تنصیب کی نگرانی اس عہد کے مشہور ہیئت دان ابورستم الکوہی نے کی تھی۔ آل بویہ ہی کے عہد میں ایک اور رصدگاہ ایران کے شہر "رے" میں قائم کی گئی تھی۔ ابن علی سینا نے بھی فلکی مشاہدات کی غرض سے "ہمدان" میں رصدگاہ قائم کی تھی۔ مصر میں ایک اہم رصدگاہ فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کے عہد میں "قاہرہ" کے مقام پر تعمیر ہوئی۔ اسی رصدگاہ کو اس کے بیٹے الحاکم باللہ نے اپنے دور حکومت میں وسعت دی اور مزید آلات

رصد سے آراستہ کیا۔ یہ رصدگاہ قاہرہ کے پاس ایک پہاڑی پر تعمیر کی گئی تھی جس کا نام "المقطم" تھا۔ ابن یونس نے "الزیج الحاکی" کی تصنیف کی غرض سے اسی رصدگاہ میں مشاہدات کیے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ الحاکم خود بھی صبح سے قبل "المقطم" کی رصدگاہ میں جایا کرتا تھا اور فلکی مشاہدات کرتا تھا۔ اندلس کے شہر اشبیلیہ میں نامور ہیئت دان جابر بن افلح نے وہاں کی جامع مسجد کے اونچے مینار کو بطور رصدگاہ کے استعمال کیا تھا۔ یہ مینار آج بھی موجود ہے اور "جیرالڈا" کے مینار کے نام سے مشہور ہے۔ رصدگاہوں کی تاریخ میں مراغہ کی رصدگاہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ رصدگاہ نصیر الدین طوسی نے تعمیر کروائی تھی اور پہلے کی تمام رصدگاہوں کے مقابلے میں وسیع تھی۔ آلات رصد جو اس میں استعمال کیے گئے تھے، پہلے کے مقابلے میں بہتر اور تعداد میں زیادہ تھے۔ اس رصدگاہ میں ایک ہی وقت میں بہت سے ہیئت دان مشاہدات کر سکتے تھے۔ نصیر الدین طوسی کے علاوہ اس رصدگاہ میں قطب الدین شیرازی، محی الدین اور ایک چینی ہیئت دان تونجی شامل تھے۔ مراغہ کی رصدگاہ اگرچہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی لیکن بعد میں تعمیر ہونے والی رصدگاہوں کے لیے اہم بنیاد ثابت ہوئی۔ اسی رصدگاہ کی طرز پر تیمور لنگ کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں رصدگاہ تعمیر کروائی۔ یہ بھی سمرقند کے قریب ہی پہاڑی پر قائم کی گئی تھی، آج بھی اس کے کھنڈرات اس کی عظمت کا پتا دیتے ہیں۔ مسلم تاریخ کی آخری اہم رصدگاہ ۱۵۷۵ء میں عثمانی خلیفہ مراد ثالث کے عہد میں ایک ہیئت دان تقی الدین کے لیے استنبول میں قائم کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ تینوں رصدگاہیں آج اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں لیکن ان کی طرز تعمیر کا اندازہ جے پور کے مہاراجہ کی تعمیر کردہ رصدگاہوں سے کیا جا سکتا ہے جو مسلم عہد کی ان تین رصدگاہوں کے نمونے پر ہی قائم کی گئی تھیں، ان میں استعمال ہونے والے آلات رصد بھی مسلمانوں کے بنائے ہوئے آلات کی طرز کے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں استعمال ہونیوالی جدولیں بھی سمرقند کی رصدگاہ میں تیار ہوئی تھیں۔

مسلمانوں کو ہیئت وفلکیات کی تحقیق میں استعمال ہونے والے آلات رصد کی اہمیت کا احساس تھا، لہٰذا انہوں نے ہر دور میں پرانے آلات کو بہتر بنانے اور نئے آلات رصد تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس عہد میں فلکی مشاہدات کی غرض سے استعمال ہونے والے آلات میں اصطرلاب (Artralbe) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ بعض ابتدائی قسم کے اصطرلاب یونانیوں نے بنائے تھے لیکن وہ معمولی نوعیت کے تھے۔ مسلمانوں نے اصطرلاب سازی کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور اسے باقاعدہ فن کی حیثیت دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یونانیوں کے ہاں تجربے اور مشاہدے کو اہمیت حاصل نہ تھی جب کہ مسلمانوں نے ہیئت وفلکیات اور دوسرے

سائنسی علوم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر رکھی تھی، اصطرلاب سے کئی قسم کے کام لیے جاتے تھے۔ اس کی مدد سے فلکی اجسام یعنی سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کا ارتفاع معلوم کیا جاتا اور آسمان پر ان کے مقام کا تعین کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ آلہ وقت معلوم کرنے، پہاڑوں کی بلندی اور کنوؤں وغیرہ کی گہرائی ناپنے کے کام بھی آتا تھا۔

اصطرلاب سازی پر قدیم ترین تصنیف کی ہے جو اس نے ۸۱۵ء سے پہلے تحریر کی اس نے ایک اور کتاب آلہ "ذات الحلق" پر بھی تحریر کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد علی بن عیسٰی اصطرلابی نے اس فن پر کتاب لکھی۔ یہ شخص اصطرلاب سازی کا ماہر ہونے کی وجہ سے ہی اصطرلابی کہلایا۔ محمد بن موسیٰ الخوازمی نے بھی کچھ عرصے بعد اصطرلاب سازی پر کتاب لکھی۔ یہ ہیئت دان "بیت الحکمت" سے وابستہ تھا۔ اندلس میں بھی ہیئت دانوں نے اس فن پر کتابیں تحریر کیں۔ ان میں ابو القاسم اصبغ اور ابن السمح کے علاوہ ابو یحییٰ محمد ابن رضوان بھی تھا جو وادی آش (غرناطہ) کا رہنے والا تھا۔ اس نے اصطرلاب کی ساخت اور استعمال پر رسالہ تحریر کیا تھا۔

اگرچہ بعض لوگ اصطرلاب سازی کو بطور پیشے کے اپناتے تھے لیکن اکثر مشہور ہیئت دان اس فن سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ یہ ہیئت دان ضرورت کے مطابق آلات رصد میں تبدیلیاں کر کے ان کو مزید بہتر بنا لیتے تھے تاکہ استعمال میں آسانی ہو جائے اور فلکی مشاہدات کی صحت میں اضافہ ہو سکے۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے آلات رصد اعلیٰ معیار کے اور بہت نفیس ہوتے تھے۔ مسلم عہد میں سب سے پہلے ابراہیم الفرازی نے اصطرلاب بنایا۔ عباسی عہد میں عمر بن حفص اصطرلاب اور دوسرے آلات رصد گاہ کی تیاری کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اندلس میں غرناطہ کا رہنے والا احمد بن حسن آلات رصد اور خاص طور پر اصطرلاب سازی کا ماہر تھا۔ اس کے متعلق لسان الدین الخطیب نے "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" میں لکھا ہے۔

> "اس فن میں ان کا درجہ اتنا عالی تھا کہ متقدمین میں جو اس فن میں ماہر گذرے ہیں۔ ان پر انھیں فضیلت دی گئی ہے۔

جو اصطرلاب مسلمان استعمال کرتے تھے وہ کئی اقسام کے ہوتے تھے۔ ان میں سب سے اہم قسم "مسطحہ" یا "مسطح" اصطرلاب کی تھی۔ یہ اصطرلاب مسلم ہیئت دانوں میں اس لیے بھی بہت زیادہ مقبول رہا کہ دوسری اقسام کی نسبت آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اصطرلاب کی دوسری اہم قسم "کروی اصطرلاب" کی تھی۔ اس قسم کے اصطرلاب استعمال میں بہت مشکل ہونے کی وجہ سے کم استعمال کیے گئے۔ ایک تیسری قسم "خطی اصطرلاب" کی تھی جس کا موجد مظفر الطوسی نامی ہیئت دان تھا۔ اسی کے نام پر اس قسم کے اصطرلاب کو "عصا الطوسی" بھی کہا جاتا تھا۔ اندلسی

ہیئت دان الزرقالی نے بھی نئی قسم کا اصطرلاب ایجاد کیا جسے "الزرقالیہ" کا نام دیا گیا۔ اس کی مدد سے چاند کے مدار اور حرکات کا بھی بہتر طور پر مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ الزرقالی نے شاہ اشبیلیہ المعتمد بن عباد کے نام اس کو "العبادیہ" سے موسوم کیا ہے۔ جابر بن افلح نے "کائناتی آلہ" ایجاد کیا جو فلکیات کے ساتھ ساتھ ریاضی اور طبیعیات میں بھی کارآمد تھا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ میکانکی اصطرلاب مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا۔ یہ اصطرلاب گیروں کی مدد سے کام کرتا تھا۔ ایک ایسا ہ میکانکی اصطرلاب البیرونی کے پاس بھی تھا۔ بعد میں اندلسی ہیئت دان الزرقالی نے اس میں تبدیلیاں کر کے مزید بہتر بنایا۔ یہ آلہ اندلس ہی کے ذریعے یورپ پہنچا اور میکانکی گھڑی کی ایجاد کا موجب بنا۔ اس کے علاوہ جو آلات رصد مسلمان ہیئت دان استعمال کرتے تھے، ان میں سدس (Six tent)، ذات الحلق (Armilary Sphare) اور سمتی ربعات (Azimuthal quadrant) شامل تھے۔

مسلم ہیئت کی قدر و قیمت اور اثرات:

برطانوی مصنف رابرٹ بریفالٹ نے اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" (The Making of Humanity) میں مغرب پر مسلم سائنس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

> "عربوں کے علم ہیئت نے کوئی کوپرنیکس یا نیوٹس پیدا نہیں کیا، لیکن انہوں نے جو کچھ کیا، اس کے بغیر کوپرنیکس یا نیوٹس پیدا ہو ہی نہ سکتے تھے۔"

بلاشبہ یہ اعزاز مسلمانوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے سائنسی علوم کو تجرباتی بنیادوں پر استوار کیا اور حساب و ریاضی کو اس حد تک ترقی دی کہ سائنسی علوم میں معاون ہو سکیں۔ مختلف سائنسی علوم میں تحقیق کی غرض سے نئے آلات ایجاد کیے اور پرانے آلات میں ترامیم کر کے انہیں بہتر بنایا۔ مسلمانوں نے یونان سے معلومات ضرور حاصل کی تھیں لیکن ان کا سائنسی فلسفہ اور سوچ نہیں اپنائی۔ مسلم فلکیات کے متعلق ای۔اے۔ نیلینو (E.A.NALINO) لکھتا ہے:

> "اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علم مثلثات کے ضابطوں کے اطلاق اپنے آلات رصد کے اوصاف و تعداد اور اپنے مشاہدات کے طور طریق میں عربوں کو اپنے پیش رو یونانیوں پر نمایاں سبقت حاصل ہے۔ مشاہدات کی تعداد، تسلسل اور صحت کے لحاظ سے یونانی ہیئت کے مقابلے میں اسلامی علم ہیئت کی برتری آشکارا ہے۔"

مسلمانوں نے علم ہیئت میں جو خدمات سرانجام دیں اس کے اثرات بیرونی دنیا، خاص طور پر یورپ پر بہت گہرے مرتب ہوئے۔ مسلمانوں نے مراغہ، سمرقند اور استنبول میں جو رصدگاہیں قائم کی تھیں، انہی کی طرز پر یورپ کی رصدگاہیں تعمیر کی گئیں، مثلاً کیپلر اور ٹائیکو براہی کی رصدگاہیں بالکل اسلامی رصدگاہوں کے نمونے پر قائم ہوئی تھیں۔ یہ صورت حال دوربین کی ایجاد تک برقرار رہی ان رصدگاہوں میں استعمال ہونے والے آلات رصد بھی بالکل ویسے ہی تھے جو مسلمانوں نے استعمال کیے اور ان کی تیاری کا فن بھی انہوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا تھا۔ سید حسین نصر نے اس بارے میں تحریر کیا ہے۔

> ''تقابلی جائزے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان آلات فلکی پر جو ٹائیکو براہی اور دوسرے ہیئت دانوں نے استعمال کیے، اسلامی آلات کا گہرا اثر تھا۔''

یورپ میں پہلے پہل جربرٹ آریلیک (Gerbert Aurike) نے اصطرلاب کی تیاری اور استعمال کے فن سے روشناس کرایا۔ اس شخص نے یہ معلومات اندلس سے حاصل کی تھیں جو یورپ کے لیے اسلامی علوم کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ یہ شخص دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں گزرا ہے۔ جافرے چاسر نے بھی اصطرلاب پر ایک کتاب (The condurions of the Artrolabe) تحریر کی تھی جس پر عباسی عہد کے ہیئت دان ماشاء اللہ کی تصنیف کا اثر نمایاں تھا۔ ابن الہیثم کی عدسوں پر تحقیق ہی کی بدولت علمی طور پر عدسوں کی تیاری ممکن ہوئی اور اس طرح فلکیات کی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس طرح اصحاب تحقیق نے ستاروں کے جو نقشے اور جدولیں تیار کیں، ان سے مغرب نے بھرپور استفادہ کیا۔ مغربی ہیئت دان کیپلر نے ابن یونس کی ''الزیج الحاکمی'' استعمال کی تھی۔ اسی طرح کوپرنیکس نے اندلسی ہیئت دان الزرقالی کی تحقیقات پر مشتمل اس زیج سے استفادہ کیا جو قشتالیہ (اندلس) کے عیسائی حکمران الفانسو کے عہد میں دوبارہ مرتب کی گئیں۔

اندلس میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں بڑی تعداد میں کتب خانے اور تعلیمی ادارے موجود تھے، جن سے مسلمانوں کے علاوہ عیسائی اور یہود بھی استفادہ کرتے تھے، اندلس اور دوسرے مسلم ممالک میں ہونے والی علمی ترقی کی بدولت ہی یورپ کے لوگوں میں حصول علم کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہاں قائم ہونے والے تعلیمی ادارے اندلس کی مسلم درس گاہوں کی طرز پر قائم کیے گئے جیسا کہ رابرٹ بریفالٹ کی اس تحریر سے ظاہر ہے:

> ''اٹلی کے شہروں پڈوا اور پسیامی میں قرطبہ کے دارالعلوم کی طرز پر مدارس قائم کیے گئے جہاں عربوں کی ریاضی اور فلکیات کی تعلیم دی جاتی تھی،

یہیں پر کارڈن، ہارے اور گلیلیو نے تعلیم حاصل کی تھی۔"

ویٹیل واموولے نامی شخص نے جو آکسفرڈ میں لیکچر بھی دیا کرتا تھا، قرطبہ میں ریاضی اور فلکیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آرنلڈ (آف ولے نوف) اور ایڈمنڈ لکی نے بھی قرطبہ ہی سے تعلیم حاصل کی تھی یہ دونوں افراد ماونٹ پلیر کی درس گاہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ اندلس کے ذریعے سے مسلم ہیئت و فلکیات کی کتابیں بڑی تعداد میں یورپ پہنچیں اور یورپی زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ اندلس کے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن سوم کے دربار میں ایک پادری جان آف گارز جرمنی کے حکمران کی جانب سے سفیر بن کر آیا۔ یہ شخص قرطبہ میں تین سال رہا اور وہیں عربی سیکھی۔ واپسی پر بہت سی کتابیں ایک گھوڑے پر لاد کر جرمنی لے گیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو مسلمانوں کے علوم وفنون سے روشناس کرایا جاسکے مائیکل اسکاٹس نامی شخص نے اندلس کے کئی چکر لگائے تاکہ مسلمانوں کی تصنیفات حاصل کی جاسکیں۔ اسے سسلی کے فریڈرک دوم کی سرپرستی حاصل تھی جسے مسلمانوں کو علم وفنون کے فروغ کے سلسلے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ اسی شخص نے البطروجی کی اس تصنیف کا ترجمہ لاطینی میں کیا جس میں بطلیموس کے نظام شمسی پر تنقید کی گئی تھی۔ جیرارڈ آف کریموفا نے پچاس برس قرطبہ میں بسر کیے اور چند عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ مل کر ساٹھ سے زائد کتابوں کے لاطینی تراجم کیے۔ ان میں ریاضی اور فلکیات کی سات تصانیف اور تین جدولیں شامل تھیں۔ اس شخص نے بطلیموس [illegible] مجسطی" کے علاوہ ابن الہیثم کی "المناظر" اور جابر بن افلح کی "کتاب الہیئت" کا بھی ترجمہ [illegible] ارڈ آف باتھ نے الخوارزمی کی اس زیج کا ترجمہ کیا تھا جس پر اندلسی ہیئت دان مسلمہ المجریطی [illegible] نظرثانی کی تھی۔ پلاٹو آف ٹیوالی نے البتانی کی "الزیج الصابی" کا ترجمہ کیا۔ اندلس کے ایک یہودی پیڈرو ڈی الفانسو نے جو عیسائی ہو گیا تھا اور برطانیہ میں ہنری اول کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ فلکیات کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس طرح مسلم ہیئت دانوں کی تحقیقات یورپ کی مختلف زبانوں میں تراجم کی بدولت وہاں پہنچیں اور مغربی ہیئت کی تحقیق کی بنیاد بنیں۔

مسلمانوں نے ہیئت و فلکیات میں بطلیموس کا مرتب کردہ نظام شمسی اپنایا تھا جس میں زمین کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سورج اور چاند کے علاوہ باقی دوسرے سیارے زمین کے گرد چکر لگانے کے علاوہ اپنے اپنے ذیلی مداروں میں چکر لگاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ نظام پیچیدہ تھا لیکن غلط ہونے کے باوجود مسلمانوں نے اس نظام کو اس لیے اپنالیا کہ تحقیق کی بنیاد پر اس زمانے میں دستیاب وسائل کی مدد سے اس نظام کو بدلنا ممکن نہیں تھا اور مسلم ہیئت دان اپنی تحقیق میں مفروضوں کو جگہ دینے کی بجائے مشاہدے کو اہمیت دیتے تھے۔ اس بات کا ذکر سی اے

ٹیلیبو۔نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"عرب ہیئت دان اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے نئے عام نظریے پیش کرنے کی بجائے جن کے لیے قدیم نظروں ہی کی طرح کوئی ثبوت پیش نہ کیا جا سکتا ہو، یہ زیادہ ضروری ہے کہ صدیوں تک افلاک کا مشاہدہ کیا جائے اور اس طرح "المجسطی" میں دیے گئے اعداد کی تصحیح کی جا سکے۔ یہ کام انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور اس میں وہ کبھی بطلیموس کے نام نہاد مغالطہ آمیز مشاہدات سے متاثر نہ ہوئے تھے۔"

لیکن تحقیقی بنیادوں پر جس حد تک ممکن تھا، مسلمانوں نے بھرپور کوشش کی کہ اس مسئلے کو سلجھایا جائے۔ ایسے ہیئت دانوں میں مراغہ کی رصدگاہ کے دو ہیئت دانوں نصیر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مصر کے ہیئت دان ابن الشاطر (اس نے طوسی کی "زیج" استعمال کی) اور اندلسی ہیئت دانوں، ابن طفیل، ابن رشد، البتروجی اور الزرقالی کے نام قابل ذکر ہیں، ان ہیئت دانوں کی تحقیقات اور نظام بطلیموسی پر تنقید کے اثرات یورپ پر پڑے۔ کوپرنیکس نے نیا نظام شمسی وضع کیا تھا جس میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس ہیئت دان پر مسلم ہیئت کے اثرات کے متعلق ڈی بنگری لکھتا ہے۔

"دو صدیاں گزر جانے کے بعد کوپرنیکس نے جو نمونے (سیاروں کی حرکت کے) تجویز کیے تھے۔ ان میں کئی باتیں ابن شاطر کی مساعی کی مرہون منت تھیں۔ دونوں کے بنائے ہوئے عطارد اور قمر کے نمونے بالکل ایک جیسے ہیں۔ دونوں نے "زیج طوسی" سے کام لیا ہے اور دونوں نے دوائر تدویر کو یکساں طور پر حذف کیا ہے لہٰذا یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ کوپرنیکس، ابن الشاطر کے نام سے واقف تھا۔"

مسلم ہیئت دانوں میں اس بات کا کافی حد تک احساس پایا جاتا تھا کہ سورج کو نظام شمسی میں مرکزی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ انہوں نے زہرہ کو سورج کے تابع سیارہ قرار دیا تھا نہ کہ زمین کے تابع۔ یہ درست ہے کہ مغرب نے ہیئت و فلکیات کی تحقیق میں غیر معمولی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے لیے صحیح سائنسی فکر پر مبنی مضبوط بنیادیں مسلم ہیئت و فلکیات ہی نے مہیا کی تھیں۔

فن تعمیر میں مسلمانوں کی خدمات

مقصود احمد ساجد

مسلمانوں نے فن تعمیر میں جدت، نفاست اور پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کو بھی پیش نظر رکھا۔ ان کے فن تعمیر میں تصویروں اور مورتیوں وغیرہ کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ تمام تر دلفریبی اور دلکشی فن کی پختگی سے پیدا کی گئی ہے۔ عربوں کے فن تعمیر میں انفرادیت صاف طور پر دکھائی دیتی ہے اور یہ انفرادیت عمارتی تکنیک اور آرائش دونوں صورتوں میں ملتی ہے۔ عمارتی تکنیک میں ستون، گنبد، محراب، مینار اور ڈاٹوں وغیرہ کا استعمال ہے اور آرائش میں بیل بوٹے، ہندسی شکلیں، پچی کاری اور قرآنی آیات کی خطاطی وغیرہ شامل ہے، مسلمانوں سے پہلے جو ستون استعمال کئے جاتے تھے وہ عام طور پر چھوٹے ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے جب بڑی اور عالیشان عمارتیں تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو ان کو بڑے بڑے ستونوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے چھوٹے ستونوں کو جوڑ کر اس خوبصورتی سے بڑا بنایا کہ جوڑ کا پتا نہ چلتا تھا۔ انہوں نے ستونوں میں جدت بھی پیدا کی۔ مسلمانوں کے فن تعمیر میں گنبد کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ گنبد عمارت کی ساخت اور ظاہری شکل وصورت اور لوگوں کے مذاق کے مطابق مختلف جگہوں اور عمارتوں میں مختلف طرز کے بنائے گئے۔ بعض جگہ ان کی شکل لمبوتری اور بعض جگہ کروی، بیضاوی یا مخروطی تھی۔ گنبد محلات پر بھی بنائے گئے لیکن مساجد میں خصوصی طور پر بنائے گئے، حتیٰ کہ مسجد کا گنبد بنانا لازم ہو گیا۔ مساجد اور محلات میں محرابوں کا رواج بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ عربوں نے شروع میں پھیلی ہوئی محرابیں بنائیں بعد میں یہ قوس نما ہو گئیں۔ آرائش کے لئے عربوں نے خوبصورت نقاشی کو اپنایا اور عمارات پر مختلف قسم کی ہندسی علامات اور پھول بوٹے بنائے۔ مساجد کی آرائش کے لئے قرآنی آیات کو خط کوفی میں خوبصورت انداز سے تحریر کیا گیا۔

عربوں کے بعد ایرانیوں نے فن تعمیر میں از حد نفاست پیدا کی۔ انہوں نے گچ اور

چونے سے نہایت عمدہ استر کاری کی۔ انہوں نے مساجد کے میناروں میں بھی جدت پیدا کی۔ انہوں نے مذہبی اور سرکاری عمارات کے سامنے برآمدے تعمیر کئے۔ ایران کی مسجدوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں، خصوصاً اصفہان کی تمام پرانی مسجدوں میں زمین دوز راستے بنائے گئے ہیں تاکہ عورتیں ان راستوں سے براہ راست مسجد میں پہنچ کر نماز میں شریک ہوسکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مسلم بادشاہوں نے فن تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔ مغلیہ دور میں بننے والی عمارتوں میں ایرانی فن تعمیر کا عکس نمایاں ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی عمارتیں ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہیں۔ ان کی اکثر عمارتوں میں دیوان اور دالان دونوں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی عمارات میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان میں روشنی کے گزرنے کا خصوصی بندوبست کیا گیا ہے جب کہ ہندوؤں کی عمارات میں تاریکی کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس سے اسلام کے اس نظریہ کا ثبوت ملتا ہے کہ اسلام روشنی اور نور سے منبع ہے اور دنیا میں علم و ہنر کی روشنی پھیلانے کا داعی ہے جس سے تمام تر تاریکیاں زائل ہو جاتی ہیں۔ ہندوؤں کی عمارات میں مورتیاں وغیرہ دکھائی دیتی ہیں جب کہ مسلمانوں کی عمارات میں ان کا وجود نہیں۔

فن تعمیر کا ابتدائی دور

اسلام میں پہلی مسجد کی تعمیر قبا میں کی گئی جو مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں آنحضور e نے مزدوروں کے ساتھ خود بھی کام کیا۔ یہ مسجد پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

> (وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو کہ بہت صفائی پسند ہیں اور خدا پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مدینہ میں قیام کے بعد آنحضرت ﷺ نے جو مسجد تعمیر کی۔ وہ ''مسجد نبوی'' کے نام سے آج تک موجود ہے، اگرچہ بعد میں اس کی توسیع کی گئی۔ یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں جن پر کھجور کے پتوں کا چھپر ڈالا گیا تھا ۔ستون کھجور کے تھے ابتدا میں قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا۔ فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہ نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر

بچھالیں۔ آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوادیا۔

آنحضرت ﷺ نے مسجد نبوی سے فراغت کے بعد ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے۔ ان میں پانچ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے ان کے اندرونی حجرے بھی ٹہنیوں کے تھے۔ یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی عہد میں جو عمارتیں تعمیر کیں وہ نہایت سادہ قسم کی تھیں اور ہر قسم کے تکلفات اور آرائش سے پاک تھیں مثلاً اس دور کی مساجد ہی کو دیکھئے۔ مسجد ایک چوکور عمارت بنی ہوئی تھی، پتوں اور مٹی سے لپٹی ہوئی تھی۔

اموی عہد

امویوں کے عہد حکومت میں اسلامی فن تعمیر نے ترقی کرنا شروع کی۔ امیر معاویہ کے عہد میں زیادہ بن ابی سفیان نے بصرہ میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جس کی دیواریں پختہ اینٹوں سے بنائی گئی تھیں اور دیواروں پر گچ سے استرکاری کی گئی تھی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ پہلی مسجد تھی جس میں مینار تعمیر ہوا۔ دور بنوامیہ میں مصر کے اموی حاکم مسلمہ نے جامع مسجد فسطاط کی از سر نو تعمیر کروائی، اور اس کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار بنوایا۔ اس مسجد میں محراب کا اضافہ کیا گیا۔ اموی دور کی جن عمارتوں کو تعمیری تکنیک اور خوبصورتی میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی، وہ قبۃ الصخرہ، مسجد بیت المقدس اور جامع مسجد دمشق ہیں۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد حکومت میں مسجد نبوی کو منہدم کروا کر اس کی جگہ نئی مسجد تعمیر کی، جس کے دالان بہت کشادہ تھے اور اس میں ایک بلند منبر بنایا گیا تھا۔ مسجد کے ستون پتھروں سے تراشے ہوئے ٹکڑوں سے تیار کئے گئے تھے اور مسجد کے صحن میں ایک فوارہ بھی لگایا گیا تھا۔ اس مسجد کے تمام در و دیوار اور عمارت پر طلائی کام کیا گیا تھا اور جگہ جگہ قرآنی آیات کندہ کی گئی تھیں۔

دور بنوعباس

بنوعباس کے عہد میں بڑے بڑے شہر بسائے گئے اور بڑے بڑے محلات اور مساجد تعمیر کرائی گئیں۔ اس عہد میں محلات کے بکثرت تعمیر ہونے سے انجینئرنگ کی سائنس اور فن تعمیر کو بھی بہت فروغ نصیب ہوا۔ قوس، مینار، گنبد، محرابیں پرانی عرب تعمیرات کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اس عہد میں مملکت میں ہزارہا مساجد تعمیر ہوئیں جن کی دیواروں پر گلکاریوں میں انواع و

اقسام کی رنگ آمیزیاں نہایت عمدگی اور خوش سلیقگی سے کی گئی تھیں۔ مساجد کی محرابیں پھولوں اور انواع واقسام کے بیل بوٹوں سے مزین تھیں۔ تاریخی عمارات میں بادشاہوں کے محلات اور اولیاء کے مقابر آج بھی قابل دید ہیں۔ بعض محلات قلعہ نما تھے اور تراشیدہ پتھروں سے بنائے گئے تھے۔ بغداد خاص میں منصور اور اس کے جانشینوں کے بنے ہوئے محلات یا تو مامون اور امین کی خانہ جنگی کے ایام میں یا ہلاکو کے بے پناہ حملوں کے وقت منہدم ہو گئے۔

دور بنو عباس میں ''تعمیر بغداد'' کو خاص اہمیت حاصل ہے بغداد ایک مدور شہر کی صورت میں تعمیر کیا گیا تھا، جس کے چاروں طرف ایک خندق اور اینٹوں کی بنی ہوئی دوز بردست فصیلیں تھیں۔ شہر کے مرکز میں تیسری دیوار سے محصور سبز گنبد کا مقر تھا جس میں خلیفہ کی اقامت گاہ تھی۔ اس شہر کی تعمیر میں ایرانی معماروں نے بھی اپنے فن تعمیر کی نفاست اور پختگی کا ثبوت دیا تھا۔

اندلس میں مسلمانوں کا فن تعمیر

قرطبہ کی جامع مسجد اندلس کے مسلمانوں کے فن تعمیر کا ایک نہایت عمدہ اور دلکش نمونہ ہے۔ یہ مسجد اندلس میں اموی حکومت کے بانی عبدالرحمان الداخل (متوفی ۷۷۳ء) نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس مسجد میں توسیع و آرائش کا عمل انجام پاتا رہا۔ یہ مسجد چھ سو فٹ لمبی اور اڑھائی سو فٹ چوڑی تھی۔ پوری عمارت سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں پر قائم تھی جن کی تعداد ایک روایت کے مطابق ۱۴۹۳ اور دوسری روایت کے مطابق ۱۲۹۳ تھی۔ مسجد میں اکیس دروازے تھے، جن میں سے چند دروازے عورتوں کے لئے مخصوص تھے۔ ایک خاص اور خفیہ دروازہ خلیفہ کے لئے بنایا گیا تھا، جس سے گزر کر وہ براہ راست منبر تک پہنچ سکتا تھا۔ اس مسجد میں گیارہ صفوف تھیں۔ صفوف کے درمیان میں جو محرابی چھتے تعمیر کئے گئے تھے، وہ نہایت ہی خوبصورت تھے۔ اس میں ڈاٹوں کا دوہرا سلسلہ تھا۔ ستونوں اور محرابوں پر نہایت عمدہ نقش کاری کی گئی تھی۔ اس مسجد میں ہزاروں جھاڑ فانوس آویزاں تھے، جن میں سے تین چاندی کے اور بقیہ پیتل کے تھے۔

جامع قرطبہ

جامع قرطبہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کرسٹین پرائس لکھتا ہے کہ: دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ہم ان ستونوں کے درمیانی راستوں سے گزرتے ہیں جو آٹھویں عیسوی میں

اس وقت چکنے سنگ مرمر کے جوستون پرانی رومی عمارتوں سے لیے گئے تھے، وہ اتنے اونچے نہیں تھے کہ ان پر چھت ڈالی جا سکتی۔ عرب معماروں نے اونچائی میں اضافے کے لیے دوہری محرابوں کا ایک نیا طریقہ اخذ کیا۔ اور اپنے ذوق رنگ آمیزی کی مدد سے سرخ اینٹ اور ہلکے بادامی رنگ کے پتھر کی متبادل دھاریاں ڈال کر محرابیں تعمیر کیں۔ ہم جنوب کی طرف چلتے ہوئے ان درمیانی راستوں سے گزرتے ہیں، جو عبدالرحمان ثانی کے دور میں نمازیوں کو بڑھتی ہوئی جماعتوں کے لیے گنجائش نکالنے کی غرض سے تعمیر کیے گئے تھے۔ اس کے بعد محرابوں کی تزئین زیادہ پر رونق ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان ہمیں محراب نظر آنے لگتی ہے، جو جنوبی دیوار کے اندر ایک گہرے طاق کی شکل میں ہے اور جس کے چاروں طرف طلائی پچی کاری کے نقوش تاباں و درخشاں ہیں۔ محراب مصلیٰ کے سامنے کی قوسی محرابیں کچھ عجب طرح آپس میں گتھی ہوئی ہیں اور اوپر قوسی چھتوں نے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے پر تین نہایت خوشنما چھوٹے چھوٹے برج بنے ہوئے ہیں۔ عمارت کا یہ خوبصورت جنوبی حصہ ان کاریگروں کا کارنامہ تھا جن کی خدمات خلیفہ الحکم ثانی نے حاصل کی تھیں۔ اس کے فنکاروں نے محراب، مصلیٰ، قوسی چھتیں اور محرابوں کی آرائش اس طرح کی تھی کہ پلستر اور سنگ مرمر کے چوکور پر کندہ کاری کے ابھرے ہوئے نقوش ہیں۔ ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی ڈنڈیوں، پھولوں اور پتیوں کے نمونے سجائے گئے تھے۔ محراب مصلیٰ کی قوس کے اردگرد پچی کاری میں نقوش عربیہ کے حسین و دلبربا پھول بوٹے اس کاریگر کا کارنامہ تھے جسے الحکم کی مخصوص کی درخواست پر بازنطینی شہنشاہ نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا۔ محراب مصلیٰ سے دائیں جانب کی قوسی محراب بھی پچی کاری سے آراستہ تھی یہیں وہ نجی دروازہ تھا جس سے گزر کر خلیفہ مسجد میں آتا تھا اور منبر تک پہنچتا تھا۔ اس کا محل دریا کے کنارے تھا، یہیں سے ایک مسقف راستہ نجی دروازے تک آتا تھا۔ بائیں جانب کی محراب سے ان کمروں میں داخل ہوتے تھے جہاں بیش بہا چیزیں محفوظ تھیں۔ مسجد کی سب سے قیمتی چیز بڑی تقطیع کا وہ قرآن مجید تھا، جس کے چار صفحات حضرت عثمان کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ جب حضرت عثمان کو شہید کیا گیا تو اس نسخہ کے وہ صفحات خون سے داغدار ہو گئے۔ یہ بیش بہا نسخہ صرف جمعہ کی نماز کے وقت نکالا جاتا تھا اور قرطبہ پہنچنے والا ہر زائر اسے اپنی زیارت کے لیے طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔

مدینۃ الزہراء

''مدینہ الزھراء'' یا قصر الزھراء کی تعمیر بھی مسلمانوں کے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ تھی، یہ شہر قرطبہ سے شمال مغرب میں چار میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے دامن میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں تیرہ سال لگے تھے اور عبدالرحمٰن اپنے سرکاری عہدہ داروں اور وسیع حرم کے ساتھ اس نئے محل میں ۹۶۱ء میں منتقل ہوا تھا۔ یہ قصری شہر تین اونچے سطح چبوتروں پر تعمیر کیا گیا تھا، جو پہاڑی کے ڈھلوان میں واقع تھے۔ کھدائی میں برآمد ہونے والے کھنڈرات سے پتا چلتا ہے کہ احاطے کی دیوار میں بڑا دروازہ شمال کی جانب تھا، جہاں ایک چوڑا ڈھلوان تھا، جس پر سے اسپ سوار گزر سکتے تھے، اور نیچے اتر کر دو بڑے دروازوں میں داخل ہو سکتے تھے۔ دائیں طرف سب سے اوپر کے میدان میں مکانات، صحن، باورچی خانے اور تنور خانے تھے اور بائیں طرف ایک بڑا دالان تھا، جس کی چھت ستونوں پر قائم تھی، جس کے سامنے ایک پائیں باغ تھا۔ باغ کی دوسری طرف ایک اور ڈھلوان نیچے کی جانب دوسرے میدان کی سطح تک جاتا تھا، جہاں ایک حمام تھا جس کے ساتھ متعدد چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے اور حمام کے مغرب میں ایک دیوان خلیفہ سے رسمی ملاقات کے لیے تھا، جہاں سے ایک بڑا مستطیل حوض نیچے نظر آتا تھا۔

قصر الحمراء

اس محل کی بنیاد محمد الاحمر والئی غرناطہ نے ۱۲۴۸ء میں رکھی تھی۔ یہ عمارت غرناطہ سے باہر ایک ٹیلہ پر تعمیر کی گئی تھی جس کی لمبائی ۲۴۳۰ فٹ اور چوڑائی ۶۷۴ فٹ تھی۔ اس کے صحن میں سنگ مرمر کا فرش لگا ہوا تھا جس کے دونوں جانب خوبصورت ستونوں کی قطاریں تھیں۔ اس قصر کی دیواروں پر خوبصورت نقاشی کی گئی تھی اور جگہ جگہ خط کوفی میں بادشاہوں کی تعریف و توصیف میں بعض اقوال درج تھے۔ قصر الحمراء کے صحن کے بیچوں بیچ ۱۲۴ فٹ لمبا، ۲۷ فٹ چوڑا اور ۵ فٹ گہرا ایک حوض بنا ہوا تھا۔ اس محل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے مختلف حصوں کا آپس میں وہ تناسب ہے جس کے باعث عمارت میں ایک خاص حسن پیدا ہو گیا تھا۔

قاہرہ اور فاطمی خلفاء

مصر کے فاطمی خلفاء کو بھی خوبصورت عمارتیں بنوانے کا بے حد شوق تھا۔

قصر فاطمیہ

اس عہد حکومت کی یادگار فاطمی قصر ہے، جو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ قصر بارہ

مربع کوشکوں پر مشتمل تھا، جن میں سے ہر ایک کوشک آخری کوشک سے زیادہ دلکش تھا۔ آخری کوشک میں جس کے فرش اور پردے یونانی ساٹن کے تھے، ایک بڑا اطلائی تخت دھرا تھا، جو شکا ری مناظر سے مزین تھا۔ آج فاطمی قصر کے آثار میں سے کچھ باقی نہیں، صرف چھتوں کے وہ شہتیر باقی ہیں، جن پر دربار اور دیہات کی زندگی کی مناظر کندہ ہیں۔ ان میں ہمیں شکاری اور شاہین، باز، بانسری اور عود کے موسیقار اور ایرانی زائروں کی طرح کے صحرائی مسافر نظر آتے ہیں۔

جامع الازہر

''جامع الازہر'' فاطمی دور کی سب سے مشہور عمارت ہے جو ۹۷۲ء میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد (جو ایک درسگاہ بھی ہے) کا صحن بڑا ہے۔ محرابیں بہت سی نوکدار ہیں، جو اینٹوں سے بنائی گئی ہیں۔ یہ محرابیں ۳۸۰ ستونوں پر قائم ہیں۔ مسجد کے مینار بہت بھاری اور مربع شکل کے ہیں، جن کے گرد لوہے کے کٹہرے بنے ہوئے ہیں۔

الجامع الحاکم

اس مسجد کی بنیاد پر خلیفہ الحاکم (متوفی ۱۰۲۱ء) نے ۱۰۱۲ء میں رکھی۔ اس کی پوری عمارت پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ دیواروں پر نقاشی بھی کی گئی ہے۔

یروشلم

امویوں کے عہد حکومت میں خلیفہ عبدالملک نے ۶۸۸ء میں، یروشلم میں قبۃ الصخرہ پر ایک شاندار گنبد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پوری عرب سلطنت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خطوط بھیج کر روپے اور ماہر کاریگروں کے لیے استدعا کی۔ جب سرمایہ جمع ہو گیا تو ایک چھوٹی سی عمارت خزانہ رکھنے کے لیے الصخرہ کے قریب تعمیر کرائی۔ یہ عمارت خود اس چٹان پر گنبد کی تعمیر کے لیے نمونہ بن گئی۔ اس خوبصورت گنبد کا مسجد بنانا مقصود نہیں تھا بلکہ ایک زیارت گاہ بنائی گئی تھی۔

مسجد اقصیٰ

اموی عہد میں یروشلم میں جو مسجد تعمیر ہوئی اسے ''مسجد اقصیٰ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ مسجد پہلو دیواروں پر قائم تھی۔ ۱۰۳۵ء میں ایک فاطمی خلیفہ نے مسجد اقصیٰ کو از سر نو تعمیر کروایا تھا، مگر اس کا قدیم نقشہ بدستور رکھا گیا تھا۔ چونکہ اس عمارت کے اندر درمیانی راستے بھی شمالاً جنوباً تھے،

اس لیے یہ عمارت مسجد قرطبہ کے مشابہ تھی، لیکن اس کے درمیانی راستے زیادہ چھوٹے اور چھت زیادہ بلند تھی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے عہد میں مسجد ایک نئی محراب تعمیر کی اور اس میں صنوبر کی لکڑی کا منبر بنوایا۔

ایران

سلجوقیوں کے عہد میں اصفہان (ایران) میں سلجوقی محل اور مساجد کی تعمیر قابل ذکر ہے، سلجوقی محل عرصہ ہوا بے نشان ہو گئے لیکن ایک قدیم مسجد ابھی تک قائم ہے اس مسجد کی محرابیں نوکدار ہیں چار بڑے بڑے گنبدوں کے ایوان اپنی بلندی کے باعث پورے منظر پر حاوی نظر آتے ہیں۔ ان ایوانوں کے راستے چار طرف کھلتے ہیں۔

سلجوقی اپنی عمارتوں کی تزئین و آرائش اس طرح کرتے تھے کہ اینٹوں کے کام میں کھڑے نمونے بناتے تھے اور راستہ پچی کاری کے مسالے سے ابھرے ہوئے نقش و نگار تراشتے تھے۔ وہ کمروں کی دیواروں پر چکنی چمکیلی سفالی کاشیوں سے تختہ بندی کرتے تھے اور انہیں زرق برق رنگوں اور طلائی آب و تاب کے محلولوں سے رنگ دیتے تھے۔

صفوی عہد میں فن تعمیرات نے خوب ترقی کی۔ اصفہان میں تو بے شمار عمارتیں بنائی گئیں۔ ان میں سے سلطان حسین، مسجد شیخ لطف اللہ، علی قاپی، مسجد شاہ، قصر چہل ستونؒ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان عمارات کی دیوادوں کے وسط میں چار دلکش اور خوبصورت محرابیں ہیں اور ان کے اوپر ایک شاندار گنبد بنا ہوا ہے۔ مسجد شاہ کے گنبد پر نیلی روغنی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اور اس کا گنبد بہت اونچا ہے۔ تبریز اور قزوین میں بھی بہت سی عمارات بنائی گئیں جن میں امام علی رضا کا روضہ اور شاہ عباس کے عہد کی مسجد قابل ذکر ہیں۔

برصغیر پاک و ہند

برصغیر پاک و ہند ہیں، مسلمانوں کی آمد کے بعد سلاطین کے دور میں فن تعمیر میں خاصی دلچسپی لی گئی۔ مسلمان ہندو پاک میں وارد ہوتے وقت اپنے ہمراہ مخصوص تعمیری روایات لائے تھے۔ جدید عمارات کے نقشے، ڈیزائن، نقوش اور خدوخال مسلمان مہندسین کی دماغی کاوشوں کے نتیجے تھے، لیکن تعمیری کام میں ہزارہا ہندوستانی کاریگروں اور معماروں نے حصہ لیا۔

فیروز تغلق کو عمارات بنانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے عہد میں ایک سو سرائیں، تیس تالاب، سو شفاخانے، سو حمام، تیس اعلیٰ مدارس اور ڈیڑھ سو پل تعمیر کروائے۔ اس کے علاوہ

اس نے قریباً دو سو شہر آباد کیے، جن میں حصار، فتح آباد اور جنو پور اب تک موجود ہیں۔ اس نے درویشوں کے لیے خانقاہیں بھی تعمیر کروائیں۔

مغل فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ ان کے عہد میں اس فن نے بہت ترقی کی۔ مغلوں نے ہندوستانی عمارتوں میں محراب، گنبد، گلکاری اور جالی دار کھڑکیوں کا اضافہ کیا۔ مغلوں کے عہد میں لال پتھر اور سنگ مرمر کا استعمال عام ہونے لگا۔

اکبر اعظم نے اپنے عہد میں ہمایوں کا مقبرہ اور آگرہ کی جامع مسجد تعمیر کروائی۔ اس نے فتح پوری سیکری کا شہر آباد کیا جو دس سال کے اندر مکمل ہوا۔ اس شہر کی تعمیر کو ہندوستانی تعمیر کاری کے عجائبات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس شہر میں جو محل تعمیر ہوا اس کے برجیاں اور قبے، سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے، جو بیس پچیس میل کی دوری سے بھی نظر آتے تھے۔ یہیں اس نے ایک دروازہ بھی تعمیر کروایا جسے ''باب الداخلہ'' یا ''بلند دروازہ'' کہا جاتا تھا۔ فتح پوری سیکری میں اکبر کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد بھی فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اکبر نے شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔

جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں اپنے باپ کا مقبرہ، جو اس نے اپنی زندگی میں بنوانا شروع کیا تھا، مکمل کروایا، یہ آگرہ کے قریب سکندرہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جہانگیر نے شیخو پورہ میں اپنے ایک پالتو ہرن کی یادگار کے طور پر ایک مینار بنوایا جو ''ہرن مینار'' کہلاتا ہے۔

جہانگیر کی بیوی نور جہاں نے آگرہ میں اپنے باپ اعتماد الدولہ کا مقبرہ تعمیر کرایا جس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔

شاہجہان کو فن تعمیر سے انتہائی لگاؤ تھا، جس کے باعث اسے ''انجینئر بادشاہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی بنائی عمارتوں میں جامع مسجد دہلی، موتی مسجد آگرہ، لال قلعہ دہلی اور تاج محل بہت مشہور ہیں۔ روضہ تاج محل کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے اور یہ ہر دور میں سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ تاج محل آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے ایک عظیم الشان باغ میں واقع ہے۔ اس کی تعمیر میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ مقبرہ مشہور معمار استاد عیسیٰ خاں کے زیر نگرانی تعمیر ہوا۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ اس کے اصل نگران مکرمت خاں اور عبدالکریم تھے۔ ملکہ کا مزار ایک اٹھارہ فٹ اونچے سنگ مرمر کے چبوترے پر بنا ہوا ہے، جس کے اوپر اروی شکل کا ایک گنبذ ہے۔ مقبرہ کی عمارت کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں، جن میں ہر ایک کی بلندی ۱۳۲ فٹ ہے۔

اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت میں لاہور میں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی جو ''شاہی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے چاروں

کونوں پر ہشت پہلو مینار ہیں۔ اورنگ زیب نے ڈھاکہ میں بھی ایک مسجد تعمیر کرائی۔
دکن میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات میں گلبرگہ کی جامع مسجد، بیجاپور کا گول گنبد، محمود گاواں کا مدرسہ اور حیدر آباد کے چار مینار فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

اختتامیہ

باب ہذا میں ہم نے مسلمانوں نے فن تعمیر کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمان جس جس ملک اور علاقے میں گئے، انہوں نے وہاں عام عمارات، مساجد، خانقاہیں، محلات، پل اور قلعے وغیرہ تعمیر کئے، جامع دمشق، جامع الازہر، جامع قرطبہ، مدینۃ الزہرآء، مسجد اقصیٰ بغداد، آگرہ، لال قلعہ، شاہی مسجد اور روضہ تاج محل مسلمانوں کے فن تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسلامی عہد میں تعمیر ہونے والی عمارات مسلمانوں کے ایک خاص طرز تعمیر کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ طرز تعمیر اسلامی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔

❁......❁

مسلمانوں کی طبی خدمات

ڈاکٹر وکیل جبران

آنحضرت ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام فرمودات نبوی پر عمل کرتے تھے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی احکامات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے صحابہ کو طہارت، صحت و صفائی، کھانے پینے اور سونے جاگنے سے متعلقہ وہ آداب سکھائے جن کا تعلق صحت و تندرستی سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کو یہ ترغیب بھی دی کہ بیماری کی حالت میں اس کا علاج کروایا جائے۔ فرمان نبوی ہے۔

اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس کی دواء نہ اتاری ہو

آئندہ سطور میں ہم طب نبوی سے متعلق چند نمونے پیش کر رہے ہیں، جو احادیث نبویہ سے لئے گئے ہیں۔

اللہ نے تین چیزوں میں شفا رکھی ہے

۱۔ شہد پینا

۲۔ پچھنے لگانا

۳۔ آگ سے داغ لگوانا

بقول ابن عباس آنحضور ﷺ نے اپنی امت کو داغ دینے سے منع فرمایا ہے۔

شہد میں شفا ہے

سورۃ النحل میں شہد سے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ چنانچہ آنحضور e کو خود بھی شہد مرغوب تھا اور وہ صحابہ کو بطور دوا بھی شہد استعمال کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے خدمت نبوی میں عرض کی کہ اس کے بھائی کا پیٹ خراب ہو گیا ہے اور اسے دست آرہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو شہد پلاؤ۔ وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ شہد پلانے سے دست بڑھ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اسے شہد پلاؤ۔ وہ شخص مریض کو

شہد پلانے کے بعد تیسری بار آیا اور کہنے لگا کہ میں نے شہد پلایا ہے۔ لیکن مریض کو افاقہ نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا۔

اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے

آپ نے فرمایا۔ اسے اور شہد پلاؤ۔ اس نے پلایا تو وہ تندرست ہو گیا۔

شیر مادہ شتر سے علاج

آنحضور ﷺ نے بعض بیماریوں میں اونٹنی کا دودھ استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔

ایک دفعہ مدینہ میں کچھ وارد لوگوں کو ہوا موافق نہ آئی اور وہ پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے اونٹنی کا دودھ پینے کا مشورہ دیا۔ وہ کچھ دنوں تک اونٹنی کا دودھ پیتے رہے اور صحت یاب ہو گئے۔

کلونجی ہر بیماری کی شفا ہے

عربی زبان میں مشہور دوا کلونجی کو جسے ''کالا دانہ'' بھی کہتے ہیں، ''جتہ السوادا'' کہا جاتا ہے۔ بقول ابن شہاب اسے ''الشونیز'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

کلونجی (کالا دانہ) موت کے علاوہ ہر بیماری کی شفا ہے۔

تلبینہ باعث تسکین ہے

آٹا، دودھ اور شہد ملا کر جو حریرہ بنایا جاتا ہے، اسے ''تلبینہ'' کہتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

تلبینہ بیمار کے دل کو تسکین دیتا ہے اور رنج کو کم کر دیتا ہے

پچھنے لگوانا

ایک حدیث میں پچھنے لگوانے کو باعث شفاء کہا گیا ہے۔ ایک اور حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ایک موقع پر خود بھی پچھنے لگوائی اور پچھنے لگانے والے کو اجرت دی۔

عود ہندی کے فوائد

''عود ہندی'' ایک مشہور دوا ہے، جو اطباء کے ہاں موجودہ دور میں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہے۔

ام قیس سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

تم عود ہندی کا ضرور استعمال کیا کرو۔ یہ سات بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ حلق کے ورم میں اس کی ناس لی جاتی ہے اور ذات الجنب میں حلق میں ڈالی جاتی ہے۔

سرمہ سے آنکھوں کا علاج

''کھمبی'' جسے عربی میں ''الکماۃ'' اور ''من'' کہتے ہیں سے متعلق سعید بن زید کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے سنا:

کھمبی من میں داخل ہے، اس کا پانی آنکھ میں دوا ہے۔

بندش خون

خون کے لئے بوری جلا کر اس کی راکھ زخم پر لگائی جاتی ہے۔ اس عمل کو ''حرق العصیر لیسد بہ الدم'' (بوریاں جلا کر خون بند کرنا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے)

سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے سر مبارک پر پتھر مار کر خود توڑا گیا اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اور سامنے کے دانتوں میں سے ایک دانت ٹوٹ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لاتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا منہ پر سے خون دھو رہی تھیں۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ پانی سے اور خون بڑھتا جاتا ہے تو انہوں نے جھٹ ایک بوری کا ٹکڑا جلا کر آنحضرت ﷺ کے زخم پر چپکا دیا۔ خون اسی وقت بند ہو گیا۔

علم طب کی فضیلت و اہمیت

آنحضور ﷺ کے فرمان ہے:

ہر بیماری کے لئے علاج ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک طبیب اپنی کم علمی کے باعث کسی مریض کو لا علاج قرار دیدے۔ اس صورت میں مریض کو دوسرے طبیب سے رجوع کرنا چاہئے۔ یہ ممکن ہے کہ بیماری اس کی سمجھ میں آ جائے اور اس کے تجویز کردہ علاج سے مریض روبہ صحت ہو جائے۔ بعض دفعہ متعدد طبیب ایک شخص کو لا علاج قرار دے دیتے ہیں، مگر وہ کسی نہ کسی کے علاج سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علاج تشخیص پر منحصر ہے۔ صحیح تشخیص ہونے پر علاج بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

اس قول میں انسان کو یقین دلایا گیا کہ کوئی بھی بیماری لا علاج نہیں ہے۔ انسان کو کسی بھی حالت میں مایوس نہیں ہو چاہیے۔ ہر مشکل کا حل اور ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو

ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے:

علم دو ہیں، ادیان کا علم اور ابدان کا علم

اس حدیث میں علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی دین کا علم اور علم الابدان۔ ''علم الابدان'' سے مراد ہے علم طب۔ صحت و تندرستی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان جسم سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے۔ اسلام میں علم طب کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کتب احادیث میں طب سے متعلق بھی احادیث درج ہیں اور ''طب نبوی'' کے موضوع پر بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔

عربی زبان میں ''حکمت'' کا جو مفہوم لیا جاتا ہے' اس میں دانائی اور دانشمندی کے علاوہ علم طب بھی شامل ہے۔ اسی مناسبت سے ہماری ہاں طبابت کو ''حکمت'' اور ''طبیب'' کو ''حکیم'' کہتے ہیں۔ حکمت سے متعلق فرمان نبوی ہے:

حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے۔

چنانچہ اسلام نے دینی علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طبی علوم حاصل کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بے شمار نامور طبیب پیدا ہوئے' جنہوں نے طب کے میدان میں' طب اور طبابت کو سنت اور خدمت خلق کے جذبہ کے تحت اپنایا اور اس شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

●......●

میڈیکل سائنس میں مسلمانوں کا کردار

ڈاکٹر وکیل جبران

اس میں شک نہیں کہ ماضی میں مسلمانوں نے بہت سارے علوم وفنون کو نہ صرف عروج بخشا بلکہ ان میں بے پناہ اضافے بھی کیے اور بہت ساری چیزوں مثلاً بارود، قطب نما، الکحل، اور عینک وغیرہ کے موجد خود مسلمان تھے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ کا اصل آئینہ نہیں دیکھنے دیا گیا۔ تاریخ مسلمانوں کی تھی لیبل کوئی اور تھا آئینہ ان کا تھا، تصویر دوسروں کی تھی۔ ہوا یوں کہ مورخین یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد اور ہر اکتشاف کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔ اور بہت ساری تصانیف پر انہوں نے اپنا ہی ٹائٹل چسپاں کر دیا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلویو گوجہ کی طرف منسوب کر دی۔ ولے ناف کے آرنلڈ کو الکحل اور بیکن کو بارود کو موجد بنا دیا۔ آج کتنے لوگ جانتے ہیں کہ راجرز بیکن جسے ہندوستان میں بابائے سائنس سمجھا جاتا تھا، عربوں کا تھا اور اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ صحیح علم حاصل کرنا ہے تو عربی پڑھو۔ مورخین مغرب عام طور پر یونانیوں کو علم کا سرچشمہ بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کی کتابیں چھ سو برس تک اسکندریہ، ایتھنز اور قسطنطنیہ میں مقفل پڑی رہیں۔ عربوں نے انہیں نکالا، عربی میں ترجمہ کیا اور یہی تراجم مسلمانوں کے ساتھ یورپ میں پہنچے۔

یہودی وعیسائی مورخ اسلامی علوم وفنون کا ذکر کرتے وقت نہ دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ گلیلیو، کیپلر، برونو اور راجر بیکن عربوں کے خوشہ چین تھے۔ آج کا طالب علم ان اثرات سے ناآشنا ہے۔ جو یورپ پر عربی تہذیب نے ڈالے۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کا لفظ **Measure** معیار کا، انفلوئنزا (**Infulenza**) انزال، الانف (ناک بہنا) کا اور ارتھ (**Earth**) ارض کا بگاڑ ہے اور بعض لوگوں کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ کولمبس نے بحر پیمائی کی تعلیم اسلامی درگاہوں میں حاصل کی تھی۔ اس کے پاس رہنمائی کے لیے عربوں کا ایجاد کردہ قطب نما

(Compass) اور شریف الادریسی کی تیار کردہ اٹلس تھی اور افریقہ کے بحری سفر پر جانے والوں کے پاس وہ نقشے تھے جو عرب، بحیرہ، روم، بحیرہ قلزم، بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے سفر میں صدیوں سے استعمال کر رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ علم دو ہیں علم دین اور علم طب۔ یہی وجہ ہے کہ علم دین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے علم طب پر بہت محنت کی۔ اس کو فروغ دیا اور طبی کمالات پیش کر کے علم طب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے علم طب کے حصول کی تاکید فرمائی بلکہ حضور ﷺ خود بھی علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً (۱) آپ نے فرمایا کہ بخار تیز ہو جائے تو اس کی تپش کو پانی ڈال کو ٹھنڈا کیا جائے۔ موجودہ دور میں بھی یہ طریقہ کار استعمال ہوتا ہے۔ (۲) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شہد میں شفا ہے۔ اگر نہار منہ اسے چاٹا جائے تو یہ بلغم دور کرتا ہے۔ معدے کو دھوتا اور اس کے فضلات دور کرتا ہے۔ چونکہ طب کے علم کو مذہبی تائید حاصل تھی اور اس بارے میں حضور ﷺ نے خصوصی تاکید فرمائی تھی اور لیے مسلمانوں نے علم دین کے ساتھ ساتھ علم طب پر خاص توجہ دی اور اس میں وہ کمالات دکھلائے کہ اپنے و بیگانے کہہ اٹھے کہ اگر آج ارسطو اور جالینوس زندہ ہوتے تو وہ بھی ان تصانیف کا احترام کرتے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں سائنسی ارتقاء بڑی سرعت کے ساتھ ہوا۔ کیونکہ مامون نے خود علم طب کے میدان میں بے حد کوشش کی تھی ۸۳۲ء میں اس نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا۔ اس ادارے میں سائنسی علوم پر بہت توجہ دی گئی اور جہاں نامور و قابل اطباء اور حکماء نے خدمات سر انجام دیں۔ وہاں یونانی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے بھی کیے جاتے۔ مامون نے کئی اہل علم ترجمے کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔

عہد اسلامی کے مشہور اطباء

اسلام نے ہزاروں علماء و حکماء پیدا کیے یہ سب کے سب طبیب تھے۔ اس لیے کہ اس وقت دیگر مضامین کے ساتھ طب کی تعلیم لازمی تھی۔ سو جو بھی منجم، فلسفی یا ریاضی دان بنتا، وہ طبیب لازماً ہوتا۔ لیکن ان میں اکثر کو پیشہ نہ بنا سکے۔ یہاں صرف ایسے حکماء کا ذکر مقصود ہے۔ جنہوں نے طب میں نام پیدا کیا اور اس فن پر کتابیں لکھیں۔

حنین بن اسحاق (۸۰۹-۸۷۷ء)

مسلمان حکمرانوں کی قدر دانیوں اور زر پاشیوں کا نتیجہ تھا کہ حنین بن اسحاق عیسائی ہونے کے باوجود طب کی دنیا میں مشہور ہوا۔ وہ عربی زبان کے علاوہ یونانی اور سریانی زبان پر کامل عبور رکھتا تھا۔ مامون الرشید نے اسے بیت الحکمت کا سربراہ مقرر کیا۔ اس کے متعلق مشہور

ہے کہ جب وہ ایک کتاب کا ترجمہ کر کے مامون الرشید کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ اسے کتاب کے وزن کے برابر سونا تول کر عطا کرتا۔ حنین بن اسحاق نے ۱۳۰ کتابیں عربی میں منتقل کیں اور تقریباً تین درجن کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بیشتر طب پر اور کچھ طبیعیات پر ہیں۔

یعقوب بن اسحاق الکندی متوفی ۸۵۰ء

الکندی یمن کا رہنے والا تھا۔ آج سے گیارہ سو سال قبل اس نے گرانقدر علمی خدمات سرانجام دیں۔ یہ فطرتاً صاحب علم پیدا ہوا تھا۔ اس نے مختلف علمی شعبوں میں مہارت تامہ حاصل کر کے بہت سی علمی تصانیف پیش کیں۔ وہ اسلام کا مشہور فلسفی، منجم، طبیب اور طبیعی تھا۔ اس کی تمام عمر کتب تصنیف کرتے ہی گزر گئی۔ القفطی نے اس کی ۲۲۵ کتابوں کی فہرست دی ہے اس نے طب پر ۲۴ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ابو بکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۵-۹۲۵ء)

یہ نویں صدی عیسوی میں دنیا کا سب سے بڑا طبیب اور دنیا کے پہلے طبی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف کا نام الحاوی ہے۔ اس نے دو سو کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی بعض کتابیں ترجمہ ہو کر یورپ کی درسگاہوں میں مدتوں بطور نصاب استعمال ہوتی رہیں۔ راجر بیکن بار بار رازی کا ذکر کرتا ہے۔ رازی نے یورپ کی طب پر گہرا اور پائیدار اثر ڈالا۔ رازی وہ پہلا طبیب ہے۔ جس نے چیچک پر تحقیق کر کے مرض کے اسباب متعین کیے اور اس کی تمام کے طریقے تجویز کیے۔ خسرے، چیچک پر ایک کتاب کا نام الجدری والحصبہ ہے۔ یہ کتاب جو پہلے لاطینی اور پھر دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ پیرس یونیورسٹی میں رازی اور سینا کی تصاویر آج بھی آویزاں ہیں۔

بو علی سینا (۹۸۰-۱۰۳۷ء)

دنیائے اسلام کا یہ عظیم فلسفی اور طبیب ایرانی نژاد چار مشہور اطباء میں سرفہرست ہے۔ دیگر تین اطباء علی بن ابن الطبری، محمد بن زکریا رازی اور علی بن العباس ہیں۔ شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا کو بادشاہ طب کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب اسے ابوے سینا کے نام سے پکارتے ہیں۔ عرب کی تاریخ میں اسے الشیخ الرئیس اور المعلم الثانی کا نام دیا گیا اس نے اسلامی طب کو اوج کمال پر پہنچایا۔ اس کی بے مثال تصنیف القانون اٹھارہویں صدی تک یورپ کی طبی یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔ ڈاکٹر ولیم

اسسلر القانون کو طب کی بائبل کہا کرتا تھا۔ بارہویں صدی میں جیرارڈ نے اسے لاطینی میں منتقل کیا اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پندرہویں صدی کے آخری تیس برس میں یہ سولہ مرتبہ شائع ہوئی اس کے پندرہ ایڈیشن لاطینی تھے اور ایک عبرانی، سولہویں صدی میں اس کے بیس ایڈیشن نکلے اس کا ایک جزوی ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا یورپی علماء نے اس قدر شرحیں لکھیں اور چھوٹے چھوٹے حصوں کے اس قدر ایڈیشن نکالے کہ انہیں شمار کرنا مشکل ہے۔

ابوالقاسم بن عباس الزہراوی پیدائش ۹۳۶ء

ابوالقاسم بن عباس الزہراوی اندلس میں عربی دور حکومت کے نہایت بلند پایہ یگانہ روزگار اور جلیل القدر طبیب اور دنیا کے پہلے نامور سرجن تھے۔ انہوں نے انسانی اعضا کی تحقیق کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ موفق الدین بن ابی صبیعہ آپ کے طبی علم و کمال کی نسبت اپنی کتاب عیون الانبیافی طبقات الاطباء میں لکھتے ہیں کہ ابوالقاسم بن عباس الزہراوی ایک فاضل طبیب، علم ادویہ مفردہ مرکبہ کے جید عالم اور بہترین معالج تھے ان کی نہایت ممتاز خصوصیت کمال علم جراحت ہے جس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فرانس، ویانا اور دنیائے مغرب کے مہتم بالشان اسپتالوں میں سرجری کے جو کمالات نظر آ رہے ہیں وہ بڑی حد تک ابوالقاسم الزہراوی کے نقش قلم اور علم و ہنر کی یادگار ہیں۔

ابوعلی حسن بن الہیثم (۱۰۳۹-۹۶۵ء)

الہیثم بصرے کا رہنے والا تھا پورا نام ابوعلی حسن بن الہیثم تھا۔ یہ دو سو کتابوں کا مصنف تھا۔ ان میں سے بیشتر ریاضی، ہیئت، روشنی اور بصریات پر ہیں اس نے ایسے شیشوں پر بحث کی ہے۔ جن سے اشیاء صاف اور بڑی نظر آتی ہوں۔ اس طرح عینک ایجاد ہوئی۔ ابن الہیثم مشرق و مغرب کی طبی دنیا میں امام بصریات کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ دسویں گیارھویں صدی کا ایک ایسا مسلمان سائنس دان ہے جس کی تحقیقات سے جلیل القدر اور مغربی سائنس دانوں نے استفادہ کیا۔ ابن الہیثم نے پہلی دفعہ اعلان کیا کہ روشنی شفاف چیز سے گزر کر ایک طرف کو مڑ جاتی ہے۔ روشنی کی اس خاصیت کو اس نے انعطاف کا نام دیا اس نے روشنی کے منبع اور عدسے کے ذریعے اس کے عکس کا درمیانی تعلق معلوم کیا اور اس طرح ایک معرکہ آرا مسئلہ حل کیا جو ابھی تک سائنسی دنیا میں الہیثم کا مسئلہ کے نام سے مشہور ہے۔ بن الہیثم کو نظریہ بصارت کا بانی تصور کیا جاتا۔ اس نے بطلیموس اور اقلیدس کے اس نظریے کی تردید کی کہ آنکھ سے نکلنے والی شعاعیں کسی مرئی شے پر پڑتی ہیں تو اس شے کا عکس آنکھ بنتا ہے اور اس کا نام رویت یا بصارت ہے۔ گیلیو نے

اس کے مشاہدات سے کام لے کر دور بین ایجاد کی۔ راجر بیکن اپنی تصانیف میں بار بار ابن الہیثم کا ذکر کرتا ہے۔ ابن الہیثم ہی کے نظریے پر عمل کر کے ہی دور جدید کے سائنس دان عینک بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اسحاق مصری (۸۵۵-۹۵۵ء)

فاطمی خلفاء کا درباری طبیب تھا اس کی دو کتابیں قارہورہ اور ہادی الاطباء صدیوں یورپ کی درسگاہوں میں رائج ہیں۔

ابن الجزائر (۱۰۰۹ء)

یہ اسحاق کا شاگرد تھا۔ اس کی ایک کتاب زادالمسافر یونانی، عبرانی اور لاطینی میں ترجمہ ہوئی۔

علی عباس (۹۹۴ء)

ایران کا ایک طبیب جس کی الکتاب الملکی دو مرتبہ لاطینی میں ترجمہ ہوئی اور یورپ کی درسگاہوں میں بطور نصاب استعمال ہوتی رہیں۔

ابن رشد (۱۱۹۸ء-۱۱۲۶ء)

اسپین کا یہ فلسفی طبیب بھی تھا اس کی کلیات فی الطب کو ۱۲۵۵ء میں ایک یہودی بناقسہ نامی نے لاطینی میں منتقل کیا اس نے طب پر سولہ کتابیں لکھیں تھیں۔

فخر الدین محمد الرازی (۱۲۱۰-۱۱۴۹ء)

عظیم مفسر و فلسفی تھے تاریخ الحکماء میں ان کی اکسٹھ تصانیف کے نام دیے ہوئے ہیں۔

جدید زراعت میں مسلمانوں کے کارنامے

ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم

مسلمان سائنسدانوں نے جدید علوم کے ہر میدان میں نہایت گراں قدر کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ کیمیا، طب، طبعیات، حیاتیات، فلکیات اور دیگر بے شمار علوم میں ان کے لازوال کارناموں سے تاریخ منور ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان اپنے ان قابل فخر سپوتوں کے کارناموں سے نہ تو آگاہ ہیں، اور نہ انہیں کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں۔ پراپیگنڈے کے اس دور میں اور کچھ اپنی غفلتوں کے باعث دورِ جدید کے یورپی سائنسدانوں سے صرف متاثر بلکہ مرعوب اور انہی کے مقلد نظر آتے ہیں۔

قدیم مسلمان سائنسدانوں کی سائنسی تحقیقات کے ضمن میں کیمیا، فلکیات اور طب وغیرہ کے حوالے سے تو اہل علم کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں البتہ زراعت ایک ایسا شعبہ ہے جس کے بارے میں مسلمان کی تحقیقات بالکل پردۂ اخفا میں ہیں۔ آج ہم کوشش کریں گے کہ زراعت کے میدان میں مسلمان سائنسدانوں نے جو کارہائے نمایاں سر انجام دیے ہیں ان پر ایک نظر ڈالی جائے۔

اگر ان کارناموں کا آغاز ہجرت مدینہ کے بعد سے کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انصار مدینہ اوس وخزرج کے قبائل پر مشتمل تھے اور انکی معیشت کا بیشتر مدار زراعت پر ہی تھا۔ مدینہ کے اطراف میں قائم بڑے بڑے نخلستان، سرسبز وشاداب قطعات زمین ان کی مہارتوں کے آئینہ دار تھے۔ مختلف کھجوروں کی افزائش، پیوندکاری اور نئی قسموں کی تعلیم، تربیت اور تشکیل معاشرہ پر مرکوز رہی۔ بعض صحابہ نے زرعی معاملات میں حضور ﷺ سے رہنمائی مانگی تو آپ نے ہدایت کی کہ اپنی مہارتوں اور تجربوں سے کام لے کر فیصلے کرو۔

خلافت راشدہ، اشاعت وتبلیغ اسلام وسعت سلطنت اسلامی کا عہد ہے۔ مسلمان جہاں جہاں گئے اپنے تہذیب وتمدن کے ساتھ زرعی مہارت بھی لے گئے۔ کم از کم کھجور کی کاشت

کی مہارت تو لازماً ہر جگہ پہنچی۔ بعض علاقے آب و ہوا کے لحاظ سے اس کے موافق رہے اور بعض ناموافق۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض زرعی اصطلاحات کا واضح تذکرہ موجود ہے جس سے فصلوں میں بہتری، اضافہ اور آمدنی میں وسعت کے حوالے ملتے ہیں۔

اموی عہد میں مسلمانوں کو دور دور تک پہنچنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ غالب امکان ہے کہ اسپین اور برصغیر میں طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کے ذریعے کھجور اور مسلمان زرعی سائنسدان اور ماہرین کی آمد ہوئی۔ انہی گمنام سائنسدانوں کی بدولت آج صوبہ بلوچستان اور سندھ کے بیشتر علاقوں میں رنگ، نسل، ذائقے اور حجم کے اعتبار سے بیسیوں قسم کی کھجوریں اگائی جاتی ہیں جن میں سے بہت سی دوسرے ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہیں۔

مسلمان زرعی سائنسدانوں کی مہارتوں اور کارناموں کا اصل میدان ''اندلس'' کی زرخیز و شاداب سرزمین ہے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک علم و ادب، تہذیب و معاشرت اور تعمیر و ترقی کی لازوال تاریخ مرتب کی۔

معروف یورپی مورخ Watt کے حوالے سے مذکور ہے کہ ''اسپین میں مسلمانوں کی آمد سے قبل زراعت محدود، وسائل معیشت تنگ اور عوام مفلوک الحال تھے۔'' مسلمانوں نے دیگر شعبوں کی طرح زراعت پر توجہ دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام قابل کاشت اراضی کو زیر کاشت لا کر زرخیزی میں اضافہ کیا۔ نئی کھادوں کا استعمال اور آب پاشی کے تمام ممکنہ ذرائع سے استفادہ کیا۔ معروف سیاح ابن موقل نے اپنے سفر اندلس کے بارے میں لکھا: ''یہاں کی زمینیں زرخیز، دریاؤں سے آب پاشی کا انتظام معقول، ضروریات زندگی ارزاں اور عوام خوشحال ہیں۔''

مسلمان ماہرین نے روئی جو کہ مشرق کی پیداوار ہے، اندلس میں متعارف کروائی۔ اسی طرح پٹ سن کی کاشت بھی شروع کی گئی جس سے اس دور کا بہترین، مضبوط اور عمدہ دھاگا تیار کیا جاتا تھا۔

زیتون بھی اسپین کی خاص پیداوار ہے۔ مسلمانوں نے اسے ایسی ترقی دی کہ بعض مقامات پر چالیس چالیس میل تک زیتون کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے۔ زیتون کا تیل بری اور بحری راستوں سے دنیا بھر میں سپلائی کیا جانے لگا۔ پورے جزیرہ نما اندلس میں اس کی کاشت ہونے لگی۔

بے شمار اقسام کے اعلیٰ انگور، خوشبودار امرود اور لیموں کی کاشت کے وسیع رقبے بھی مسلمان ماہرین زراعت کے کارنامے تھے، دیگر پھلوں میں انجیر کی دو اقسام، اعلیٰ درجہ کے پانچ بالشت گولائی کے سیب جو اپنی شیرینی میں بھی بے مثال تھے، بادام، آڑو، چکوترا، خربوزے وغیرہ

کی پیداوار شامل ہے۔

اسپین کے بعض علاقے گنے کی کاشت کے لیے موزوں تھے۔ مسلمانوں نے یہاں گنے کی شاندار کاشت کی جس کے نتیجے میں حیرت انگیز حد تک چینی تیار کر کے برآمد کی جاتی۔

مسلم ماہرین زراعت نے اسپین میں متعدد اقسام کی اجناس، میوے، پھل نہ صرف اگائے بلکہ ان کی حفاظت کے طریقے بھی ایجاد کیے۔ ابن العوام نامی ماہر زراعت نے پھلوں، غلے اور زیتون کو طویل مدت تک محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے۔ یہ نامور سائنسدان بارہویں صدی عیسوی میں اپنے زرعی کارناموں کے باعث مشہور ہوا۔ اس نے زراعت اور باغبانی میں مسلمانوں کے مشاہدات، تجربات اور تحقیق کو "کتاب الفلاحۃ" کے نام سے علم زراعت پر دو جلدوں پر مشتمل کتاب میں بیان کیا۔ اس کتاب کے ۳۵ ابواب ہیں۔ پہلے حصہ میں زمین، کھاد، پانی کی شناخت اور طریقہ استعمال پر بحث ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اجناس کی کاشت کے طریقے، مویشیوں کی پرورش، مرغی خانے، شہد کی مکھیوں کی پرورش اور اس کی مصنوعات پر ماہرانہ تجزیے و تبصرے شامل ہیں۔ اسی کتاب میں ۵۸۵ پودوں اور ۵۵ میوہ دار درختوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی بیماریوں، علاج اور پیوند کاری کی تفاصیل ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا اس نے خود متواتر تجربہ نہ کر لیا ہو۔ اس کتاب کو علوم نباتات میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یورپ میں طویل مدت تک کوئی کتاب اس درجے کو نہیں پہنچ سکی۔

ایک اور زرعی ماہر ابن بصال نے شمالی افریقہ، مصر اور حجاز کا سفر کیا اور واپسی پر زراعت سے متعلق ایک ضخیم کتاب "دیوان الفلاحۃ" لکھی جس میں زمین کی اقسام اور پانیوں کے اثرات کا فرق بیان کیا۔ مسلم ماہرین زراعت میں ابو عبداللہ الطغری اور ابن حجاج کا نام بھی شامل ہے۔ دونوں نے علم زراعت پر کتابیں لکھیں۔ ابن حجاج نے اپنی کتاب میں تیس ماہرین زراعت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ابوالخیر الاشبلی نے بھی ایک کتاب لکھی جس میں مختلف باغوں، کھیتوں اور جنگلوں میں کیے گئے اپنے زرعی تجربات و مشاہدات بیان کیے۔

یہ تو عہد زریں کے صرف ایک علاقے کے مسلمان ماہرین زراعت کے کارنامے ہیں۔ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم ماہرین زراعت نے ہر جگہ وسیع و کامیاب تجربات، مشاہدات اور مہارت کے نتیجے میں لازوال زرعی کارنامے سرانجام دیے ہوں گے۔

عہد حاضر میں پاکستان میں زرعی سائنسدانوں کے کارنامے کسی سے مخفی نہیں۔

مسلمانوں کی اسلحہ سازی کی تاریخ

عبدالحلیم جانباز

ہجرت کے بعد جب رفتہ رفتہ مدینہ میں مسلمان معاشرہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے لگا تو مسلمانوں کے عمرانی اور تمدنی مزاج میں بھی بہت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایسا ہونا وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔ سیاسی اثرات کا دائرہ بھی اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ وسیع ہوا اور جہاد کا حکم نازل ہوا تو مسلمانوں میں حربی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں اور مجاہدانہ روح اپنے مثبت اثرات دکھانے لگی۔ مسلمانوں کو نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں آپ کی ہدایات کے مطابق اپنی نظریاتی حدود کے تحفظ کی خاطر غزوات اور سرایات کی جنگیں لڑنا پڑیں، یہ سب کچھ تاریخ کی ضرورت کے تحت ہوا۔ اور یہی عین منشائے ربانی تھا۔ جب قرآن نے یہ حکم نافذ کیا کہ

یعنی اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرنا۔ (البقرہ)

مسلمانوں کے مدمقابل ہونے کا مطلب تھا، جنگ یا قبول اسلام یا پھر اسلامی حکومت کی اطاعت اور اسلام سے مراد روح اسلام سے مالا مال ہونا تھا۔ دوسری صورت میں ہتھیار ڈال کر اسلامی حکومت کی اطاعت اختیار کر لینا لازم آتا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بات طے ہو جانے تک تلوار کو میان میں رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جہاد کے حوالہ سے نبی ﷺ کی بعض احادیث میں جنگی اسلحہ کا ذکر موجود ہے۔ مثال میرا مقدر یا رزق میرے نیزے کے سائے میں یا جنت تلواروں کے سائے میں ہے'' لیکن ان احادیث کی روح خوفناک جنگی یا وحشی مزاج پیدا نہیں کرتی بلکہ ان سے مراد یہ ہے کہ اگر جہاد کی نوبت آہی جاتی ہے تو پھر وہ شخص جو جہاد میں شامل ہوا اور زندہ رہا، اسے حق حاصل ہے کہ وہ غنائم کی فضیلتوں سے بھی فائدہ اٹھائے۔ قرآن میں غارت گری یا قتل عام کا کسی حالت میں بھی ہرگز کوئی جواز موجود نہیں۔ تاہم بعض صریح حالات میں ایک واضح اور آبرومندانہ جنگ کا حکم بہرحال

موجود ہے۔ جسے کامیابی کے ساتھ لڑنے کے لیے تمام حربی ذرائع استعمال کرنا بھی ضروری امر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے "الحرب خدعة" یعنی جنگ داؤ پیچ دکھانے کا نام ہے۔ یہی چیز War Strategy جنگی حکمت عملی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سامنے ایسی ناگزیر صورت حال جب بھی پیدا ہوئی، وہ اس امتحان میں پورے اترے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بہت بعد کی صدیوں میں تاتاریوں اور جرمنوں نے تہذیب انسانی کو وحشیانہ انداز میں پامال کیا۔ یہاں تک کہ آج دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی ایک سو تیں کے قریب چھوٹے بڑے محاربات ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر صدیوں پہلے کے مسلمانوں نے اپنے محاربات میں اس کے برعکس اپنی فتوحات کو تہذیب اور اخلاق حسنہ سے سرفراز فرمایا:

کیونکہ ان کے عظیم قائد محمد عربی ﷺ کا طریق کار اور ہدایت نامہ اپنے مجاہدین کے لیے اس باب میں بالکل مختلف اور یوں تھا کہ تصادم کے ناگزیر ہو جانے کی صورت میں بین الاقوامی انسان دوست قانون پر کاربند رہنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے سپاہیوں کو رخصت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> "اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اپنے ہمراہیوں سے بھلائی کا سلوک کرنا۔ صرف اس سے لڑنا جو اللہ کا انکار کرے۔ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا۔ بغاوت نہ کرنا، کسی کے ناک کان نہ کاٹنا۔ عورتوں اور بچوں کو ہرگز قتل نہ کرنا۔ جو تمہاری پناہ میں آ جائیں، ان سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ کھیت کھلیان، مکانات اور باغات کو برباد نہ کرنا۔"

اس جنگی ضابطے کا ذکر ترمذی، بخاری اور مسلم میں موجود ہے۔ ابن خلدون نے جنگ کو معاشرے کی طبعی حالت قرار دیا ہے۔ کیونکہ کچھ بھی ہو یہ معاشرے میں بار بار رونما ہوتی ہے اور خود انسانی فطرت اس کی ذمہ دار ہے۔ قوموں کی زندگی میں اہم ترین اجتماعی فریضہ اپنی مملکت یا اپنی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع ہے۔ چنانچہ عمرانی تقاضوں کے تحت نبی اکرم ﷺ کی حربی پالیسی اقدامی دفاع کی رہی۔ آپ نے تاریخ میں پہلی بار ایسی جنگیں لڑیں جن میں ملت کے جملہ وسائل بروئے کار لائے گئے اور انہیں زندگی کے تمام شعبوں تک پہنچا دیا گیا۔ اس سے پہلے اس قسم کی ہمہ جہت اور کلی جنگ کا تصور ہی نہیں تھا۔ ایسے ناگزیر حالات سے نبٹنے کے لیے قرآن کا واضح حکم یہ ہے:

> یعنی جب تم کفار کے مقابل ہو تو (میدان جنگ) میں انہیں قتل کرو یہاں تک کہ جب غلبہ حاصل کر لو تو جنگی قیدیوں کو مضبوطی سے باندھ لو۔ پھر یا احسان کر دو یا معاوضہ لے لو یہاں تک لڑائی میں اپنے ہتھیار رکھ دے۔" (سورۂ محمد)

چنانچہ یہ جہاد تھا اور جہاد کے معنی ہیں نیکی کے قیام کے لیے بدی کا ہر حال میں استیصال اور پھر جب مسلمانوں کا مقابلہ طاغوتی اور اسلام دشمن طاقتوں سے ناگزیر ہو گیا تو وہ عالم سرفروشی میں اکناف عالم تک پھیل گئے۔ ایک زمانے تک دنیا میں چہار سو ان کی فتوحات کے پھریرے لہرائے اور سورج بلاشبہ ان کی جغرافیائی سرحدوں پر کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

سابقہ صدیوں کی ایک طویل حریت پسندانہ جدوجہد میں جذبہ جہاد نے جہاں اظہار روح جہاد کے لیے کئی دوسرے ذرائع اختیار کیے، وہاں حربی ایجادات کے اعتبار سے بھی مسلمانوں نے حربی تاریخ کو فنی اور تکنیکی رنگ میں بہت کچھ عطا کیا اور جنگی کشمکش کے مواقع پر اپنی صنعتی اور حرفتی صلاحیتوں کا بھی لوہا منوایا۔

سورہ انفال میں جنگی تیاریوں کے سلسلے میں حکم ہے:

اور تم ان سے لڑائی کے لیے اتنی قوت اور زور آور گھوڑے تیار رکھو کہ جتنے تم کر سکتے ہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بعض دوسری اقوام پر بھی۔

یہاں قوت سے مراد اسلحہ جنگ ہے۔ اقوام عالم کو قابو میں رکھنے کیلئے جدید ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے۔ یہ مقصد مانگے ہوئے ہتھیاروں سے پورا نہیں ہو سکتا بلکہ ان میں خود کفیل ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایٹمی اسلحہ کی تیاری کو اچھا نہیں کہا جاتا مگر طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے اور ذہنی و نفسیاتی فضا بدلنے کے لیے اس کی تیاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کا اصل جنگی و حربی رومی اور ایرانی محاذوں پر ہوا۔ تب انہوں نے دشمنوں کی عسکری تدابیر کو بڑی کامیابی کے ساتھ دشمنوں ہی کے خلاف استعمال کیا۔ فلپ کے حتی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوجی قوت نہ ساز و سامان جنگ کی برتری میں مضمر تھی نہ نظم و تربیت کی عمدگی میں بلکہ ان کا اصل راز ان کی ہمت و حوصلہ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا تھا تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ موت سے بے خوفی اور حوصلہ کے ساتھ ہی مسلمانوں نے اسلحہ جنگ سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اختراعات کیں اور انہیں بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ استعمال بھی کیا۔ جاہلیت کے ایام میں عرب تلوار، نیزے، تیر، کمان، خنجر، ڈھال خود اور زرہ کو عام طور پر استعمال کرتے تھے اور یہ ساری چیزیں وہ بڑی فنکارانہ صلاحیت اور خوبصورتی کے ساتھ ڈھالتے تھے۔

عربوں کی قدیم شاعری میں اسلحہ جنگ کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے۔ اس میں ایک دھاری اور دو دھاری تلوار کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ نواح شام کی بنی ہوئی مشرافی تلواریں اور یمنی تلواریں اپنی کاٹ اور پائیداری میں بہت مشہور تھیں۔ یہ تلواریں عموماً چوڑی اور سیدھی ہوا کرتی

تھیں۔ خمار تلوار بعد میں بصرہ کی چھاؤنی میں تیار ہونے لگی۔ عرب مختلف قسم کے نیزے استعمال کرتے تھے۔ نیڑھے، سیدھے، دوشاخہ، خمار وغیرہ۔

ان کے چھڑ بانس کے ہوا کرتے تھے۔ برچھیوں کے اندر دھات کی تیغ ہوا کرتی تھی۔

آمد اسلام کے بعد تیر و کمان کی ساخت میں بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ پیروں سے چلانے والی کمان تیار ہوئی جس میں بوجھل تیر استعمال ہوتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا تیر ایک بالشت لمبا ہوتا۔ بوجھل تیروں کی بے شمار اقسام تھیں۔ صحابہ کے عہد مبارک میں نیزہ جسے رمح کہا جاتا تھا، خاص ہتھیار تھا۔ پیادہ لشکر پہلے فاصلے سے تیر و کمان سے کام لیتا۔ پھر تلوار سے حملے اور ڈھال سے دفاع کی نوبت آجاتی تھی۔ دست بدست لڑائی عموماً تلوار، نیزہ، خنجر، نیزے اور ڈھال سے لڑی جاتی تھیں۔

تلواریں اوائل اسلام میں گلے میں لٹکائی جاتی تھیں۔ ترکش پہلو میں جمایا جاتا اور کمان کندھے پر رکھی جاتی تھی۔ عیسائی اقوام خصوصاً رومیوں سے جنگ آزما ہونے کے بعد انہی کے انداز میں ہتھیار اور جنگی لباس پہننے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ زرہ اور خود جو لوہے کا جنگی لباس تھا، نبی اکرم ﷺ نے بارہا دوران جنگ زیب تن فرمایا تھا، یہ زرہیں لوہے، فولاد اور بعض اوقات کتان سے بنائی جاتی تھیں۔ ان سے چھاتی، کلائیاں اور پنڈلیاں محفوظ ہو جاتی تھیں۔ زرہ میں سینے کی حفاظت کرنے والا حصہ جوشن کہلاتا تھا، اور سر ڈھانپنے والے حصے کو مغفر کہتے تھے۔ خود کھوپڑی کی حفاظت کے لیے تھا۔ زرہ اور خود کی ساخت اور انداز آگے چل کر مختلف مسلم علاقوں میں رواج کے مطابق بدلتے گئے۔ اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتے گئے۔ زرہ کی کڑیاں زردیات کہلاتی تھیں اور خود پر سونے کے بیل بوٹے کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ ابتدائی عباسی عہد میں خلیفہ اور سپہ سالاروں کی زرہوں اور ڈھالوں پر قرآن کی آیت "**فسيكفيكهم الله وهو السميع العليم** (پس آپ کو اللہ کافی ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے) لکھی جاتی تھی۔

ایک زمانے میں مسلمان اشبیلیہ میں تیر و کمان بنانے کے لیے ایک خاص قسم کی لچک دار لکڑی استعمال میں لایا کرتے تھے جو کہ غالباً شہتوت کی ہوتی تھی۔ کیونکہ اندلس میں ریشم کے کیڑے پالنے اور ریشمی کپڑا بنانے کی صنعت عام تھی اور یہ کیڑے شہتوت کے پتوں پر پالے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ مخصوص لکڑی کاشت کرنے کے لیے ایک زراعتی اور صنعتی منصوبہ کے تحت شجر کاری کی جاتی تھی۔ اندلس میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی المریہ کے شہر میں جہاز سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کر لیے تھے۔ اس علاقے میں لوہے کی اور تانبے کی کانیں بھی تھیں۔ اسی طرح قرطبہ میں سیسہ کانوں سے نکالا جاتا تھا۔ ان دھاتوں سے طلیطلہ میں

نہایت نفیس اور منقش تلواریں بنائی جاتی تھیں۔ ان تلواروں کو دمشقی، مشرقی تلوار کے معیار پر ڈھالا جاتا۔ ابن الخطیب نے غرناطہ کے نواح میں عیسائی حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں کے ایک بہت بڑے آلہ حرب کا ذکر کیا ہے جو محصورین کے درمیان گولے برساتا تھا۔ اس عہد کی اندلسی نظموں میں اس مشین کی پیدا کردہ تباہی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ابن خلدون نے ایک اور حربی مشین عرادہ کا ذکر کیا ہے اور قلعہ شکن آلات میں سے ایک ہدام النفط کا نام بھی لیا ہے۔ جس سے حصا الحدید یعنی لوہے کے موٹے موٹے گولے برسائے تھے۔ اندلسی مسلمانوں نے سیدھے پھلوں اور تلواروں کے قبضہ پر طلائی مینا کاری اور بھرت کا کام بھی ہے۔ ایسے خنجر بنائے جاتے تھے جو گوش نماز طرز کے ہوتے تھے۔

مسلمان مجاہدین کے لیے قلعوں کی برجیوں اور فصیلوں کو مسمار کرنا ایک نیا تجربہ تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے پہلی دفعہ جو قلعہ شکن آلات دوران جنگ استعمال فرمائے ان میں منجنیق اور دبابہ بھی بہت مشہور ہیں۔ ان بوجھل آلات کے استعمال کے طریقے سیکھنے کے لیے نبی اکرمؐ نے صحابہ میں سے غیلان بن سلمہ اور عروہ بن مسعود کو یمن کے علاقے جرش میں روانہ فرمایا۔ فصیلوں کے اطراف میں خندقوں میں ایرانی انداز میں لوہے کے کانٹے اور کترنیں بکھیر کر بھی راستوں کو دشوار گزار بنانے کا جنگی حربہ استعمال کیا گیا۔ منجنیق چھوٹی، بڑی کئی اقسام کا ایک بوجھل آلہ حرب تھا جسے حجم کے مطابق کم یا زیادہ سپاہی کھینچ کر چلا چڑھا کر چلایا کرتے تھے۔ سندھ کی فتح کے دوران محمد بن قاسم نے جس منجنیق کو استعمال کیا، اس کا چلا پانچ سو سپاہی چڑھاتے تھے۔ اس کا نام عروس تھا۔ جرجی زیدان نے تاریخ تمدن اسلام میں منجنیق کی شکل وصورت اور اس کا استعمال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لکڑی کا ایک سیدھا پھڑ ہوتا ہے جس کے سرے سے ایک گھوپھن نما چیز نکلتی ہے۔ اس میں پتھر رکھ کر پھڑ کو تسموں کے ذریعے پیچھے کھینچا جاتا ہے۔ پھڑ کے نیچے ایک مضبوط کمانی پوری طرح دب جاتی ہے۔ یکایک اسے چھوڑ دیں تو وہ پھڑ زور سے آگے کو جھکے ہوئے ایک مسطح تختہ پر جا گرتا ہے اور پتھر نکل کر اڑتے ہوئے دور اپنے ہدف کو جا لیتا ہے۔

امام محمد بن حسین شیبانیؒ نے کتاب السیر الکبیر میں لکھا ہے کہ مجاہدین کو اجازت ہے کہ وہ دشمنوں کے شہروں کے قلعے کی دیواروں، برجوں اور عمارتوں کو منہدم کریں یا دشمن کے علاقے کو جہاں وہ جنگ کر رہا ہے، جلائیں۔ انہیں زہر سے بجھے ہوئے تیر یا آتشیں تیر استعمال کرنے کی بھی اجازت تھی۔

امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ مستحکم مقامات اور قلعوں پر حملہ کرنا چاہیے۔ گھروں پر نہیں لیکن اگر فاصلہ کم ہو تو بہرحال تیراندازی یا سنگ باری ختم نہیں کی جا سکتی اگرچہ اس میں مسلمانوں

کی موت بھی واقع ہو جائے۔

دبابہ اور منجنیق کے استعمال کے دوران چونکہ بعض حالات میں خود مسلمانوں کے اتلاف کا بھی خطرہ رہتا تھا۔ اس لیے عباسی عہد میں امام غزالی نے دشمن پر حملہ کے دوران خود مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں باامر مجبوری مسلمانوں کا موت کے گھاٹ اتر جانا اعلائے کلمۃ اللہ اور مفاد عامہ کی بنا پر جائز قرار دیا۔

اوائل اسلام میں چونکہ جو لوگ سامان رسد، مجاہدین کے گھوڑوں کی دیکھ بھال اور اسلحہ سازی کا کام کرتے تھے، انہیں بھی باقاعدہ مجاہدین میں شمار کیا جاتا تھا۔ رسالہ فی الحرب مسودہ قاھرہ فقہ حنفی مبر ۱۰۸۰ اباب ۲۷ میں ہے کہ مہلک گیس دشمن کو خوفزدہ کرنے اور قلعے فتح کرنے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ برھان الدین مرغینانی نے کیمیائی دھوئیں سے حملہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم انہیں اندھا دھند استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ ولیاخذوا حذرھم اسلحتھم اور وہ اپنا بچاؤ اور ہتھیار لے کر رکھیں۔"

دبابہ لکڑی اور خشک مضبوط چمڑے سے بنایا جاتا تھا۔ جرجی زیدان نے اس بارے میں لکھا ہے کہ یہ موٹی موٹی اور ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی لکڑیوں سے بنایا جاتا تھا۔ اور آتش زدگی سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اوپر سے موم جامہ یا سرکے میں تر کیے ہوئے چمڑے سے منڈھ دیا جاتا تھا اور پہیوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ بسا اوقات اس کو شکل لکڑی کے برج کا بنا کر اس کے نیچے پہیے لگا دیے جاتے تھے تاکہ سپاہی برج پر چڑھ کر قلعہ کی فصیل پر کود پڑیں۔ یہ آلہ قلعوں کی دیواروں کو گرانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک قسم کبش کہلاتی تھی جس کا اگلا سرا مینڈھے کے سر کی شکل کا ہوتا تھا۔ اس کے مضبوط سینگ قلعے کی دیواروں میں پے در پے ضربیں لگاتے اور آہستہ آہستہ گرا لیتے۔

بازنطینی اثرات کے تحت مسلمانوں کی سپاہیانہ وضع بھی رومیوں اور یونانیوں کے سپاہیوں جیسی ہو چکی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بیت المقدس کے دروازے پر آئے تو مسلمان مجاہدین کی یہی وضع قطع دیکھ کر انہیں تعجب ہوا تھا اور غصہ بھی آیا تھا۔ لیکن پھر اپنے محاذ کے سپہ سالار سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دلائل سن کر اور محاذ کی جنگی کیفیت اور علاقائی آب و ہوا کا مزاج دیکھ کر فوج کے اس انداز پر مطمئن ہو گئے تھے۔ اب مسلمانوں اور رومیوں کے ہتھیار بھی بہت ملتے جلتے تھے۔ مسلمان اور رومی سپاہی اب اس حد تک اپنے لباس اور ہتھیاروں کے انتخاب میں ایک جیسے ہو گئے تھے کہ ان میں بسا اوقات تمیز مشکل ہو جاتی تھی۔ آنے والے زمانوں میں یہ مماثلت اور بڑھ گئی۔

ایرانی، رومی اور یونانی اقوام کے ساتھ طویل جنگی تجربے کے باعث مسلمان حربی ماہرین نے اپنے اسلحہ جنگ میں بڑی تیزی سے ترقی کی۔ تب عرب میکانکی ٹیکنالوجی مشینوں میں دو بڑی قسمیں تیار ہوتی تھیں۔ ایک عوامی فائدے اور استعمال کی مشین مثلاً پن چکیاں اور جنگی ہتھیار وغیرہ اور دوسرے ایسے آلات جن سے درباری حلقوں میں جمالیاتی اضافے کیے جا سکیں۔ الجزری نے جو ایک عرب سائنس دان تھا، بہت سی فنی مشینیں اور حربی آلات و ہتھیار ایجاد کیے اور میکانکی طریق کار میں بھی بہت سے مفید اضافے کیے۔ یونانیوں نے بطور جنگی حربے کے آگ سے بہت کام لیا تھا، انہوں نے عربوں کے محاصرہ قسطنطنیہ کے وقت ان آلات حرب سے نہایت کامیابی سے کام لیا۔ جن کے استعمال سے آگ پھیل کر تباہی کا باعث بنتی تھی اور بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوتا تھا۔

قسطنطین نے ایسے آلات بنانے کی حفاظت ایک ملکی راز کی طرح کی تھی مگر عربوں نے بہت جلد اس سائنسی راز کو پالیا اور پہلی صدی ہجری میں ہی آگ کو بطور جنگی اسلحہ استعمال کرنے لگے۔ تاہم انہوں نے صلیبی جنگوں کے دوران وسیع پیمانے پر نار یونانیہ کو بطور ایک خوفناک جنگی ہتھیار کے استعمال کیا۔ جب ایک بار انہیں اس آگ کی قوت و تباہی کا پتہ چل گیا تو انہوں نے اسے میدان جنگ میں مختلف انداز اور آلات میں استعمال کیا۔ یونانی اور رومی آلات حرب آگ کو استعمال کرتے ہوئے زیادہ دور تک قوت نفوذ نہیں رکھتے تھے مگر مسلمانوں نے مصر، شام اور بیت المقدس کے محاذوں پر نار یونانیہ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اسے گندھک، ہڑتال، گوند، اور چربی سے مرکب کر کے کچھ اس طرح استعمال کیا کہ بعض حالتوں میں اسے پانی اور ریت سے بھی بجھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس مرکب کا گولہ جب پھینکا جاتا تو وہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹتا اور آگ ہدف کے ارد گرد دور تک پھیل جاتی اور ہر چیز کو راکھ بنا دیتی۔ تیر اندازوں کی ہر جماعت کے لیے آگ لگانے والوں کی ایک علیحدہ جماعت ہوتی جس کے پاس تیل ہوتا تھا۔ یہ پٹرول بردار آتش باز ایسے لباس پہنتے جو آگ نہیں پکڑ سکتے تھے۔ آگ کو مسلمان حربی سائنس دانوں نے مہلک گیس کی شکل دے دی تھی۔ انہوں نے کئی بدبودار کیمیائی مرکبات بھی دریافت کر لیے تھے۔ یہ سب کچھ دشمن کو ہراساں کرنے کے لیے اور قلعوں کو فتح کرتے وقت کچھ اس طرح استعمال کیا جاتا کہ دشمن پسپا ہونے میں ہی عافیت سمجھتا۔ عرب سائنس دانوں نے اس خاص تیل کو جو فوراً آگ پکڑ لیتا تھا، نفط لکھا ہے جو آتش گیر اور آتش خیز کالے رنگ کا سیال مادہ تھا۔ اسے بعض اوقات تانبے کی ایک نلی میں ڈال دیا جاتا اور پھر دھچکے کے ساتھ ہدف پر گرایا جاتا۔ آگ کی ایک موٹی لکیر کوندتی بجلی کی طرح گرجتی گونجتی ہوئی نکلتی۔ یہ شعلہ جب دشمن کی طرف جاتا تو یوں لگتا جیسے

آتشیں سانپ بل کھاتا ہوا ہوا کے دوش پر فراٹے بھرتا ہوا اڑا جا رہا ہے۔ اس کے گرتے ہی ہر طرف آگ بھڑک اٹھتی۔ اس آلے کو نفاطہ کہتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے واقعات محفوظ کرنے والے یورپی راویوں نے لکھا ہے کہ ایسی آگ کے مہیب شعلے ایک مرتبہ عربوں کے سامنے عیسائی لشکر پر چھا گئے۔ یہ آگ بادشاہ کے گھوڑے تک جا پہنچی۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے شہاب ثاقب گر رہے ہوں۔

تیرھویں صدی میں فرانسیسی صلیبی جنگوں میں صلیبی سپاہیوں پر مصری مجاہدین نے منجنیقوں میں آگ کے پان پھینکے تو عیسائی فوج خوف زدگی کے عالم میں گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ گرج کی آواز کے ساتھ لمبے نیزے کی طرح خط مستقیم میں ایک آگ نکلتی تو عیسائی بادشاہ اپنے بستر سے نکل کر رونے لگتا اور دعا کے لیے جھک جاتا۔ صلیبی جنگوں کے دوران عربوں نے ایک آتشیں گز ایجاد کیا جس کے سرے پر شیشے کا ایک گولہ ہوتا اور ساتھ فلیتہ بھی لگا ہوتا جسے آگ لگا کر راکٹ کی طرح دشمن پر پھینک دیا جاتا اور اس کی تباہی دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ایک محاصرے میں قلعے پر صلیبیوں کے چوبی میناروں کو عرب مسلمان مجاہدین نے کسی مائع سے پچکاریوں سے تر کر دیا، دشمن سپاہیوں کے لباس بھی اس سے بھیگ گئے۔ صلیبیوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے کہ اس بھونڈے حربے سے ان کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ پھر مسلمان کی طرف سے کوئی ایسی چیز پھینکی گئی جس سے ساری بھیگی ہوئی چیزوں کو آگ لگ گئی۔ قہقہے لگانے والے صلیبیوں کو بھاگنے کا موقع تک نہ مل سکا۔ صلیبی جنگوں کے ایک معرکے میں مسلمانوں کی طرف سے گرجنے والی کلوں سے حملہ کیا گیا۔ ان کلوں سے بے شمار دھاریاں نکلتیں جن سے پتھروں اور آگ کی بارش شروع ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں نے صلیبی جنگوں میں روغن نفط استعمال کیا۔ نفط کے بارے میں قزوینی نے آثار البلاء میں لکھا ہے کہ یہ آتش خیز سیال مادہ یارال جزیرہ یعنی عراق سے حاصل کیا جاتا تھا جہاں اس مادے کے کم از کم تین کنویں تھے جو ایک پہاڑ کے قریب واقع تھے۔ یہ مادہ ان کنوؤں میں موسم بہار کے آغاز کے ساتھ جمع ہونے لگتا۔ اور موسم گزرتے ہی کنویں بھی خشک ہو جاتے۔ سیڑھیوں کے ذریعے ایک خاص قسم کے حفاظتی لباس پہن کر لوگ دم سادھ کر اس میں اترتے اور بڑے بڑے لگنوں میں یہ سیال بھر کر اوپر پہنچایا جاتا۔ اندر سانس لینے میں دشواری پیش آتی تھی۔ اس سیال کی جھاگ بوتلوں میں جمع کر لی جاتی تو یہ روغن نفط کہلاتا تھا جو دور سے ہی آگ پکڑ لیتا تھا۔

یروشلم پر صلیبیوں کے نوے سالہ قبضہ کے بعد جب سلطان صلاح الدین ایوبی کو ایک دفعہ پھر اس مقدس شہر کو پنجہ طاغوت سے واپس لینے کی توفیق ملی تو صلیبی جنگوں کے یورپی مؤرخوں نے مسلمان سپاہیوں کی جرأت اور سپہ گری کے لیے اپنی یادداشتوں میں خراج تحسین پیش

کیا ہے۔ اسلامی فنون کی داستان ترتیب دیتے ہوئے ایک جدید یورپی مؤرخ کرسٹین پرائیس انہی حوالوں کی بنیاد پر لکھتا ہے کہ ''اہل مشرق جنگ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ غیور سپاہی اپنے تیز رو گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور فولادی تاروں کی ننھی ننھی کڑیوں سے بنی ہوئی زرہیں جو قمیضوں کی طرح ہوتی تھیں، پہنتے تھے۔ ان کی تلواروں میں دمشقی پھلوں کی تیز ترین دھاریں ہوتی تھیں اور ہر شخص کی ڈھال پر ایک نشان منقش ہوتا تھا جس سے وہ پہچانا جاتا تھا۔ صلیبیوں نے اسی خیال کی نقل اتار کر نقابت کے فن کو نشوونما دی تھی۔ جب صلیبیوں نے شام اور فلسطین میں قلعے بنانا شروع کیے تو انہوں نے فوجی تعمیرات کے متعلق بھی نئے خیالات اہل مشرق اور عربوں سے اخذ کیے۔''

ساتویں صدی ہجری میں حسن الرماح نے اپنی کتابوں میں بارود بنانے کے نسخے اور راکٹ سازی کی ترکیبیں بتائی ہیں اور اس زمانے میں راکٹ کو چینی تیر کہا جاتا تھا۔ حسن نے ایک ایسے تارپیڈو کی تیاری کا طریقہ بھی تجویز کیا تھا جس میں سے ایک سفید انڈہ نکلتا اور آگ لگا دیتا تھا۔ اسے ثلج الصین یا چینی برف کہا جاتا تھا۔ بوتل بم قواریر النفط کہلاتا تھا۔ عربوں نے اگر بارود ایجاد نہیں کیا تو کم از کم اس کا وسیع جنگی استعمال ضرور کیا ہے۔ جس سے آگے چل کر توپ اور بندوق کا استعمال عام ہوا۔ توپ کا استعمال مسلمانوں نے پہلی بار پہلی صدی ہجری کے آخر میں چینی ترکستان کے محاذ پر کیا۔ آگے چل کر یورپ نے توپ کی ساخت اور اسے چلانا مسلمانوں سے سیکھا۔ اور اس میں مفید تبدیلیاں کیں۔ جس سے اس بوجھل ہتھیار کی نقل و حرکت آسان ہوگئی۔ مملوک سلطانوں نے ان مشینوں اور ہتھیاروں کی ڈھلائی کے کارخانے قائم کیے۔ اسی طرح مملوک اور ترک سلطانوں کے زمانے میں یورپی آلات حرب مسلمانوں کاریگروں کے سامنے آئے تو ان کی نقل میں مختلف قسم کی بندوقیں تیار کی جانے لگیں۔ انہیں مکحلہ اور مدفع کہا جاتا تھا۔ اور مکاحل البارودوہ بھک سے اڑ جانے والا مرکب تھا جو ان آلات حرب میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مراکش میں بھی سرکاری سرپرستی میں توپ ڈھالنے کے سامان کیے گئے اور پہلی دفعہ کانسی کی دھات سے توپیں ڈھالیں گئیں۔

ایران میں شاہ عباس صفوی کے عہد سے بہت پہلے توپ خانہ کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ ایک عثمانی ترک شہزادہ طہماسپ کے ہاں پناہ گزیں ہوا تو اپنے ساتھ تیس توپیں بھی لے کر آیا۔ طہماسپ کے پاس ازبکوں کے ساتھ مقابلہ کے وقت ضرب زن نام کی بہت ہلکی توپیں تھیں۔ صفوی عہد میں توپ فرنگی اور اور بادلیج بھی استعمال ہوئی۔ ایران میں توپ چلانے والوں کو توپچیان اور بندوق برادر سپاہیوں کو تفنگچیاں کہا جاتا تھا۔ مشہور ایرانی مصور بہزاد جو طہماسپ کے

عہد کے آغاز میں فوت ہوا، اپنے جنگ کے موضوع پر تیار کردہ فن پاروں کے لیے بہت مشہور ہے۔ تیمور کے کارناموں پر مشتمل ایک کتاب میں اس نے خوبصورت جنگی تصویریں بنائی جن میں اس نے زرہ بکتر اور اسلحہ کی نقاشی باریک بینی کے اعتبار سے بہت صحیح کی ہے۔ ایک عالم سپاہی رشید الدین نے عربی میں ۱۳۰۷ء میں جو تاریخ عالم لکھی، اس میں قلمی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ایک تصویر میں رنگوں سے سپاہیوں کے زرہ بکتروں، خودوں اور اسلحہ کی جملہ تفصیلات واضح کر دی ہیں اور لمبے نیزوں اور جھنڈوں سے ولولہ انگیز جنگی نقشہ پیش کیا ہے۔

عثمانی ترکوں کی افواج کے ساتھ ایک رسالہ توپیں اور بندوقیں ڈھالنے کا کام بھی کرتا تھا۔ سلطان مراد کے زمانے میں توڑے دار بندوق کا رواج فوجوں میں عام ہو گیا۔ ترک فوج کے اسلحہ کے محافظ جبلو یا صلاح دار کہلاتے تھے۔ ان کے پاس ینی چری فوج کے ہتھیار یعنی تیر، تلواریں، تفنگ باروت (بارود) فلیتے اور گولیاں بنانے کیلئے سیسہ موجود رہتا تھا۔ ینی چری سپاہی توڑے دار بندوق استعمال کرتے تھے۔ ان کی نالیاں مسیحی سپاہیوں کی بندوقوں کی نالیوں سے لمبی ہوتی تھیں۔ شروع میں عثمانی ترک میدان جنگ میں دھات کا ذخیرہ ساتھ لے جاتے تھے اور ضرورت کے مطابق دوران جنگ ہتھیار اور گولے ڈھالتے رہتے تھے۔ پھر استنبول میں کانسی کی توپیں ڈھالنے کیلئے توپ خانہ بنایا گیا۔ ان توپوں کو لاد کر لے جایا جاتا تھا اور انہیں خچر یا بیل کھینچتے تھے۔ لوہے اور کانسی کی ترکی توپوں کو کلورین یا بیسی لسک یا سیکر کہا جاتا تھا۔ ان میں سنگ مرمر کانسی اور تانبے کے گولے رکھ کر داغے جاتے تھے۔ ترکوں کے بحری جہازوں پر جو توپیں نصب ہوتی تھیں، انہیں قلن برنہ، ضرب زن اور شانقہ (صانقہ) کہا جاتا تھا۔ ترک فوجی ایسی مارٹر توپیں بھی استعمال کرتے تھے جن سے شیشہ، پتھر اور دھات کے گولے داغے جاتے تھے۔

سلطان محمد دوم ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہوا تو فوراً ہی اس نے فتح قسطنطنیہ کی تیاری شروع کر دی، اس نے آبنائے باسفورس کے ایشیائی اور یورپی دونوں کناروں کو حصاروں کی تعمیر سے قابو میں کیا۔ پھر مرکز سلطنت اڈریا نوپل (اورنہ) میں ایک محل کی بنیاد رکھی جس کا نام جہاں نما تھا۔ یہیں اس نے جنگی آلات کی تیاری میں ذاتی دلچسپی لی اور ایک منفرد قسم کا توپ خانہ تیار کیا۔ سلطان نے لاطینی اقوام کے طریق جنگ، آلات اور ان کی تکنیک پر گہری نظر رکھی۔ اسے ایک ماہر توپ ساز مل گیا۔ جسے گبن نے ڈنمارک یا ہمنگری کا باشندہ ظاہر کیا ہے۔ اس کا نام اربن تھا، وہ یونانیوں کے ہاں بھی رہا مگر وہاں اس کی قدر نہ ہوئی، اس نے سلطان سے وعدہ کیا کہ وہ ایسی توپ ڈھال سکتا ہے جس کے گولے قسطنطنیہ کی فصیل توڑ سکیں گے۔ چنانچہ اسے ضروری سامان فراہم کر دیا گیا، اربن نے ایسی توپ ڈھالی جو چھ سو پونڈ کا گولہ ایک میل کے فاصلے پر پھینک سکتی تھی۔ توپ مکمل

ہونے پر اسے آزمایا گیا۔ تو ہر جانب اس کی ۱۲ میل تک آواز سنی گئی۔ گولا جہاں گرا وہاں چھ فٹ کا گڑھا پڑ گیا۔ اس وزنی توپ کو کوئی سو آدمی کھینچتے تھے۔ اس دور کی مٹی کے گولے سینٹ ایا صوفیہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ یہ لوہے کی مانند ٹھوس اور مضبوط تھے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں ۱۷ ویں صدی میں خنجروں کے نیام اور قبضے پر مینا کاری کی جاتی اور پھول اور نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ لمبے دستوں کے جنگی تیر بھی تیار ہوتے تھے۔ نیاموں اور قبضوں پر طلائی کام بھی ہوتا تھا۔ البتہ جڑاؤ کا کام نہیں ہوتا تھا۔ گرز بھی بنائے جاتے تھے۔ دوہرے پھل کے تیر سرداری کا نشان تھے۔ ہر طرح کی زرہیں، بکتر، جھلم اور خود بنائے جاتے تھے۔ عثمانی دور کا خود نوک دار، مضلع اور محرابی ہوتا تھا جو ترکی کی جنگ کے بعد ہنگری اور پولینڈ کی جنگ میں بھی رائج ہوا۔ یورپ میں اسے ششک کہا گیا۔ ڈھالیں گول ہوتیں اور ان پر دائروں کی شکل میں بید کا کام بنایا جاتا تھا، مرکزی حصہ بید اور ابھرواں ہوتا تھا۔

ترکوں اور افغانوں نے امویوں اور عباسیوں سے اسلحہ سازی کا فن سیکھا تھا۔ محمد بن قاسم سے بابر تک سب کے فوجیوں کے ساتھ منجنیق تھے۔ عرادے، دبابے، نفط کے گولے اور آتشیں تیر تھے، بابر کے پاس توپ خانہ اور بندوق بردار سپاہی بھی تھے، غزنوی کے عہد میں ہندوستان میں ہاتھیوں پر سپاہی تیر کمان اور دوسرا اسلحہ لے کر بیٹھتے تھے۔ ہاتھیوں کو زرہ بکتر پہنایا جاتا اور سونڈوں اور بڑے دانتوں کے ساتھ آریاں اور درانتیاں باندھ دی جاتی تھیں۔ برصغیر میں ابتدائی قسم کی توپ علاؤالدین خلجی کے دور میں بنی۔ آتش ریز تیر، نفط کے گولے اور بھالے پہلے سے مستعمل تھے۔ یہاں سلاطین نے آتشیں اسلحہ کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ اسی لیے ابراہیم لودھی بابر کے توپ خانے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ منجنیق اور عرادے موجود تھے۔ چرخ اور فلاخن سے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ گرگج اور ساباط مسقّف راستے تھے۔ جو سپاہیوں کو حفاظت سے قلعہ کی دیواروں تک پہنچاتے تھے۔ پھر توپ کی طرح دیواروں میں شگاف ڈالتے۔ علاؤالدین خلجی کی توپ اس قدر وزنی اور بڑی تھی کہ اسے سو کے قریب بیل کھینچتے تھے۔ اس کے چلنے سے زمین ہلتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہی وہ توپ تھی جس کا ذکر امیر خسرو نے بھی کیا ہے اور اس کا نام سنگ مغربی لکھا ہے۔ یہ قلعوں پر سنگ باری کرتی تھی۔ اس کے ذریعے پتھر کے ٹکڑے بارود کی قوت کے ساتھ پھینکے جاتے تھے۔ مکمل توپ خانہ برصغیر میں پہلی دفعہ پانی پت کے میدان میں ظہیر الدین بابر نے لودھیوں کے خلاف استعمال کیا۔ بابر کی توپیں لوہے اور کانسی کی بنی ہوئی تھیں۔ بعض تانبے کی بھی تھیں۔ بابر کے توپ خانے کا افسر اعلیٰ ایک رومی ترک تھا۔ ان میں سے بعض توپوں کی مار ایک میل تک تھی۔ بابر نے ان توپوں کے نام ضرب زن، فرنگی اور دریغ لکھے ہیں۔

اکبر کے توپ خانے کا افسر میر آتش یا داروغہ توپ خانہ کہلاتا تھا۔ مغلوں کے محلات میں کارخانے تیر و تلوار، تیغ و سناں، ورزہ بکتر تیار کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں ایران سے ہندوستان پہنچنے والی ایک ہمہ گیر شخصیت میر فتح اللہ شیرازی کی تھی۔ جو علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ میں بھی طاق تھے اور طباع ذہن رکھتے تھے۔ انہیں میکانیات میں بہت دسترس حاصل تھی۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جو تمام تر لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ بلند تھی اور آٹھ پایوں پر ایستادہ تھی۔ اس مشین سے بندوقیں بڑی تیزی سے صاف کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کا نام یرغو تھا۔ یہ صرف ایک بیل کی طاقت سے بڑی آسانی سے چلائی جا سکتی تھی۔ بیل چلتا تو ایک پہیہ گھومتا جو آگے ایک ایکسل کو حرکت دیتا۔ جس سے ایک دندانے دار پہیہ گھومتا اور گراریاں چلتی تھیں۔ گراریوں سے برش لگی ہوئی سلاخیں گھومتیں۔ یہ برش ۱۶ بندوقوں کو بیک وقت آسانی اور تیزی سے صاف کرتے جاتے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ایک چوڑی دار توپ بنائی۔ جس کی نال کے پانچ حصے تھے، وہ چوڑیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑ دیئے جاتے تھے۔ بعد میں انہیں کھول کر بیل گاڑیوں پر جہاں ضروری ہوتا، لے جایا جاتا۔ اس توپ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ پہاڑی علاقوں کی جنگ میں بڑی کارآمد اور مفید ثابت ہوتی کیونکہ اسے کھول کر پہاڑوں کی چوٹیوں تک لے جانا اور جوڑنا بہت آسان تھا۔ اکبر نے اپنے عہد میں اس قسم کی توپ کی ڈھلائی میں بے حد ذاتی دلچسپی لی۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ایک سترہ نالی والی توپ بھی ڈھالی جسے ایک ہی فیتہ کو آگ لگا کر چلایا جاتا تھا۔ یہ توپ ایک مورچے پر بیک وقت سترہ گولے پھینک کر تباہی مچا دیتی تھی۔ اکبر نے اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر اس کا نام گنج نال رکھا تھا۔ گنج نال اور ہتھنال نامی توپیں ہاتھیوں کے ہودوں سے چلائی جاتی تھیں۔ اسی طرح شتر نال اور شاہین غالباً اونٹ پر بیٹھ کر چلائی جاتی تھیں۔ طبقات اکبری میں ملا نظام الدین نے میر فتح اللہ شیرازی کی ایک ایجاد چرخی دار بندوق کا ذکر کیا ہے جو چرخی میں نصب ہوتی تھی اور جسے گھمانے سے بارہ گولیاں بارہ نالیوں سے اپنے ہدف کا رخ کرتی تھیں۔ اکبر کے زمانے کی توپوں میں ۳۰ سیر سے بارہ من وزن کے گولے استعمال ہوئے۔

جہانگیر کی ایک توپ ظفر بخش کہلاتی تھی۔ جس کا وزن ڈیڑھ ہزار من کے قریب تھا۔
شاہ جہان کے زمانے میں دارا شکوہ نے لاہور میں ایک من پانچ سیر وزن کے گولے پھینکنے والی دو بڑی توپیں ڈھلوائیں جن کا نام فتح مبارک اور کشور کشا رکھا۔ معرکہ سادھو گڑھ میں اس نے قلعہ کشا اور مریم نامی توپیں استعمال کیں۔

شاہ جہاں کی ایک توپ جہاں کشا کہلاتی تھی جو ڈھاکہ میں ڈھالی گئی تھی۔ اورنگزیب

عالمگیر نے اسلحہ سازی کے لیے پرتگیزی ولندیزی، ترک اور عرب ماہرین کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ محمد حسین عربی اس عہد کا ایک خصوصی تکنیکی مشیر تھا۔ ضیاء الدین برنی نے ایک چھوٹی میرانی توپ کا ذکر کیا ہے جو بندوق سے دگنی جسامت کی تھی۔ اس کا نام زنبورک تھا۔ اس سے تین پونڈ تک وزنی گولا پھینکا جا سکتا تھا۔ مغل امراء چار خانوں والے ریوالور یا طمنچے استعمال کرتے تھے۔ برنیئر لکھتا ہے کہ ایک جنگ میں عالمگیر کے پاس ستر ۷۰ بڑی توپیں تھیں ان میں سے بعض اتنی بوجھل تھیں کہ انہیں اکیس جوڑی بیل کھینچتے تھے۔ عالمگیر کی ایک توپ ۱۸ فٹ لمبی تھی اور اس کا نام قلعہ شکن تھا۔ تقریباً تمام مغل بادشاہوں نے اپنے اپنے عہد میں اپنی اپنی پسند کی توپیں بنوائیں اور ان کے نام بھی رکھے۔ گجرات کے سلاطین کو توپ سازی سے بے حد دلچسپی تھی۔ سلطان ٹیپو نے کثرت سے توپیں اور گولے ڈھلوائے۔ سرنگا پٹم میں ڈھالی ہوئی توپیں اپنی ساخت میں یورپی توپوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ ایک انگریز کپتان نے میسور پر قبضہ کے بعد اپنی یادداشت میں لکھا کہ جب ہماری فوج بنگلور میں داخل ہوئی تو ہمیں ایک عجیب وغریب مشین قلعہ سے ملی جو پانی کے ذریعے چلتی تھی۔ اس سے توپوں میں سوراخ ڈالنے کا کام لیا جاتا تھا اور یہ سوراخ بالکل سیدھے اور درست ہوتے تھے۔ احمد شاہ درانی کے وزیر شاہ ولی نے مرکب دھاتوں سے توپیں ڈھلوائیں، لاہور کی مشہور توپ زمزمہ انہی میں سے ایک ہے۔ یہ توپیں مرہٹوں کے خلاف پانی پت کی جنگ میں بے حد کامیاب ہوئیں۔

ایران میں تیموری دور میں لوہے کا اعلیٰ درجے کا اسلحہ تیار ہونے لگا تھا۔ پھول دار خود بنائے گئے جن میں آنکھوں کے دو سوراخ رکھے جاتے۔ ان پر کتبے اور پھول بھی کندہ کئے جاتے۔ یہ کام چاندی کی تار کا ہوتا۔ اس مغلیہ خود سے ایرانی فولادی کلاہ اور ترکی خود بنائے گئے۔ تیموری اور مغل تلواریں چوڑے پھل کی ہوتی تھیں۔ ماسکو کے اسلحہ خانے میں اس دور کے ایسے خود موجود ہیں جو پورے چہرے اور سر کو ڈھانپ لیتے، دھاریں اور تیر جو ترک اور ایرانی جنگوں میں استعمال کرتے تھے، بہت پہلے سے بنائے جا رہے تھے۔ ایران کے صفوی عہد میں مغلیہ دور کے مقابلے میں اسلحہ سازی میں زیادہ جدت پیدا کی ہوتی گئی۔ سیدھی سادی مغلیہ تیغوں کی جگہ شاہ عباس کے زمانہ کی ساختہ خم دار عباسی تلواریں مروج ہوئیں۔ ان کے پھلوں کی وجہ سے اصفہانی صناعوں کا نام دور دور تک پھیل گیا۔ یہ پھل بے حد جوہر دار تھے۔ ان پر سونے کی بھرت اور خطاطی کے علاوہ خوبصورت تصاویر بھی کندہ ہوتی تھی۔ قبضوں کی طلاء کاری کے ساتھ ساتھ میان اور پرتلوں پر گلکاری ہوتی۔ خم دار خنجر عام تھے۔ ۱۵۰۰ء میں ہرات میں جو خنجر بنتے تھے، وہ صدیوں تک ویسے ہی بنتے رہے۔ اس زمانے میں جنگی تبر کی بھی ایک خاص شکل ہوتی تھی۔ اس کا پھل چوڑا اور نوکیلا ہوتا

تھا۔ ایرانی خود خوبصورت بنائے گئے۔ ان پر سونے اور چاندی کا کام ہونے لگا۔ آرائش سے بے انتہا صرف اور نفیس ہوتیں۔ ان کی شکل مغلیہ خود سے مختلف تھی یہ سر پیچ کے بجائے سر پر ٹوپی کی طرح رکھے جاتے تھے۔ چھوٹے اور سبک تھے۔ ڈھالیں عموماً گول ہوتیں۔ ان پر ابھرے ہوئے نشان بنائے جاتے۔ ۱۷۰۰ء میں اسلحہ زرہ بکتر اور خود ہر چیز پر طلائی اور نقرئی بھرت ہوتے۔ صفوی عہد میں تانبے اور ٹین کو ملا کر چاندی کی کیفیت پیدا کر لی جاتی تھی۔ اسلحہ سازوں نے اس عہد میں اچھے ہتھیار بنائے، لوہے اور فولاد کو اسلحہ جنگ اور زرہ بکتر کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا تھا۔ سطح پر کندہ کاری کرتے ہوئے سونے کے ٹکڑوں پر بیل بوٹے بنا کر عبارتیں درج کر کے اسلحہ پر جڑ دیتے تھے۔ دھات پر تیزاب سے بھی نقوش بنائے جاتے تھے۔

بڑے جنگی ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں کو بحری جنگوں سے سابقہ پڑا تو ضرورت کے مطابق یہاں بھی مسلمان حربی ماہرین نے اپنی صلاحیتوں کا پورا پورا اظہار کیا۔ جہازوں میں سمندری راستے کی پہچان کے لیے قطب نما کا استعمال سب سے پہلے عربوں نے کیا۔ سمندر اس وقت تک مسلمانوں کے لیے خطرہ بنا رہا جب تک کہ انہوں نے سلطنت کو بیرونی حملے سے بچانے کے لیے اپنا بحری بیڑا تیار نہیں کر لیا۔ چنانچہ پہلی دفعہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تدبر نے مسلمانوں کو بحری قوت سے آگاہ کیا۔ کیونکہ بحیرہ روم میں بازنطینیوں سے مسلمانوں کا علاقہ محفوظ نہ تھا۔ اس سمندر میں قبرص اور سسلی کے جزائر تو اوائل اسلام ہی میں فتح ہو گئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فتح قبرص سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ وہ جنگ کو سمندر تک پھیلانا نہیں چاہتے تھے اور ایک طویل محاذ جنگ کی نگرانی عملاً مشکل بھی تھی۔ لیکن سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور مبارک میں جب بازنطینی حملوں کا خطرہ پیدا ہو گیا تو صحرا نشین سمندروں کی وسعتوں میں بڑی کامیابی سے پھیل گئے۔ ان کے بحری بیڑے سے رومی بیڑے نے بار بار شکست کھائی۔ اموی عہد کی بحریہ کی تشکیل میں سب سے زیادہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شوق کو دخل تھا۔ وہ ہر صورت میں قسطنطنیہ کو فتح کرنا چاہتے تھے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس شہر کے فاتحین کو جنت کی بشارت دی تھی، عباسیوں نے بحریہ کو مزید شان و شوکت بخشی۔ مسلمانوں کے تجارتی اور جنگی جہاز امویوں کے عہد میں ہندوستان کا چکر کاٹ کر بہت دور تک آگے نکل گئے تھے۔ بحیرہ روم کے ساحلوں اور ساحل کارومنڈل تک ان کا آنا جانا عام تھا۔ عباسی عہد میں انہوں نے کامیابی کے ساتھ یورپ کی ساحلی بندرگاہوں پر حملے کیے۔ مصر کے فاطمی حکمرانوں کو بحریہ سے خاص دلچسپی تھی، بعض خلفاء دریائے نیل کے کنارے بیٹھ کر بحریہ کی فرضی جنگی مشقوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کو

اپنی بحری قوت بڑھانے کی خاص لگن تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے بغیر صلیبیوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر صلاح الدین ایوبی رحمتہ اللہ علیہ تک بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر اسلامی مقبوضات میں جہاز سازی کے بے شمار کارخانے کام کرتے تھے۔ انہیں دارالصناعہ کہا جاتا تھا۔ سلیمان اعظم کے امیر البحر خیر الدین بابروسہ اورے کی بحری حربی تکنیک سے بحیرہ روم کی عیسائی حکومتیں خوف زدہ رہتی تھیں۔ سلیمان کے جہازوں کا بحیرہ روم پر مکمل تسلط تھا۔ عبدالرحمٰن الناصر کے بحری بیڑے کا مقابلہ اس کے ہم عصر کسی بھی یورپی حکمران کا بیڑہ نہیں کرسکتا تھا۔ اندلس کے مسلمان کاریگروں نے زمینی جنگ میں استعمال ہونے والی معمولی توپیں بھی ایجاد کر لی تھیں۔ بحری جنگوں کے لیے ان کی بحری سرنگیں بنانے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ گجرات کے مسلمان حکمرانوں نے اپنے بحری جہازوں پر عظیم دور مار توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ ایسے منجنیق بردار جہازوں کو حراقہ کہا جاتا تھا۔ یہ جہاز ان توپوں کی مدد سے بڑی چابک دستی کے ساتھ دشمن کے جہازوں پر آتش گیر مادہ پھینکتے تھے۔ بحری جنگوں میں مسلمان مجاہدین کو اجازت تھی کہ دشمن کے جہازوں کو آگ لگا کر تباہ کر دیں یا انہیں ڈبو دیں۔ چنانچہ بحریہ کے مسلمان مجاہدین نے دشمن کے جہازوں پر بھاری پتھر پھینکنے کے طریقے دریافت کر لیے۔ آگ، سانپ، بچھو، پھینکنے کا بندوبست کیا اور ضرر رساں سفوف استعمال کر لیا۔ جہازوں کے اطراف میں بڑی بڑی پچکاریاں اور ہیبت ناک گھڑیال کی شکل کی پچکاریاں نصب کر کے ان سے دشمن کے جہازوں پر آگ برسائی جاتی۔ مسلمان تاجروں کو اجازت نہ تھی کہ وہ دارالحرب جاتے ہوئے اپنے ساتھ لوہا یا کوئی ایسی چیز لیجائیں جس سے دشمن فائدہ اٹھا سکے۔ البتہ وہ اپنے دفاع اور حفاظت کے لیے اپنے ساتھ اسلحہ وغیرہ لے جاسکتے تھے۔

جنگی حراقوں پر برج بنے ہوئے تھے جن کی آڑ میں سپاہی دشمن پر نفط کی بارش برساتے۔ جہازوں کے سامنے کے رخ پر لوہے کا ایک بڑا سا آلہ ہوتا جسے لجام کہا جاتا تھا جو اپنی ٹکر سے سامنے کے جہازوں اور کشتیوں کو پاش پاش کر دیتا تھا۔ اپنے جہازوں کی حفاظت کی خاطر مسلمان جہازوں کے باہر کی جانب چمڑہ یا نمدہ پھٹکڑی اور سرکہ میں بھگو کر لپیٹ دیتے تاکہ انہیں آگ نہ لگ سکے۔ ایک مسلمان ماہر میکانیات ابو الصلت نے سکندریہ میں ڈوبے ہوئے جہازوں کو پانی سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ تجربات سے اس نے جرثقیل کے ایسے آلات بنائے جن سے سمندر میں ڈوبے ہوئے بھاری اجسام کو باہر نکالنا آسان ہو گیا۔ ابوالحسن نامی ایک مسلمان سائنس دان نے دوربین، مقیاس الارتفاع، اور وقت بتانے والی ایک گھڑی جسے اصطرلاب کہتے تھے جنگی اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت ایجاد کی۔ علامہ عبدالقادر بدایوانی نے میر

فتح محمد شیرازی کے ایجاد کردہ ایک ایسے آلے کا ذکر کیا ہے جو خشکی پر وزنی چیزوں کو خاص طور پر بھاری توپوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ یا افواج کی نقل و حرکت کے موقع پر انہیں رتھوں پر رکھنے کی سہولت فراہم کرتی تھی۔

مسلمان اقوام کے ایجاد و اختراع کے فروغ اور تسلسل کو ایک متضاد لہر نے آگے چل کر قریباً قریباً روک دیا۔ جب مسلمان محض روایت پرست بن کر رہ گئے اور انہوں نے آس پاس کی سائنسی تبدیلیوں اور جدتوں سے اغماض برتنا شروع کر دیا۔ اس رویے کے باعث وہ تخلیقی، فکری، اعتقادی ہر لحاظ سے تنگ نظری کے حاصر میں گھر کر رہ گئے۔ تعصب، غلو، فرقہ پرستی اور بعض اوقات غیر روادارانہ رویے پر اصرار نے انہیں نئی ابھرنے والی سائنسی تجربیت پسند اقوام سے پیچھے رہنے پر مجبور کر دیا اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور فعالتیں تقریباً جامد ہو کر رہ گئیں۔ وسطی صدیوں میں بہت تیزی کے ساتھ اسلحہ جنگ کی ساخت، ایجاد اور اختراع کے سلسلے میں یورپ میں جو ترقی ہوتی رہی، مسلمان اقوام اپنے رویے میں سہولت پسندی اور تقدیر پرستی کے باعث پیچھے رہ گئے۔

اس معاملے میں یورپ کی تکنیک بہت آگے نکل گئی۔ تاہم اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض وحشی اور بعض یورپی اقوام نے جنگوں کو دوسری اقوام پر تھوپ کر جنگ کو جب ایک ہولناک رخ دیا اور یہ قصد کیا کہ مخالف اقوام کا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے تو اسلام بہر حال اس کی تائید نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام جنگ کو صرف حالات کی مجبوری میں قبول کرتا ہے اور جنگ کو اپنے مخالفین پر ہر حال میں تھوپنے کا قائل و فاعل نہیں۔ اسلام جہاں اپنی سلامتی کا قائل ہے، وہاں دوسروں کی سلامتی کا بھی ضامن ہے، جنگ ہی کیوں نہ ہو، اسلام خوفناک اور بے محابا تجربیت حربی کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اسلام قتل کرنے کی اجازت تو دیتا ہے مگر مثلہ کرنے کی نہیں۔ اسلام اختراعی اور طبع زاد رجحانات کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنتا۔

امن اور جنگ میں سے جب کسی ایک کا انتخاب ہو تو اسلام جس کا معنی ہی سلامتی ہے، امن کو ترجیح دیتا ہے۔ دراصل پائیدار امن عالم کی راہ میں کچھ بنیادی رکاوٹیں ہوتی ہیں جو سماجی تشدد کو جنم دیتی ہیں جس کی خاطر اسلحہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگی اسلحہ اپنی ذات میں کوئی سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہے۔ یہ بات تو بہر حال طے شدہ ہے کہ بے پناہ اسلحہ اور خاص طور پر ایٹمی اسلحہ انسان کی سلامتی کا ہرگز ضامن نہیں ہوتا۔

عالم اسلام اگر دنیا کی قیادت اور راہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لیے ممتاز قوت اور تربیت، صنعت و علوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا۔ وہ اس سطح

پر ہو کہ اپنے لیے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے۔ اپنے لیے ہتھیار تیار کر سکے اور اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو۔ اپنی زمین کے خزائن وہ خود برآمد کر سکے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں سے چلائے۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں اس کے بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں۔ وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں اور ہتھیاروں سے کرے۔ امن کے لیے ضروری ہے کہ جیسا کہ اسلام انسان کے لیے تجویز کرتا ہے کہ ہمارے قول و فعل میں مکمل یکسانیت اور ہم آہنگی ہو، اسلام ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں، صداقت رواداری، خلوص اور تعاون کے جذبات فراواں ہو۔ جہاں عالی ظرفی کا مظاہرہ اس لیے کیا جائے کہ ہمارے اور دوسرے کے حالات میں فرق موجود ہے۔ اگر انسان اشرف المخلوقات اور دولت عقل اور فہم و فراست سے متصف ہے تو پھر اسلحہ کے ذریعے سلامتی کی تلاش ایک عجیب سی بات لگتی ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ نیتوں کے فتور کے باعث امن ایک جنگ کا صلہ اور آئندہ کئی جنگوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

ماخذ و مصادر

۱۔ قرآن مجید۔ ۲۔ صحیح مسلم ۔ ۳۔ مسلمانوں کی صنعت و حرفت از جمیل الرحمٰن ۔ ۴۔ سیرت ابن ہشام ۔ ۵۔ سیرت النبی ﷺ از مولانا شبلی ۔ ۶۔ جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے از امیر شکیب ارسلان ۔ ۷۔ عہد نبوی ﷺ کے میدان جنگ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۔ ۸۔ تاریخ تمدن اسلام از جرجی زیدان، ۹۔ اسلام کے غازی یورپ میں از رئیس احمد جعفری۔ ۱۰۔ تمدن عرب۔ موسیو لیبان از سید علی بلگرامی۔ ۱۱۔ اخبار الاندلس از عنایت اللہ۔ ۱۲۔ امیر تیمور ہیر لیڈ لیم از عزیز احمد۔ ۱۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 3 پنجاب یونیورسٹی۔ ۱۴۔ اسلحہ جنگ و حدیث دفاع از میجر جنرل محمد خان۔ ۱۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام از ابو ظفر ندوی۔ ۱۶۔ گجرات کی تمدنی تاریخ از ابو ظفر ندوی۔ ۱۷۔ تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود بنگلوری۔ ۱۸۔ عربوں کی جہاز رانی از سید سلیمان ندوی۔ ۱۹۔ عرب اور اسلام از فلپ کے حتی۔ ۲۰۔ سرمایہ عمر از احمد اسلم۔ ۲۱۔ آثار البلاد از قزوینی۔ ۲۲۔ اسلام کا قانون جنگ و صلح از مجید خدوری/ غلام رسول مہر۔ ۲۳۔ تہذیب اسلامی از خطبات پکتھال۔ ۲۴۔ مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے از نور محمد/ رحمان مذنب۔ ۲۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندوی۔

مسلمان سائنسدانوں کی چند ایجادیں

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی

سائنس کی چند ایجادیں کیا، خود سائنس مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ مسلمانوں سے پہلے سائنس کہاں تھی اور کیوں ہوتی؟ سائنس تو تجربے کرنے سے وجود میں آتی ہے اور مسلمانوں سے پہلے تجربے کرنے کا کب رواج تھا۔ مسلمانوں سے پہلے علم پر یونانیوں کا اجارہ ضرور تھا مگر دریافتیں کرنے کے لیے وہ تجربے نہیں کرتے تھے بلکہ عقل کے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اس کو منطق یا فلسفہ کہا جاتا تھا سائنس نہیں۔ مثلاً ارسطو کی دریافت کہ بھاری گولا جلدی گرتا ہے اور ہلکا گولا دیر سے تجربے پر مبنی نہیں تھی بلکہ منطق پر مبنی تھی۔ گلیلیو نے جب تجربہ کیا تو یہ دریافت غلط نکلی۔

ارسطو اور اس جیسے یونانی حکما کے برخلاف مسلمان اپنی کوئی دریافت پیش کرنے سے پہلے اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اسی وجہ سے تجربے کرنا مسلمان حکما کی پہچان بن گیا تھا اور صدیوں تک ان کی پہچان بنا رہا۔ اسی وجہ سے کوئی اور تجربے کرتا تو دیکھنے والے شک کرتے کہ یہ بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ یورپ کے عیسائی طلبا نے مسلم اسپین کے مسلمانوں سائنس دانوں سے جب سائنس سیکھی اور گھر آ کر اسی شغل کو اختیار کیا تو ان کے اہل مذہب ان پر اسی قسم کا شک کرنے لگے تھے۔

تجرباتی طریقے کو اپنا کر مسلمانوں نے نت نئی ایجادات کے ڈھیر لگا دیئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان حکما کی کتابوں کا بیشتر ذخیرہ تلف ہو گیا اور جتنا کچھ بچ رہا ہے انہیں پڑھنے اور سمجھنے والے زیادہ نہیں رہے اس لیے ان کی ایجادات کی تفصیل سامنے نہیں آئی۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ایجادات کی تفصیلات مل جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے ساتھ اپنا شغف اپنے ابتدائی دور میں ہی شروع کر دیا تھا۔ اولین مسلمان سائنس داں کا نام خالد تھا۔ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمان پہلی صدی ہجری میں ہی سائنس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ انہوں نے کیمیا میں ایک

زبردست ایجاد بھی کی اور اس سے مسلمانوں کے بحری بیڑے کو دشمنوں کے خلاف زبردست تحفظ ملا۔ وہ ایجاد یہ تھی کہ انہوں نے آتش یونان (Greek Fire) کا توڑ دریافت کر لیا۔ آتش یونان ایک تیل تھا جس میں ایک کیمیائی مسالہ ملا ہوتا تھا جو آتش پذیر (Combustible) تھا۔ اس کی پچکاری مارتے ہی آگ بھڑک اٹھتی تھی، جو آس پاس کی چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی تھی سلطنت روم کے عیسائی اسے مسلمانوں کے بحری بیڑے کے خلاف استعمال کرتے۔ ان کے جہازوں پر اس کی پچکاری مارتے ہی جہازوں میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ مسلمان اس آفت سے بہت عاجز تھے۔ خالد نے اس تیل کے اہم اجزا معلوم کر لیے اور پھر خود اپنا آتش پذیر تیل ایجاد کر لیا۔ پھر کیا تھا۔ مسلمانوں کے بحری بیڑے انہیں رومیوں کے خلاف کام میں لانے لگے۔ اس کے بعد سے رومیوں کا یہ حال ہو گیا کہ وہ اپنے بحری جہازوں کو مسلمانوں سے چھپائے پھرتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو سائنس میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ تقریباً چھ سات صدیوں تک حاصل رہا۔ اس دوران کوئی دوسری قوم سائنس میں ان کی ہمسر نہ بن سکی کیونکہ مغرب پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور مشرق کا حال بھی تقریباً ان کے جتنا ہی خراب تھا۔

مسلمان سائنس داں نت نئی ایجادات کرتے کرتے اتنا آگے نکل گئے تھے کہ پتھر کو سونا بنانے کا سوچنے لگے تھے۔ گو کہ اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی اور نہ ایسی کامیابی آج کے زمانے میں بھی ممکن ہو سکی مگر اس سمت میں دوسری کامیابیاں ضرور حاصل ہوئیں۔ ایک یہ کہ سونے کو تحلیل کرنے کا ایک نسخہ دریافت ہو گیا۔ اس کے ذریعے سونے کے ڈلے کو بہت آسانی سے تحلیل کیا جانے لگا۔ وہ نسخہ جابر بن حیان (۷۳۷-۸۱۲ء) نے ایجاد کیا۔ وہ یہ تھا کہ شورے کے تیزاب نائٹرک ایسڈ اور نمک کے تیزاب ہائیڈروکلورک ایسڈ کو ملا کر ایک مائع تیار کیا۔ اس مائع میں سونے کا ڈلا ڈالتے ہی وہ حل ہو جاتا۔ اس مائع کو اس زبردست خاصیت کی بنا پر مائع الملوک (Aquaregia) کہا جانے لگا یعنی پانیوں کا بادشاہ۔

ہائڈروکلورک ایسڈ اور نائٹرک ایسڈ بھی جابر بن حیان نے ہی ایجاد کیا۔ اس نے گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) بھی ایجاد کیا۔ یہ تینوں تیزاب، معدنی تیزاب (Mineral acids) کہلاتے ہیں۔ جابر سے پہلے دنیا معدنی تیزابوں سے ناآشنا تھی صرف نباتی تیزابوں (Plant Acids) سے لوگ واقف تھے، لیموں کا تیزاب، ایسڈ اور املی کا تیزاب، نائٹرک ایسڈ وغیرہ سے۔

جابر کی ایجادات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس نے لوہے کو زنگ آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک مسالہ ایجاد کیا تھا۔ چمڑے کو رنگنے کے لیے ایک سفوف تیار کیا تھا۔ کپڑے کو

واٹر پروف کرنے کے لیے ایک وارنش بنایا تھا اس نے سونے کے پانی کی روشنائی بھی بنائی تھی جس سے اعلیٰ کتب مثلاً قرآن مجید وغیرہ کی کتابت کی جاتی تھی۔ سونے کے ساتھ اس کے اس نوع کے شغف کا ایک بہت ٹھوس ثبوت ابھی حال ہی میں ایک کھدائی کے ذریعے بھی دریافت ہوا ہے۔ بغداد میں باب دمشق کے نزدیک ایک کھدائی میں اس کا تجربہ خانہ دریافت ہوا ہے جس میں ایک کھرل اور سونے کا ایک ڈلا بھی ملا ہے۔

ان ایجادات کے ساتھ ساتھ جابر کا یہ کمال بھی ہے کہ سائنس کے اس قدر ابتدائی دور میں بھی وہ کیمیائی اجزا کے درمیان پیدا ہونے والے کیمیائی تعاملات کی مختلف قسموں کے اندرونی فرق سے واقف تھا۔ وہ تقطیر (distillation) تبخیر (evaporation)، تصعید (sabliation)، تکلیس (calcination) قلماؤ (reduction) کے فرق کو سمجھتا اور جانتا تھا۔ جابر نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک کتاب، کتاب الموازین بہت مشہور ہوئی اور یورپ میں The Book Of Balance کے نام سے ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔ اس وجہ سے یورپ والے بھی اس سے خوب واقف ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ جابر کے بارے میں ہم جتنا کچھ جانتے ہیں، یورپ والوں کے توسط سے ہی جانتے ہیں۔ امریکہ کی مشہور عام یونیورسٹی، میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں شعبہ کیمیا کی عمارت کی ایک دیوار پر تاریخ کے دس عظیم ترین کیمیا دانوں کے نام کندہ کیے گئے ہیں ان میں جابر بن حیان کا نام بھی شامل ہے۔

اسی طرح سے اسی یونیورسٹی کے شعبہ طبیعیات کی عمارت کی دیوار پر دس عظیم طبیعیات دانوں کے نام جو کندہ ہیں ان میں ایک مسلمان سائنس داں ابن الہیثم کا نام بھی ہے۔ ابن الہیثم (۹۶۵ تا ۱۰۳۹ء) کے کارنامے بھی بلاشبہ لازوال ہیں۔ طبیعیات نور میں قانون انعکاس (Law of reflection) اور قانون انعطاف (Law of refraction) اسی کی دریافت ہے۔ اس نے بھی سائنسی دریافتوں کے لیے تجربے کرنا اور تجربے کر کے حقائق دریافت کرنا اپنا اصول بنا رکھا تھا۔ روشنی پر تجربات کرنے کے لیے اس نے ایک اندھیرا کمرہ بنا رکھا تھا اور اس میں سورج کی روشنی کی کرنیں داخل کرنے کے لیے اس نے چھت میں ایک سوراخ بنا رکھا تھا۔ جب ہی سے آج تک روشنی پر تجربات اندھیرے کمرے (dark room) میں کیے جاتے ہیں۔

ابن الہیثم کی لازوال دریافتوں میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ اس نے اپنے تجربہ خانے میں تجربے کر کے بتایا کہ کسی ہموار غیر شفاف سطح پر روشنی کی ترچھی کرن اور ان کی منعکس ہونے والی کرن (Reflected ray) اس نقطے پر عمودی لکیر کے دونوں پہلوؤں پر برابر کے زاویے بنائے گی۔

پھر اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ روشنی کی لکیر ہمیشہ خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ ابن

الہیثم نے ہی یہ بھی معلوم کیا کہ روشنی آواز کی لہروں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے۔

ابن الہیثم کی یہ سب دریافتیں دلچسپ اور مفید تو تھیں ہی، اس کی ایک دریافت ایسی تھی جس نے سینکڑوں سال پرانی ایک غلط فہمی دور کر دی کہ دیکھنے کے لیے روشنی آنکھوں کے اندر سے نکلتی ہے۔ اس نے تجربہ کر کے بتایا کہ روشنی آنکھوں سے نہیں نکلتی بلکہ باہر کی روشنی آنکھوں میں داخل ہوتی ہے جب انسان کسی شئے کو دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔

اس کی ایسی نادر دریافتوں کی وجہ سے اسے یورپ میں بابائے بصیرت (the father of optics) کا لقب دیا گیا۔ اس کی اہمیت یورپ میں آج بھی قائم ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں اس کی کتاب، کتاب المناظر، جرمنی کے ایک ادارے جرمن اورینٹل سوسائٹی نے شائع کی ہے۔

مسلمانوں میں صرف یہی دو موجد اور سائنس داں پیدا نہیں ہوئے اور بھی تھے اور ہزاروں میں تھے۔ ایک سو کے لگ بھگ سائنس دانوں کا تذکرہ یورپی مصنفین بھی کرتے ہیں۔ ان میں ابن سینا، رازی، زہراوی، ابن نفیس، دمشقی، ابن بیطار، حافظ، دمیری، خوارزمی، عمر خیام، البیرونی اور ادریس وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ مسلمان سائنس دانوں کی کثرت تعداد کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ سوا لاکھ کتابوں کے قلمی نسخے صرف استنبول کے کتب خانوں میں ہیں۔ اہل یورپ نے اپنی زبانوں میں ان کے ترجمے کرانے کے لیے (اسپین اور اٹلی وغیرہ نے) دار الترجمے قائم کر رکھے تھے اور وہ سینکڑوں سال تک ترجمے کراتے رہے تھے پھر بھی تمام کتابوں کے ترجمے نہ کرا سکے کیونکہ ان کی تعداد ہی اتنی زیادہ تھی۔

یہ مسلمان سائنس دانوں کی ان کتابوں کا فیضان تھا کہ یورپ میں بھی سائنس پہنچ گئی ورنہ جیسا کہ ابھی بتایا گیا، وہاں تو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مسلم اسپین میں مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کی شہرت جب یورپ کے ملکوں میں پہنچی تو وہاں کے بعض طلباء کو سائنس سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور وہ یہ شوق لے کر اسپین پہنچے اور وہاں کے مسلمان سائنس دانوں سے سائنس سیکھی۔ اول اول جو عیسائی طلبا اسپین پہنچے ان میں راجر بیکن کا نام بہت مشہور ہے۔ اس کے بعد سے اسپین جا کے سائنس سیکھنے والوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ پھر یورپ میں بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ سب سے پہلی یونیورسٹی ۱۱۵۸ء میں بولوگنا (Bologna) میں قائم ہوئی پھر پیڈوا میں پھر نیپلز میں اور پھر جگہ جگہ۔

یورپ کی مشہور عالم نشاۃ ثانیہ (renaissance) جس نے وہاں علم کا اجالا کیا، اسی طرح سے رونما ہوئی، یورپ کی سائنسی ترقی اور وہاں کا صنعتی انقلاب اس کا ثمر ہے۔

❁.....❁

اسلامی دنیا میں تعلیم اور سائنس

ایک فسانہ عبرت

سہیل یوسف

پوری دنیا میں ۲۰ فی صد آبادی پر مشتمل امت مسلمہ آج ہر طرح کی ذلت و رسوائی کا شکار ہے۔ بہترین جغرافیائی محل وقوع اور وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود بھی اسلامی دنیا کی عالمی حیثیت صفر سے زیادہ نہیں ہے۔ ماضی میں شان دار اور لازوال علمی و سائنسی کارنامے انجام دینے والی قوم آج تقلید اور تحقیق دونوں سے ہی دامن چھڑا چکی ہے۔ آج ''پدرم سلطان بود'' کے مصداق ہمارے دامن میں ماضی پرستی کے علاوہ کوئی اور وجہ افتخار نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی جامعات میں سے کوئی ایک بھی کسی اسلامی ملک میں موجود نہیں ہے۔ امریکا کے مشہور سائنسی ادارے ''میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی'' (ایم آئی ٹی) کے نمائندہ جریدے ''ٹیکنالوجی ریویو'' نے مئی ۲۰۰۴ء کے اپنے شمارے میں ایجادات کے حوالے سے خصوصی موضوعات کے علاوہ ''ایجادات کا عالمی نقشہ'' بھی شائع کیا ہے۔ اس نقشے میں جدید ترین ایجادات کی دوڑ میں شریک مختلف ممالک کی بحوالہ پیٹنٹ درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔

اب اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں۔ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ اسی طرح پاکستان، افغانستان، ایران، وسط ایشیا کے اسلامی ممالک اور تمام افریقی اسلامی ممالک بھی کسی گنتی میں شامل نہیں ہیں۔ اب ہم بالخصوص عرب ممالک کا تذکرہ کریں گے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) نے دو سال پہلے مشرق وسطیٰ میں انسانی وسائل اور افرادی قوت کے متعلق پہلی تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں عرب دنیا کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، علمی اور سائنسی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی

ہے۔اس رپورٹ کو عرب ماہرین کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں رپورٹ سے صرف وہی نکات پیش کیے جارہے ہیں، جو عرب دنیا کی علمی اور سائنسی حالت زار سے بحث کرتے ہیں، جنھیں پڑھ کر پیروں تلے سے زمین سرک جاتی ہے۔مغربی ذرائع ابلاغ نے عرب دنیا کی جدید علوم میں پس ماندگی کو"بھیانک صورت حال" اور "خوفناک امر" سے نوازا ہے۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عرب دنیا کے کسی اخبار نے اس رپورٹ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔اس مضمون میں یواین ڈی پی کی رپورٹ کے مندرجات کو بغیر کسی اضافے اور ترمیم کے پیش کیا جارہا ہے۔

عرب دنیا ۲۲ ممالک پر مشتمل ہے اور ان کی مجموعی آبادی ۲۸ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہ دنیا کی کل آبادی کا ۵ فیصد ہے، جب کہ دنیا میں تیل کی بڑی مقدار ان کے قدموں تلے موجود ہے۔بہترین جغرافیہ، بندرگاہوں اور تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود جو گزشتہ ۲۰ سال میں یہاں کی فی کس آمدنی دنیا بھر میں سب سے کم رہی ہے۔ماسوائے افریقا کے ذیلی خطے کے چند ممالک کے، جن سے ان کی آمدنی تھوڑی سی زیادہ ہے۔نمو کی شرح اوسطاً ۵۔۰ فی صد سالانہ ہے۔اگر مستقبل میں یہی صورت حال برقرار رہی تو اگلے ۱۴۰ سال میں یہاں فی کس آمدنی دوگنی ہونے کے امکانات ہیں جب کہ دیگر ترقی یافتہ خطوں میں ۱۰ برس کے اندر فی کس آمدنی کی شرح دوگنی ہو جائے گی۔

اب عرب دنیا میں پیداواری افرادی قوت کے متعلق چند حقائق ملاحظہ کیجیے۔

یہاں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران اوسط پیداوار ۲۔۰ فی صد سالانہ کی شرح سے کم ہوئی ہے۔۱۹۶۰ء میں ایشیائی ٹائیگر مثلاً کوریا اور تائیوان وغیرہ کے مقابلے میں عرب ممالک کی فی کس آمدنی زیادہ تھی مگر اب ان ممالک کے نصف رہ گئی ہے۔وجہ یہ ہے کہ پانچ میں سے ایک عرب روزانہ 2 ڈالر بھی نہیں کماتا لیکن چند ممالک خاصے دولت مند ہیں۔تاہم رپورٹ میں انہیں دولت مند کہا گیا ہے، ترقی یافتہ نہیں۔گویا وہ امیر اور ترقی پزیر ہیں۔رپورٹ کے مطابق عرب ممالک نے تعلیم کے شعبے پر توجہ دی ہے۔۱۹۶۰ء میں یہاں ۶۰ فیصد ناخواندگی تھی جو ۱۹۹۰ء کے عشرے میں گھٹ کر ۴۳ فی صد تک رہ گئی۔اب بھی یہاں ساڑھے چھ کروڑ افراد ناخواندہ ہیں اور ان میں دو تہائی تعداد خواتین کی ہے۔

عرب ممالک کی آبادی میں ۳۸ فی صد افراد کی عمر ۱۴ سال تک ہے۔اس رپورٹ کی

تدوین میں نوجوان نسل سے بھی رابطہ کیا گیا جن کی اکثریت نے تعلیم اور روزگار جیسے شعبوں کے متعلق اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ۴۵ فی صد نوجوان افراد نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنا ملک چھوڑنا چاہتے ہیں۔ عرب دنیا میں فرسودہ تعلیم اور ناخواندگی نمایاں ہے۔ یہاں سائنسی تحقیق و ترقی بہت کم زور ہے۔ انٹرنیٹ اور دیگر مواصلاتی ٹیکنالوجیز سے استفادہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس وقت پوری عرب دنیا سائنس و ٹیکنالوجی جیسے اہم شعبے پر جتنی رقم خرچ کر رہی ہے وہ دنیا بھر میں خرچ کی جانے والی اوسط رقم کا ساتواں حصہ ہے۔ ۱۹۹۶ء میں عرب ممالک میں سائنس و ٹیکنالوجی پر مجموعی قومی پیداوار کا صرف ۰.۵ فی صد خرچ کیا جا رہا تھا۔ جب کہ اسی سال کیوبا ۱.۲۶ فی صد اور جاپان ۲.۹ فی صد رقم خرچ کر رہے تھے۔ اسلامی ممالک کے وزراء کا سائنسی و فنیاتی کمیشن (کومسٹیک) آج تک مطالبات زر کے چکر سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ متمول اسلامی ممالک عیش و عشرت پر اربوں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں جب کہ سائنسی منصوبوں کے لیے ان کے پاس چند لاکھ ڈالر بھی نہیں ہوتے۔

انگریزی سے ناواقفیت کی بناء پر عرب دنیا میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کی شرح بہت کم ہے بلکہ یوں کہیے کہ عرب ممالک پوری دنیا میں سب سے پیچھے ہیں۔ دوسری جانب عربی زبان میں ویب سائٹ کی تیاری پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی۔ انٹرنیٹ جیسے انقلابی ذرائع ابلاغ پر عدم توجہی کی بناء پر عرب ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ڈیجیٹل تقسیم (Digital divide) بڑھتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد بڑی تیزی سے ترقی یافتہ ممالک کا رخ کر رہے ہیں۔ ذہانت کے اس فرار سے عرب ممالک کو زبردست نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

اب اس سے زیادہ دردناک صورت حال ملاحظہ کیجیے۔ پوری عرب دنیا میں نئے علوم و فنون پر نئی تحریروں کا شدید فقدان ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی پر نئی کتابوں کی اشاعت نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ پوری دنیا میں ہر سال تقریباً دس لاکھ تحقیقی مقالے اور لگ بھگ ایک لاکھ سے زائد سائنسی کتب شائع ہو رہی ہیں۔ عربی سے اہمیت کی بناء پر اس زبان میں مضامین اور سائنسی کتب کا ترجمہ ہونا چاہیے تھا۔ ۲۰۰۱ء میں تمام ۲۲ عرب ممالک نے سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر جدید علوم پر صرف ۳۳۰ کتابیں ترجمہ کیں۔ اگر اس تعداد کو ۲۲ پر تقسیم کیا جائے تو گویا ایک سال میں ایک ملک نے صرف ۱۵ کتب ترجمہ کیں، جب کہ یورپ کے اوسط ملک یونان نے اسی مدت میں پوری عرب دنیا سے ۵ گنا زائد سائنسی کتب ترجمہ کی ہیں۔ یورپ کے ایک معمولی ملک اسپین

نے سال ۲۰۰۱ء میں جتنی کتب ترقی یافتہ زبانوں سے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیں، اتنی کتب گزشتہ ایک ہزار سال میں بھی پوری عرب دنیا نے ترجمہ نہیں کیں!

عرب ممالک قدرتی ذرائع سے مالا مال ہیں مگر جب اس کی آمدنی کی دوبارہ عرب ممالک میں سرمایہ کاری کی گئی تو خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں تمام عرب ممالک کی مجموعی پیداوار کا حجم ۵۳۱.۲ ارب ڈالر تھا، جب کہ اسی سال اسپین کی مجموعی قومی پیداوار اور ان تمام ممالک سے زیادہ (۵۹۵.۵ ارب ڈالر) تھی۔ اگرچہ انسانی وسائل کے لحاظ سے کویت سب سے بہتر ہے لیکن یہ ملک کینیڈا سے کہیں پیچھے ہے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ عرب دنیا نے ارزاں اور عام دستیاب ٹیکنالوجیز سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ انفارمیشن اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی آمد سے عرب عوام، خصوصاً خواتین ایک اہم پیداواری شریک بن سکتی تھیں لیکن یہ نہ ہو سکا۔ رپورٹ میں یہ واضح عندیہ دیا گیا ہے کہ عرب دنیا کے مستقبل کی بقاء صرف اسی صورت میں ہے کہ وہ ٹیکنالوجی کو ترقی اور مادی خوش حالی کے لیے استعمال کرے۔ عرب دنیا میں صرف ۱.۲ فی صد آبادی کے پاس کمپیوٹر ہے اور ان میں سے بھی نصف افراد انٹرنیٹ تک رسائی رکھتے ہیں۔ اگرچہ عرب ممالک نے کاروبار کو ٹیکنالوجی کی مدد سے فروغ دینے کی سعی کی ہے، مثلاً تیل کی کشید اور پروسینگ کے کویتی مراکز، سعودی عرب میں نمک ربائی (ڈی سالینیشن) کے پلانٹس اور مصر میں چینی کے کارخانے وغیرہ لیکن انہیں مزید فروغ و وسعت دینے کی ضرورت ہے، فی الحال عرب ممالک صرف خریدار بن کر صنعتی ترقی کے آخری سرے پر بیٹھے ہیں۔ دنیا بھر کی جدید ترین مصنوعات سے ان کے بازار اٹے پڑے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے عشرے میں عرب دنیا، تعلیم کے شعبے میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں اپنے ایک باشندے پر ۱۰ فی صد کم اخراجات خرچ کر رہی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں یہ صرف ۲۰ فی صد تک جا پہنچا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عرب دنیا بڑی تعداد میں موجود نوجوان نسل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے، دوسری جانب پرائمری اسکولوں میں ۱۰۰ فی صد بچوں کے داخلوں کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ میں عرب دنیا میں ۱۳ اہم عوامل کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ان میں مثبت تبدیلی پر زور دیا گیا ہے، اول تحریر اور اظہار کی آزادی، دوم، حکومتی اور دیگر اہم اداروں میں خواتین کی مناسب نمائندگی اور تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جدید علوم سے لیس مناسب افراد

کی قوت تیار کی جائے۔

ممتاز مصنف، فرانسس کالز نے مشہور ہفت روزہ سائنسی جریدے ''نیچر'' کی ۲۴ مارچ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں مسلم سائنس کے متعلق تھا۔ ''تقریباً ایک ہزار سال قبل اسلامی دنیا نے سائنس میں قابل قدر ترقی کی تھی، خاص طور پر ریاضی اور طب میں اپنے دور کے عروج میں بغداد اور جنوبی ہسپانیہ میں جامعات قائم کی گئیں اور ان سے ہزاروں، لاکھوں لوگ فیض یاب ہوئے۔ حکمراں، سائنس دانوں اور اہل ہنر افراد کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ آزادی کی اس فضا میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی مل کر کام کیا کرتے تھے۔ آج یہ سب قصہ پارینہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

اسلامی دنیا میں کئی مرتبہ بھاری رقوم خرچ کرنے کے باوجود بھی خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہوسکے۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں ''اقرا سرچارج'' کی ہے۔ اس مد میں کروڑوں اربوں روپے جمع کیے گئے۔ لیکن وہ رقم کن منصوبوں پر خرچ کی گئی؟ کوئی نہیں جانتا۔ مصر میں 2 کروڑ ڈالر کی خطیر رقم خرچ کرکے بھاری بھرکم ویکیوم ٹیوبس بنانے کا کارخانہ اُس وقت لگایا گیا، جب پوری دنیا میں ٹرانسسٹر کا استعمال بڑھ رہا تھا۔ ٹرانسسٹر تجارتی پیمانے پر تیار ہو کر بازار میں عام دستیاب ہونے لگے تھے۔ یہ کارخانہ یقیناً بیرونی مشوروں سے قائم کیا گیا تھا، جو مصری حکام نے بلا سوچے سمجھے مان لیے تھے۔ وہ سائنس کی ترقی سے نابلد تھے اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے سے قاصر تھے۔

امت مسلمہ میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سائنس دانوں کو کام کرنے کی آزادی، مناسب سہولتیں اور وقت دیا جائے۔ احیاء کی منزل راتوں رات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بہ قول ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی مرحوم ''سائنس کی ترقی کے لیے پیسے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک جانب سے پیسا ڈالا جائے اور دوسری جانب سے منافع نکال لیا جائے۔''

ممتاز ماہر سی پی سنو کہتے ہیں، ''سائنس و ٹیکنالوجی انسانی علوم کے وہ گوشے ہیں، جنھیں با آسانی سیکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کوئی ملک یا قوم سائنس سیکھنے یا سکھانے کی صلاحیت کے اعتبار سے دوسروں سے کم تر ہو۔''

تاریخ نے ایک وقت وہ بھی دیکھا کہ جاپانی گھوڑے کی نعل تک بنانا نہیں جانتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں شہنشاہ میجی نے حلف اٹھایا اور دوسروں سے بھی اٹھوایا کہ علم جہاں بھی ہوگا، اس سے

فائدہ اٹھا کر جاپان کی تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ آج وہی جاپانی قوم لاکھوں ٹرانسسٹرز پر مشتمل ایسے سرکٹ تیار کر رہی ہے جو سوئی کے سرے پر موجود سوراخ سے گزارے جا سکتے ہیں!

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی ممالک ''دولت مشترکہ برائے سائنس'' کے قیام کی جدوجہد کریں۔ علوم جدیدہ کے اعلیٰ ترین ادارے قائم کریں اور انفرادی قوت کی تربیت کا سامان کریں۔ ورنہ وہ وقت آنے والا ہے کہ ہمیں ٹوتھ پیسٹ اور بوٹ پالش بنانے کی ٹیکنالوجی بھی نہیں ملے گی۔

علم کی سچی تڑپ، لگن اور مستقل مزاجی سے ہی ہم اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ ترقی اور مادی خوش حالی کے تمام راستے سائنس و ٹیکنالوجی کی شاہراہ سے ہی گزرتے ہیں۔ یہ پس ماندگی اور اندھیرا ہمارا مقدر نہیں ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم خود کو بہتر بنا کر اپنا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اب الیسر ڈرناتھ وائٹ ہیڈ کے اس قول کو پڑھیے جو قوموں کے عروج و زوال کو بیان کرتا ہے۔ اس نے کہا تھا

''جس نسل کو ترقی کی قدر نہیں ہوگی، وہ ختم ہو جائے گی۔''

مسلمانوں کی سائنسی پسماندگی کے اسباب

ابوعلی عبدالوکیل

آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان اسپین پہنچے اور سو سال بعد سسلی میں وارد ہوئے۔ یہ اپنے ساتھ سائنس، فلسفہ، کیمسٹری، فزکس، الجبرا، طب، تاریخ، ریاضی، ادب، علم الکلام اور دیگر بے شمار علوم لے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ علوم فرانس، اٹلی، جرمنی، برطانیہ اور دیگر ممالک میں پہنچے اور بارھویں صدی عیسوی تک یورپ مائل بہ علم ہوگیا یہاں تک کہ ۱۲ویں صدی میں عام بیداری پیدا ہوئی جسے یورپ کی حیات ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ جب مسلمان یورپ میں داخل ہوئے تو اہل یورپ کی کیا حالت تھی اس کی ایک جھلک ڈاکٹر ڈریپر ۱۸۸۳ء کی زبان میں ملاحظہ ہو" قرون وسطی میں یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق اور بیابان تھا۔ کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ چمنیوں اور کھڑکیوں کا رواج نہ تھا لوگ بھینس کے سینگ میں گندی شراب پیتے تھے صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا اور نہ گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام تھا۔ گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے روشنی کا بھی انتظام نہ تھا۔ رہائش کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ گھر کے تمام افراد جانوروں کے ساتھ رات گزارتے تھے عام لوگ سال ہا سال ایک ہی لباس پہنتے تھے ان کے جسموں سے ہر وقت بدبو آتی رہتی کیونکہ نہانے کا رواج نہ تھا۔ پاک صاف رہنا اور نہانا بہت بڑا جرم تھا۔ فریڈرک ثانی (۱۲۱۲ء تا ۱۲۵۰ء) پر جب پاپائے روم نے کفر کا فتوی لگایا تو سر فہرست الزام یہ تھا کہ یہ مسلمانوں کی طرح ہر روز غسل کرتا تھا۔ غلیظ جسموں اور میلے لباسوں کی وجہ سے جوؤں کی کثرت تھی۔ فقر و فاقہ کی یہ حالت تھی کہ لوگ سبزیاں، پتے اور چھال ابال کر کھاتے تھے۔ یورپ میں سڑکیں نہ تھیں ذرائع حمل ونقل کے لیے بیل گاڑیاں، خچر

اور گدھے تھے۔ سترھویں صدی میں برلن کی یہ حالت تھی کہ جو شخص کسی کام کی غرض سے آتا تھا اس کے لیے قانوناً یہ لازم تھا کہ وہ اپنے ساتھ گند اور کوڑے کا ایک ڈھیر شہر سے باہر لے جائے۔ جو کہ برلن کی گلیوں وسڑکوں پر کثرت سے پڑے رہتے تھے رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ لوگوں میں بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ حرام کاری کے ہر روز نئے ریکارڈ قائم کرتے، غل مچاتے، شراب پیتے اور فساد کرتے۔ یہ لوگ بے حد ظالم تھے دن دہاڑے قتل واغوا کی وارداتیں کرتے۔ چوری اور ڈاکہ ان کا محبوب مشغلہ تھا ان لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ پڑھے لکھے شخص کو بے وقوف سمجھا جاتا تھا کتابیں پڑھنے کا رواج نہ تھا بلکہ چند مذہبی کتب پڑھنے کی تو ممانعت تھی۔ یہ تو ایک جھلک تھی اہل یورپ کی جہاں حکومت، تمدن، تہذیب اور علوم وفنون کا کوئی تصور تک نہ تھا عین اس وقت عرب سے ایک قوم اٹھی جو صرف نوے برس میں ملتان سے بحیرہ اسود، سمرقند سے ساحل اطلس اور وسط فرانس تک چھا گئی۔ اس قوم نے جا بجا مساجد بنائیں، علم فن کے بڑے بڑے مرکز قائم کیے، دنیا بھر کے علماء وحکماء کو اپنے درباروں میں جمع کیا، تمام یونانی ورومی علوم کو عربی میں منتقل کیا، جا بجا دارالکتب اور دارالعلوم قائم کیے۔ شفا خانے بنوائے، سڑکیں نکالیں، نہریں کھودیں، باغات لگائے، گلیوں کو پختہ کیا، رات کو روشنی کا انتظام کیا، پل اور تالاب بنائے اور دنیا کو حسین تعمیرات سے بھر دیا۔ اسلامی تعمیرات کے امتیازی اوصاف چمک، روشنی، صفائی، کشادگی، حسین نقش ونگار، پتھر کا نفیس کام، سنگ مرمر کی جالیاں، بلند مینار، گنبد، چھلکتے ہوئے تالاب، سرسراتے ہوئے چشمے، مہکتے ہوئے باغ اور ناچتے فوارے ہیں۔ الحمرا کا محل کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی تعمیراتی ہنر مندی کی منہ بولتی تصویر تھا مسلمانوں کی ترقی کی داستان اس قدر طویل ہے کہ اس کو ہزارہا صفحات پر بھی نہیں سمیٹا جا سکتا۔

ایرانی تافتہ اور طرابلس کے سٹلون نے یورپ کی نیم برہنہ آبادی کو لباس کا شوقین بنا دیا۔ اہل یورپ عربی لباس بڑے فخر سے پہنتے تھے۔ اس زمانے میں رطبہ کی آبادی ۵ لاکھ تھی اس میں ایک لاکھ ۱۳ ہزار مکانات اور ۷۰ ہزار لائبریریاں تھیں۔ شیشہ سازی اور چرمہ سازی کے کئی کارخانے تھے۔ سسلی کا پایہ تخت پالرمو مسلمانوں کے عہد میں بے حد خوبصورت شہر تھا کشادہ بازار، پختہ سڑکیں، سیدھی گلیاں، باغات، فوارے، سرخ وسفید وسبز پتھروں سے مزین مکانات ومساجد جمالیاتی حسن کو تسکین دیتے تھے۔ اسلامی اثرات نے یورپ کو سرے سے ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ آدمی آدمی سے ملے تو کچھ سیکھتا ہے۔ مسلمان اسپین میں آٹھ سو سال، فرانس میں دو سو، سسلی میں

۲۶۳ اور اٹلی میں ۱۵۰ برس تک حاکم رہے۔ محکوم پر حاکم کا اثر اتنا شدید ہوتا تھا کہ تہذیب و تمدن تو ایک طرف رہے بعض اوقات ان کا مذہب تک بدل دیا جاتا ہے۔ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں اپنی تہذیب کے ان منٹ نقش چھوڑ آئے۔ ہر چند کہ ہمارے اسلاف نے لاکھوں تصانیف لکھیں کتنے ہی ایسے تھے جنھوں نے ۵۰۰ سے زیادہ کتب لکھیں۔ امام غزالی ۳۰۰، ابن العربی ۲۵۰، ابن تیمیہ ۵۰۰، جلال الدین سیوطی ۵۵۰ اور ابن طولون ۷۵۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن بدقسمتی کی انتہا دیکھیئے کہ ہمیں ان کے نام سے بھی ناآشنا ہیں جو مسلمان اپنے سائنسدانوں کے نام سے بھی ناآشنا ہیں جو مسلمان ساری کائنات کے لیے معلوم کتاب وحکمت بن کر آیا تھا۔ آج جہالت کی دلدل میں گردن تک ڈوبا ہوا ہے۔ شام، مصر، لیبیا، عراق، ایران، الجزائر، ترکی اور ملایا میں ایک بھی کام کا مصنف نہیں پاکستان میں چند ایک ہیں مگر حکومت کی بے اعتنائی کی وجہ سے ان کی حالت قابل رحم ہے۔ ہمارے بزرگوں کی لاکھوں کتابیں کس کس موضوع پر تھیں، ہمیں معلوم نہیں اور معلوم بھی کیسے ہوتا تاری اور عیسائی درندوں نے ہماری لاکھوں کتابیں جلادیں اور جو بچ گئیں وہ آج لندن، پیرس، ہالینڈ، جرمنی، اسپین، نیویارک اور اٹلی میں مقفل ہیں۔ یورپ کئی سو برس اسلامی ممالک سے کتابیں نکال کر اپنی لائبریریوں میں بھرتا رہا۔ آج ہمارے ہاں اپنے اسلاف کی کتابوں کا ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنھوں نے جابر بن حیان کی الکیمیا، الرازی کی کتاب سبب و قوف الارض فی وسط السماء، ابوریحان محمد احمد البیرونی کی الصیانہ، علی بن حسین المسعودی کی مردح الذہب، ابن الہیثم کی کتاب المناظر اور مسئلہ ہندسہ، الکندی یعقوبی کتاب فی استخراج بعد مرکز المقر من الارض اور کتاب النجوم الجاحظ، عمرہ بن بحر بصری کی کتاب الحناء اور کتاب الزراع والنخل اور ابن رشد کی کلیات فی الطب کی کتابیں دیکھی بھی ہوں مگر آج یہ یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور ایسی ہی ہزارہا کتابوں کی بدولت آج یورپ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اگر سائنس پر لکھا جائے تو مسلمانوں کے کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ ہزارہا صفحات بھی سیاہ کر دیئے جائیں تو ان کے کارنامے اور ایجادات ختم نہ ہوں یہاں میں صرف چند ایجادات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

طاعون کی بیماری پر پہلی تحقیق ابن الخطیب نے کی۔ اس کی تحقیقی کتابیں ۱۴ ویں اور ۱۶ ویں صدی کے درمیان یورپ میں بار بار پہنچیں (میراث)۔ چیچک کا ٹیکہ مسلمانوں نے ایجاد کیا (ڈاکٹر ڈریپئر)۔ کاغذ کی صنعت کی ترقی مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ کاغذ کے اصل موجد چینی تھے مگر وہ بہت مشکل طریقے سے کاغذ بناتے تھے مسلمانوں نے اس پر تحقیق کر کے اسے کپڑے اور

گھاس پھونس اور درختوں کی لکڑیوں سے بنانے کو رواج دیا اور چند سالوں میں کاغذ کی ارزانی کی وجہ سے کتابیں سستی ہوئیں۔ بغداد، شام اور غرناطہ میں کاغذ بنانے کے کئی کارخانے کام کرتے تھے قطب نما اور بارود بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے (تمدن عرب)۔ کلاک اور گھڑیال کے میدان میں مسلمانوں نے ایسے ایسے حیرت ناک اور عجیب وغریب کلاک اور گھڑیال بنائے کہ آج تک اہل یورپ اس پر حیران ہیں۔ فاضل الجزری نے گھڑیوں کی مشینوں پر پوری کتاب لکھی۔ عینک، میزان الوقت اور بادنما بھی مسلمانوں نے ایجاد کیئے۔ خالص سائنسی تحقیق بھی مسلمانوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ گندھک کا تیزاب آج کون نہیں جانتا کہ صنعت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہ جابر بن حیان کی ایجاد ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بدولت آج انسان کمپیوٹر بنانے کے قابل ہوا ہے علم ریاضی ہے۔ عرب جیومیٹری اور ٹرگنومیٹری کے موجد ہیں۔ الجبرا کی بدولت آج اہل یورپ نے الیکٹرانکس میں بے انتہا ترقی کی ہے جو کہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ڈاکٹر ڈریپئر کی کتاب معرکہ مذہب وسائنس کے مطابق سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی خلا کا پتا چلایا اور زمین کے بارے میں تحقیق کی۔ زمین کے گول ہونے کی نشاندہی اور اس کا قطر بھی مسلمانوں نے دریافت کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ اور انگلستان سمیت پوری دنیا میں مختلف طلباء علم حاصل کرنے کے لیے اسپین میں رہا کرتے تھے اور انہیں عربی زبان سیکھنی پڑتی تھی۔ مسلمانوں نے یہاں علم کے چراغ روشن کرر کھے تھے جن کی روشنی دنیا میں پھیل رہی تھی۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جب مسلمانوں نے اپنی روایات کو چھوڑ دیا اور اہل یورپ ان سے ترقی میں آگے نکل گئے اور آج یہ عالم ہے کہ جو بھی نئی دریافت، تحقیق، ایجاد یا تخلیق ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو مسلمان ساری کائنات علوم وفنون، اخلاق وتہذیب اور تمدن کا درس دے رہا تھا اسے یکا یک کیا ہو گیا ہے؟ اس کے اعضاء شل، حوصلے سرد اور دماغی قویٰ مفلوج ہو گئے۔ اس سوال کا جواب میرے ذاتی خیال کے مطابق یہ ہے کہ مسلمان نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے اور جس دن سے اسلام دین کے بجائے مذہب بن گیا مسلمانوں کی ذلت کی ابتدا اسی دن سے ہو گئی ہے۔ جو حالات اہل یورپ کے تھے وہی حالات مسلمانوں کے ہو رہے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عیسائیوں نے غور وفکر اور مذہبی معاملات میں پہرے بٹھار کھے تھے ڈاکٹر ڈریپئر لکھتا ہے کہ مسیحیت کی تاریخ میں سب سے نامبارک دن وہ تھا جب اس نے اپنے آپ کو سائنس سے علیحدہ کیا اس نے آرجبب کو جو اس زمانے (۲۳۱ء) میں کلیسا کی طرف سے سائنس کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا، مجبور کیا کہ وہ

اسکندریہ چھوڑ کر قیصریہ چلا جائے۔ (۴۱۴ء) میں سینٹ سائرل اسکندریہ کے بشپ نے خاتون سائنس داں ہائی پیشیا کو سر بازار برہنہ کر کے اذیت ناک موت کا شکار کیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ سائنس کا لیکچر دیا کرتی تھی۔ مدارس بند کر دیئے گئے، بطلیموس کا جمع شدہ کتب کا سرمایہ جس میں ۷ لاکھ کتب موجود تھیں نذر آتش کر دیا گیا۔ سائنسی تحقیق کو کفر اور خدا کے مقابلے کا نام دیا گیا۔ لکھنا پڑھنا اور مذہب میں عقل استعمال کرنا کفر قرار دیا گیا۔ ایسے حالات میں غار حرا سے ایک آواز سنائی دی کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا قرآن کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس نے وسیع و عریض کائنات کے حقائق اور نفس انسانی کے عمیق و دقیق رموز و اسرار ایسے مرتکز (Concentrated) انداز میں بیان کئے ہیں کہ اس کے لیے ایک ایک قطرے میں سمندر سمویا نظر آتا ہے۔

مسلم نوجوانوں کے لیے جدید علوم کی ضرورت واہمیت

محمد آصف احسان

اسلام دین فطرت ہے جو اپنے واضح احکام وفرامین کی کشش کے باعث قلب انسانی میں گھر کرتا ہے، فطرت بشری کی تجزیہ کاری اس کے متنوع علوم ومعارف کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی افادیت کی مظہر ہے۔ درحقیقت اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو انسان کو کائنات کے سربستہ اسرار معلوم کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس کے ماننے والے محض نام کے مسلمان نہ کہلائیں بلکہ وہ اپنے قلب وذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ورسول اللہ ﷺ کی رسالت اور اسلام کے جملہ احکام پر ایمان لانے والے ہوں۔ اس کا بنیادی مقصد حقیقی اور باعمل مسلمان کے نمونے کی تیاری ہے جو کفار کے لیے اسلام کی دعوت کا ذریعہ ثابت ہو۔

علم کی اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ زمانہ قدیم سے دور حاضر تک کا ہر متمدن و مہذب معاشرہ علم کی اہمیت سے واقف ہے۔ فطرت بشری سے مطابقت کی بنا پر اسلام نے بھی علم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے ابتدائی آثار ہمیں رسول ﷺ کے عہد مبارک میں ملتے ہیں۔ چنانچہ غزوہ بدر (رمضان ۲ھ) کے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ ان میں سے جو نادار تھے، وہ بلا معاوضہ ہی چھوڑ دیے گئے لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انہیں حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیے جائیں گے۔ چنانچہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو کاتب وحی تھے، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ (سیرت النبی از شبلی نعمانی: ۱۹۶/۱)

یہ معمولی واقعہ ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نبی اقدس ﷺ کی نگاہوں میں تحصیل علم کس قدر ضروری تھا۔ اسلام بجا طور پر جملہ مباح علوم کی اور بالخصوص سائنس کی افادیت

کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے اس کی ترویج کو متقضائے شریعت کی تکمیل تصور کرتا ہے۔ جو مذاہب انسان کو دنیا سے فرار کا درس دیتے ہیں، اسلام ان کے برعکس سائنس اور دیگر جائز علوم کو نظام قدرت میں مداخلت قرار نہیں دیتا بلکہ ایک سچے اور کھرے مسلمان کے ساتھ ساتھ دنیا میں مروجہ علوم کا ماہر بھی اسے درکار ہے جو اسلام کے پیغام حق کو جدید ذرائع کی وساطت سے غیر مسلمانوں تک پہنچا سکے۔

اسلام کی اس حقیقت پسندانہ سوچ کے باوجود عصر حاضر کا یہ عظیم المیہ ہے کہ مسلمانوں کا جس قدر علمی عروج اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر کئی صدیوں تک قائم رہا، اسی قدر وہ آج انحطاط وتنزل کا شکار ہیں۔ صرف علم میں فقدان کے باعث ہم کئی اور شعبوں میں بھی مغرب کے غلام بن چکے ہیں۔ معیشت، معاشرت، ثقافت وسیاست اور دیگر کئی معاملات میں ہم اغیار کے محتاج ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جس کا بدقسمتی سے ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسلمان جس کی تخلیق دنیا کی راہنمائی کے لیے کی گئی تھی آج خود نشان منزل کھو چکا ہے اور سراب سفر کو مقصود حقیقی سمجھ کر اسی پر قانع وشاکر ہے۔ اسی لیے ذلت ومسکنت کے گھرے بادل شش جہت سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے شاندار ماضی اور عبرتناک حال کو دیکھ کر مستقبل کو درخشاں کرنے کی بہتر منصوبہ بندی کریں۔

جدید سائنسی ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ

اس دور میں جب پورا یورپ جہالت کے اندھیروں میں ٹاک ٹوئیاں مار رہا تھا، مدارس اسلامیہ بالخصوص غرناطہ، طلیطلہ اور بغداد میں علم کی قندیلیں روشن تھیں۔ یورپ کے بیشتر جویان علم مسلمان اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر کے اپنی علمی تشنگی دور کرتے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کی موجودہ تہذیب وترقی مسلمانوں کے سائنسی ارتقا کی رہین منت ہے۔ اسلامی علوم وفنون نے کچھ تو ہنگری اور بلقانی ریاستوں کے ذریعے اور زیادہ تر اندلس و صقلیہ (سپین اور سسلی) کے رستے یورپ میں نفوذ کیا۔ خلافت اندلس میں پوری علمی آزادی تھی۔ طلیطلہ اور قرطبہ کے مضافات میں بے شمار خانقاہیں تھیں جو مسافروں کے لیے اقامت گاہوں کا کام دیتی تھیں۔ یورپ کے تمام ممالک سے طالبان علم عربوں کے علمی مراکز کا رخ کرتے تھے اور وہاں آکر مسلمانوں کی علمی فیاضی سے مستفید ہوتے تھے۔

صقلیہ میں فریڈرک دوم اور اس کے جانشینوں نے مختلف علوم وفنون (فلسفہ، سائنس اور

طب) کی کتابیں لاطینی میں بکثرت ترجمہ کروائیں۔ یورپ میں اندلس کے اسلامی علوم وفنون کی اشاعت بھی فریڈرک کے واسطے سے اٹلی (اطالیہ) اور سسلی (صقلیہ) کی راہ سے ہوئی اور فلسفہ و طب کے علاوہ دیگر علوم کی کتب بھی لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ ان کتابوں کے بیشتر مترجم یہودی علما تھے۔ جنہوں نے یورپ کے ثقافتی ارتقا میں بھرپور حصہ لیا اور اسلامی ثقافت کو یورپ کے دور دراز اور نیم مہذب علاقوں تک پہنچایا۔ عربی کتابوں کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ کے لیے سرچشمہ رحمت ثابت ہوئے۔ فرانسیسی اور جرمن راہبوں نے علوم کی درسی کتب یہودی فضلا سے پڑھیں۔ ولیم آف نارمنڈی کے ساتھ بے شمار یہودی انگلستان آئے، جہاں آکسفورڈ میں ان کے ہاتھوں پہلا مدرسہ قائم ہوا۔ اسی سکول میں راجر بیکن (Roger Bacon) نے عربی زبان اور دیگر علوم حکمیہ حاصل کیے۔ کہا جاتا ہے کہ مغرب میں تجربی علوم کا سہرا راجر بیکن کے سر ہے۔ مسیحی یورپ نے مسلمانوں کے علوم راجر بیکن سے سیکھے جس نے خود آکسفورڈ کے علاوہ پیرس میں قیام کر کے مسلمانوں سے علوم سیکھے تھے۔ وہ برملا یہ اعتراف کرتا تھا کہ

> ''اس کے معاصرین کے لیے، علم صحیح، کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور اس کے علوم ہیں۔'' اسے اعتراف تھا کہ اس نے ارسطو کا فلسفہ ابن رشد کی تصانیف کے تراجم سے سمجھا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، مقالہ علم: جلد ۱۴/۱/۱۴۱)

جدید علوم اور عیسائیت کا طرز عمل

اسلام کی معارف پروری کے برعکس عیسائیت کا علوم کے ساتھ طرز عمل ملاحظہ کیجیے۔ عیسائی راہبوں نے علم کو مذہب سے متصادم قرار دیا اور اس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جس شخص کو انہوں نے تحصیل علم اور اس کی تدریس و تعلیم میں منہمک دیکھا، اسے یا تو ختم کر دیا، یا مستوجب سزا و تعزیر قرار دے دیا۔ مذکورہ سائنسدان راجر بیکن کو جادوگر اور شیطانی علم کا پرچارک قرار دیا گیا اور کلیسا کی جانب سے سنائی گئی سزا کے مطابق اسے ۲۴ سال جیل میں گزارنے پڑے۔ گلیلیو گلیلی (۱۵ر نومبر ۱۵۶۴ء تا ۸ر جنوری ۱۶۴۲ء) اور کوپرنیکس Copernicus (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) کو بھی اپنے افکار و نظریات کے عیسائیت سے متصادم ہونے کے باعث بے پناہ مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔

اسکندریہ یونیورسٹی

سکندر اعظم نے ۳۳۴ قبل مسیح میں مصر پر قبضہ کیا اور ۳۳۲ قبل مسیح میں اسکندریہ کی بنیاد

رکھی جو یورپ اور ایشیا کی تجارت کا مرکز ہونے کے باعث رفتہ رفتہ تہذیب وثقافت اور فکر و دانش کا مرکز بن گیا۔ اس میں موجود یونیورسٹی قریباً چھ سو سال تک تشنگان علم کو سیراب کرتی رہی۔ اس میں موجود کتب کی تعداد چھ لاکھ سے متجاوز تھی۔ اسکندریہ کی یہ عظیم لائبریری جسے انسانی فکر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت حاصل تھی، عیسائی مذہب کے سائنس کے خلاف تعصب کی نذر ہو گئی۔ ۳۹۰ء میں بشپ تھیوفیلس کے فتویٰ کی بنا پر اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ ان کتب کی کوکھ سے جن مشہور و معروف سائنسدانوں نے جنم لیا، ان میں اقلیدس (۳۲۳-۲۸۵ قبل مسیح)، ارشمیدس (۲۸۷-۲۱۲ قبل مسیح)، جالینوس (۱۲۹-۲۵۹ء) اور بطلیموس (۹۵-۱۶۸ء) وغیرہ شامل ہیں۔

اسی یونیورسٹی سے وابستہ ایک مشہور معلّمہ جس کا نام ہائی پیشیا (Hypatia) تھا، عیسائی تعصبات کا شکار ہو گئی۔ وہ فلسفہ ارسطو کی تشریحات میں مہارت رکھتی تھی۔ ایک دن وہ اپنے مدرسہ جا رہی تھی کہ پادریوں اور عیسائی راہبوں نے اسے گھیر لیا اور بیچ بازار میں کپڑے پھاڑ کر اسے بالکل برہنہ کر دیا پھر گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے اور وہاں مقدس عصائے پطرس کی متواتر ضربات سے اس کا سر پاش پاش کر ڈالا۔

مسلمانوں میں علوم کا فروغ

مسلمان سائنسدانوں نے علم کائنات، علم حشرات الارض وحیوانات، علم نباتات، علم جہاز رانی، جغرافیہ وحساب، علم طب یعنی علم الابدان، علم ریاضی، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم فلکیات، علم توانائی اور علم تعمیرات وغیرہ سے دنیا کو روشناس کرایا۔ جن عظیم مسلمان سائنسدانوں نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ان میں جابر بن حیان (۷۲۲-۸۱۷ء) عبدالملک اصمعی (۷۹۰-۸۳۱ء) محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۷۸۰-۸۵۰ء)، یعقوب بن اسحٰق الکندی اور الجاحظ (متوفی ۸۶۹ء) وغیرہ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا مسلمان سائنسدانوں کے جملہ کارناموں کی مکمل تفصیل ایک ضخیم کتاب کی متقاضی ہے تاہم اجمال وایجاز کے پیش نظر کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) نصیر الدین طوسی: قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ذہین وفطین شاگرد تھا۔ اس نے نھایۃ الادراک فی روایۃ الافلاک لکھی جو 'شیرازی' علم کی نجوم پر مشہور تصنیف 'تذکرہ' کی ارتقائی صورت ہے۔ اس میں ہندسی مسائل پر بھی بڑے قیمتی مباحث ملتے ہیں، مثلاً رؤیت کی خاصیت اور قوس قزح (Rainbow) کی تشکیل۔ وہ پہلا سائنسدان تھا جس نے قوس قزح کی تشکیل کا ایک صحیح اور واضح حل پیش کیا۔

(۲) جابر بن حیان: بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ تجرباتی کیمیا کا بانی تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، دھاتوں کے مرکبات بنانے، دھاتوں کو مصفی کرنے، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لیے، اس پر وارنش کرنے اور بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے خضاب تیار کرنے کی طرح کے بیسیوں طریقے بیان کئے ہیں۔ جابر نے سفیدہ (Lead Carbonate)، سنکھیا (Arsenic) اور سرمے (Antimony) کو ان کے سلفائیڈ (Sulphide) سے حاصل کرنے کے طریقے بتائے۔

(۳) محمد بن موسیٰ الخوارزمی: میدان ریاضی اور ہندسہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ بالخصوص الجبرے کی مساوات پیش کر کے اس نے دنیا ریاضی میں تہلکہ مچا دیا۔ عالم اسلام کا یہ سب سے پہلا ریاضی دان تھا جس نے پوری دنیا کو الجبراء، جیومیٹری اور حساب کے ایسے ایسے اصول مرتب کر کے دیئے جو سابقہ یونانی و رومی علم ریاضی کو یکسر مات دے گئے۔ اس کی کتاب کا نام 'الجبر والمقابلہ' ہے۔

یورپی مصنفین نے مسلمان فلاسفہ پر سخت تنقید کی ہے کہ انہوں نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی بلکہ ساری عمر ارسطو کی پیروی اور اس کی تصانیف کی شرح و اختصار میں صرف کر دی۔ لیکن اس بے بنیاد الزام کی خود یورپ کے بعض فضلا نے تردید کی ہے۔ مشہور جرمن ریاضی دان ویدمان (Wied Mann) نے لکھا

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں نے بعض نظریات یونانیوں سے لیے تھے، لیکن انہوں نے ان نظریات کو اچھی طرح سمجھ اور پرکھ کر ان کا انطباق مختلف ادوار کے کثیر حالات پر کیا۔ پھر انہوں نے جدید نظریات اور اچھوتے مباحث پیدا کیے۔ اس طرح ان کی علمی خدمات نیوٹن اور دوسرے سائنسدانوں سے کم نہیں۔"

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ: جلد ۱۴/۱، ص ۳۲۲)

حکمائے اسلام کے سوانح و تراجم کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ روم اور یونان کے علوم عقلیہ کو خلاف دین، حرف آخر یا جامد چیز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔ غور و فکر کرتے تھے، تجربہ و مشاہدہ سے کام لیتے تھے، ان علوم میں نئی چیزیں پیدا کرتے تھے اور دوسروں کے اقوال پر تنقید بھی کرتے تھے۔ تعلیم و تعلم اور افادہ و استفادہ کے لیے وہ

اقصائے ترکستان سے 'مغرب' تک اور اندلس سے حجاز تک محو سفر رہا کرتے تھے۔ علوم طبیہ میں ان کے نظریات و نتائج حیرت انگیز ہیں اور ان میں سے بعض حکماء مستقل دبستان ہائے فکر کے بانی تھے۔

علم تاریخ

خاص طور پر ایک عنوان کے ماتحت 'علم تاریخ' کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کے ساتھ مسلمانوں سے کہیں زیادہ کسی نے اعتنا نہیں کیا۔ مسلمانوں سے قبل تاریخ محض بے سند واقعات پر مبنی تھی، جسے توہم و خرافات اور قصہ و داستان وغیرہ کا مجموعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مسلمان چونکہ امر واقعہ کی صداقت کے لیے مستعد رہتے تھے، لہٰذا انہوں نے علمی بنیادوں پر علم تاریخ کی بنیاد رکھی، جس کے لیے انہوں نے شہادت، روایت اور درایت تینوں کو اہمیت دی، انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں سند کی مسلسل جستجو کی اور رواۃ کے حالات و تراجم اس سعی و تلاش سے بہم پہنچائے کہ اسے ایک عظیم فن بنا دیا۔

ابن خلدون فلسفہ تاریخ کا موجد ہے۔ اس نے درایت کے اصول مرتب کیے اور اس امر کی تشریح کی کہ راویوں کی جرح و تعدیل کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ واقعہ فی نفسہٖ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ امام محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی 'تاریخ الرسل والملوک' البلاذری کی 'فتوح البلدان'، ابن کثیر کی 'البدایہ والنھایہ' اور 'طبقات ابن سعد' وغیرہ تاریخ و سوانح کی عظیم کتابیں شمار کی جاتی ہیں جو کئی کئی مجلدات پر مشتمل ہیں۔

بیت الحکمت کا قیام

یہ ایک علمی ادارہ تھا جس کی تاسیس ہارون الرشید یا اس کے بیٹے مامون الرشید (روایات میں اختلاف ہے) کے ہاتھوں انجام پائی۔ بغداد میں موجود اس دارالترجمہ اور دارالتصنیف میں مختلف ممالک کے رہنے والے مختلف مذاہب کے پیروکار اور مختلف زبانیں جاننے والے علماء مصروف کار رہتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ یونانی اور دیگر زبانوں میں موجود اہم علمی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ اس ادارے سے فلکیات کی رصد گاہیں (Observatories) بھی ملحق تھیں، ان میں سے ایک بغداد میں اور دوسری دمشق میں قائم کی گئی۔ جہاں سائنسدانوں نے بطلیموس (Ptolemaeus) کی تیار کردہ قدیم تقویم کی تصحیح کی اور خاص طور پر نئی تقاویم ایجاد کیں۔

سطور بالا میں مسلمانوں کے گزشتہ علمی عروج اور عیسائیت کا سائنس سے تصادم نیز

یورپ کی انحطاط کا احوال مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی موجودہ کیفیات کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں اور ان اسباب وعلل پر تفکر وتدبر کر سکتے ہیں جو ہمارے موجود زوال کا باعث بنے۔ عالم اسلام کے نامور ادیب وداعی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (متوفی ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) رقمطراز ہیں:

''عالم اسلام کے لیے ضروری ہے کہ علم کی اس طرح تنظیم جدید کرے جو اس کی روح اور اس کے پیغام سے مطابقت رکھتی ہو۔ عالم اسلام نے قدیم دنیا پر علمی سیادت کا سکہ جما دیا تھا اور دنیا کی عقلیت وثقافت کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ اس نے دنیا کے ادب اور فلسفہ کے جگر میں نشیمن بنایا تھا، صدیوں متمدن دنیا اس کی عقل سے سوچتی رہی، اس کے قلم سے لکھتی رہی اور اس کی زبان میں تصنیف وتالیف کرتی رہی، چنانچہ ایران، افغانستان اور ہندوستان کے مصنفین اور اہل علم اگر کوئی کتاب لکھنا چاہتے تھے تو عربی ہی میں لکھتے تھے۔

اگرچہ یہی علمی تحریک جو عہد عباسی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی، یونان اور عجم سے متاثر تھی، اور اسلامی سپرٹ اور اسلامی فکر کی بنیاد پر قائم نہیں تھی اور اس میں علمی ودینی حیثیت سے متعدد خامیاں اور کمزوریاں تھیں، لیکن اپنی قوت، تازگی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر آندھی اور سیلاب کی طرح چھا گئی اور قدیم علمی نظام اس کے سامنے ٹھٹھر کر رہ گئے۔

اگر عالم اسلامی کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو، اگر وہ عالمگیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈر شپ بھی بہت ضروری ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں، یہ مسئلہ بہت گہرے غور وفکر کا محتاج ہے اس کی ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف وتالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے، اس کام کے سربراہ عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق وتنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو،

اور اس کے ساتھ اسلام کے اصل سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور
اسلامی روح سے ان کا قلب ونظر معمور ہو۔"
(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر: ص ۲۵۱ تا ۲۵۳ از سید ابوالحسن علی ندوی)

سطور ذیل میں ہم ان اہم شعبوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں مسلمانوں کو ید طولیٰ حاصل ہونا چاہیے:

ا۔ سائنس کی تعلیم

ہمیں اپنے تمام مسائل کے حل کے لیے جملہ وسائل کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ ان میں جدت کی تخلیق اور خود کفالت کی تحصیل کے لیے کیمیا (Chemistry)، طبعیات (Physics)، حیاتیات (Biology)، ریاضی (Mathematics) اور دیگر عصری علوم میں نہایت مہارت کی ضرورت ہے، انہی علوم میں دفاعی اور حربی مقاصد کے لیے ایٹمی قوت بھی شامل ہے جو کہ اسلام کا جزو لاینفک ہے۔

۲۔ انگریزی زبان کی تعلیم

غیر مسلموں کو اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے اور ان کو اسلامی نظریات و افکار سے روشناس کرانے کے لیے انگریزی بنیادی اہمیت رکھتی ہے جو صرف انگریزوں کی زبان ہونے کے باوجود دنیا کے قریباً تمام ممالک میں بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جارہی ہے۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت میں ان تمام زبانوں سے کام لینا چاہیے جو عوام الناس میں رائج ہیں۔

(الدعوۃ اللہ واخلاق الدعاۃ: ص ۲۵)

۳۔ کمپیوٹر کی تعلیم

اسلام میں اکثر چیزیں اپنے عمومی استعمال کی بنا پر جائز ہیں۔ مثلاً چاقو عام طور پر مختلف اشیاء یعنی پھل اور سبزی وغیرہ کاٹنے کے لیے مستعمل ہے جو کہ جائز ہے۔ لیکن اسی سے جب کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارا جائے تو اس وقت یہ ایک قبیح و مکروہ اوزار اور آلہ قتل متصور ہوگا۔

ایسے ہی کمپیوٹر (Computer) کا استعمال ہے جس سے عام طور پر تجارت وغیرہ جیسے مباح امور کے لیے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان سب کے باوجود قطعی فیصلہ عموم

کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اکثریت جس کام کو کرے، مشاہدات و نتائج اسی سے مرتب کیے جاتے ہیں چنانچہ اس بات میں ذرا بھی جھوٹ نہیں کہ نوے فی صد سے زیادہ لوگ کمپیوٹر میں انٹرنیٹ کے ان پروگراموں کو استعمال کرتے ہیں جو ہمہ وقت عریانی و فحاشی کے مہلک زہر کو نوجوان نسل کی شریانوں میں اتار رہے ہیں اور اگر مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ کاروبار وغیرہ کا تو جھانسا ہے ورنہ انٹرنیٹ (Internet) کی ایجاد ہی اس مقصد کیلئے ہوئی ہے کہ اس سے قوم کی اخلاقیات کے قلعے مسمار کر دیئے جائیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ علم جہاں کامرانی، اقتدار، قیادت اور تہذیبی سربلندی کا ذریعہ ہے وہاں تہذیب اخلاق کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ بقول شاعر

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ!

بدقسمتی سے مغرب میں مدت دراز سے علم کے ارتقا کا تعلق انسانی بہبود و فلاح اور اخلاقی استحکام کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکا۔ اس نے انسان کے اخلاقی وجود کو نظر انداز کر کے علم کو محض مال و زر، طاقت کے حصول اور آسانیوں کی فراہمی کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ معاشرے کی فلاح و بہبود کا محض مادی پہلو پیش نظر رہ گیا ہے اور حقیقی انسانیت سے ماورا اخلاقی پستیوں کے خوگر مصنوعی معاشرے وجود میں آ گئے ہیں۔ مغرب سے آنے والے جدید علوم اور ثقافتی تصورات مشرق کے لیے من و عن قبول کرنے کے لائق نہیں۔ ان میں مغربی دنیا اس قدر غرق ہو چکی ہے کہ نہ تو کسی اچھے معاشرے کی تشکیل میں کامیاب ہو سکے گی اور نہ فرد کا ارتقا صحت مند طریقے سے ہو سکے گا۔ مغرب کے پاس معلومات کا ڈھیر تو ہے اور وہ فارمولے بھی ہیں جن کے ذریعے کائنات کی توانائیوں سے ہزار ہا کام لیے جا سکتے ہیں مگر وہ اصول و نظریات نہیں ہیں جو ان معلومات کو سلیقہ مندی سے استعمال کرنے کے لیے روشنی فراہم کر سکیں۔ ٹیکنالوجی میں اس قدر ترقی کے باوجود مغرب کے لوگوں میں علم حقیقی جو اصل اخلاقیات سے متصف ہو، عنقا ہے۔

سب سے اہم مسئلہ ان کے ہاں اخلاقی انحطاط کا ہے۔ یورپین ممالک اور امریکہ وغیرہ کے لوگوں میں مادر پدر آزادی اور رند مشرب خیالات کا فروغ زوروں پر ہے۔ اسی اخلاق اور معاشرتی پستی نے ان کو انسانیت سے نکال باہر کیا ہے۔ جو حیوان سے بھی بدتر کردار کے حامل ہو چکے ہیں۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں چھ منٹ کے بعد عصمت دری کا ایک واقعہ سرزد ہو جاتا ہے۔ جب کہ سویڈن میں ستر فی صد کنواری لڑکیاں شادی سے قبل حاملہ ہو جاتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ "ایک زانیہ عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ (دنیا

میں موجود) تمام عورتیں زنا کریں"......اسی فرمان کی صداقت موجودہ حالت کے حقیقت پسندانہ تجربہ سے واضح ہوتی ہے کہ مغرب محض اپنے دام فریب میں پھنسانے کے لیے تجارت میں سبقت (Advancement) وغیرہ کا دھوکہ دیتا ہے حالانکہ وہ دراصل اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے اور یہود جیسی گھاگ، سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ قوم سے یہ کچھ بعید نہیں جن کے مکائد و دسائس ہمیشہ اہل اسلام کی مزاحمت و مخالفت میں مصروف کار رہے ہیں۔

دانا حضرات کا قول ہے کہ اگر کسی بڑے نقصان سے بچاؤ کے لیے کسی چھوٹے فائدے سے صرف نظر کرنا پڑے، تو یہ خسارے کا سودا نہیں۔ کیا پاکستان جیسی اسلامی نظریاتی مملکت میں کاروبار اور معلومات وغیرہ کی زیادتی کے لیے اس علانیہ فحاشی سے بے پروا ہوا جا سکتا ہے جو بتدریج وطن مالوف کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ یہ قدامت پسندی نہیں بلکہ پیش آمدہ خطرے سے بچاؤ کی تدبیر ہے۔ کیا کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کی ایجاد سے قبل پاکستان کے لوگ بھوکے مرتے تھے یا فاقے کرتے تھے۔ یا اب ہمارا ستارہ حیات کون سی بلندی پر محو گردش ہے؟ وہی کفار ملعونین کے قرضوں سے وطن عزیز کی معنوی ترقی (سبقت) پنجہ یہود کی بے رحم و ظالم گرفت میں ہے۔ ان اشیاء کی افادیت کے راگ الاپنے والے بتائیں کہ ان کے لیے کون سی ترقی کا حصول ممکن ہوا ہے؟

بہرکیف اگر ہم باوجود کوشش کے اپنا قومی سرمایہ مستقبل یعنی نوجوانوں کو اس لعنت سے دور نہیں رکھ سکتے تو کم ازکم اس کی اصلاح کی بقدر استطاعت جدوجہد کی جانی چاہیے۔ مسلمان کے اہل فکر و نظر طبقہ پر لازم ہے کہ وہ انٹرنیٹ کی تعلیم حاصل کر کے اس میں موجود شرعی و اخلاقی قباحتوں اور برائیوں کو فی الفور ختم کرے۔ شاید یہ عمل ہی ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو اس گہرے کنویں میں گرنے سے بچا لے جس کی تہ میں سوائے مہلک کانٹوں اور زہریلے بچھوؤں کے اور کچھ نہیں۔

ہم نے اللہ کی نصرت و تائید سے علوم دنیوی میں مسلمانوں کے وافر عمل دخل کا کچھ ذکر کیا ہے، جس سے اس حقیقت کا ادراک آسان ہو جاتا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمان سائنسدانوں کا موجودہ سائنسی ترقی میں تحقیقی و تنقیدی کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے اور عصر حاضر کی بیشتر ترقی ان کی سائنسی کاوشوں کی مرہون منت ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی موجودہ علمی اور سائنسی کیفیت کا بھی اجمال سے مگر بغور جائزہ لیا جائے تاکہ تشنگی باقی نہ رہے۔

دور حاضر میں عالم اسلام کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت خاصی مایوس کن ہے، جس کا اندازہ ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۵۶ آزاد اور خود مختار اسلامی

ممالک کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا بیس فیصد (تقریباً سوا ارب) ہے۔ اس آبادی کا تقریباً چالیس فیصد حصہ اَن پڑھ ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں موجود یونیورسٹیوں کی تعداد تقریباً ۳۵۰ ہے، جن میں پنجاب یونیورسٹی (لاہور ۱۸۸۲ء) انڈونیشیا یونیورسٹی (جکارتہ ۱۹۵۰ء)، تہران یونیورسٹی (دانش گاہ، تہران ۱۸۵۱ء) جامعہ ملک سعود (ریاض ۲۱ ربیع الآخر ۱۳۷۷ء/ نومبر ۱۹۵۷ء) اور جامعۃ الازہر (قاہرہ، مصر ۹۷۰ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان یونیورسٹیوں سے سالانہ تقریباً ایک ہزار افراد پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ان اسلامی ممالک کی مجموعی افرادی قوت صرف ۸۰ لاکھ کے قریب ہے، جو ان شعبوں میں مصروف عمل عالمی آبادی کا تقریباً چار فیصد ہے۔ دنیا بھر میں ہر سال ایک لاکھ سے زائد سائنسی کتب اور ۲۰ لاکھ سے زائد سائنسی مقالات شائع ہوتے ہیں، جب کہ اسلامی ممالک سے شائع ہونے والی سائنسی اور تحقیقی کتب اور مقالات کی سالانہ تعداد ایک ہزار سے تجاوز نہیں کر سکی۔

یہ ان اسلامی ممالک کا مجموعی حال ہے، جن کی آزاد مملکتیں کرہ ارض کے تقریباً تین کروڑ مربع کلومیٹر پر محیط ہیں، جو تیل کے پوری دنیا میں موجودہ ذخائر کے تین چوتھائی حصے کے مالک ہیں اور جنہیں اپنے لامحدود بے شمار قدرتی وسائل سے استفادہ کی سہولت حاصل ہے۔ اس کے باوجود علوم جدیدہ میں مغرب سے مسابقت کے بجائے غفلت اور تساہل نے اسلامی ممالک کو ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ عوام الناس کے خیال میں عصری علوم کی تحصیل محض مادیت کی پرورش و نمو کا سبب ہے اور اس سے مفید امور کی انجام دہی ممکن نہیں۔ جب کہ ایسا نہیں، اسلام نے ان علوم کی درس و تدریس سے منع کیا ہے، جو کسی بھی پہلو سے اسلام کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوں جب کہ جو علوم نوع بشری کو حقیقی کامیابی سے ہمکنار کریں اور انہیں فطرت کے اسرار سے آگاہی عطا کریں، ان کی تحصیل اور تدریس تو اسلام میں پسندیدہ ہے۔ شاید اسی سوچ کا یہ ثمر ہے کہ اسلامی ممالک کی مجموعی قومی پیداوار ایک ہزار ایک سو پچاس ارب امریکی ڈالر ہے، جب کہ صرف جرمنی کی قومی پیداوار ۲ ہزار ۴ سو ارب ڈالر اور جاپان کی پانچ ہزار ایک سو ارب ڈالر ہے۔ مسلم ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق پر مجموعی طور پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے، صرف جرمنی اس سے دوگنا اور جاپان چار گنا زائد رقم خرچ کرتا ہے۔

عالمی تناظر سے ہٹ کر بالخصوص پاکستان میں اس وقت ۲۵ کے قریب یونیورسٹیاں ہیں جن میں اعلیٰ تعلیم کی [illegible]، انجینئرنگ کی ۸ اور ۳ زرعی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible]

اور آرٹس کے ۸۰۰ کالج ہیں، جن میں خواتین کے ۲۹۶ کالج بھی شامل ہیں۔ پرائمری اور مڈل سکولوں کی خاصی تعداد ہونے کے باوجود پاکستان کی ۵۹ فیصد (تقریباً آٹھ کروڑ) آبادی کبھی تعلیمی اداروں میں نہیں گئی۔ ایک حالیہ تحقیقی رپورٹ کے مطابق سوا کروڑ خواتین مکمل ناخواندہ ہیں۔ ریسرچ اور ڈویلپمنٹ سے منسلک سائنسدانوں کی تعداد امریکہ میں ساڑھے نو لاکھ سے زائد اور جاپان میں آٹھ لاکھ کے قریب ہے، جب کہ پاکستان میں صرف ۱۲ ہزار کے قریب ہے۔ یہاں سائنس کے مضامین میں ڈاکٹریٹ کرنے والوں کی تعداد سالانہ ۴۰، ۵۰ ہوتی ہے۔

پاکستان میں ناخواندگی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں انحطاط کا بنیادی سبب حکومتی سطح پر شعبہ تعلیم سے قیام پاکستان سے آج تک مسلسل بے توجہی ہے۔ پاکستان اپنی قومی پیداوار کا بمشکل ۲ فیصد (۲۱ ارب روپے) عام تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں قومی پیداوار کا ۵.۶ فیصد (۲۶،۷۹۴ ارب روپے) جاپان میں ۳.۶ فیصد (۹،۱۲۶ ارب روپے) جرمنی میں ۴.۸ فیصد (۳۱۴،ارب روپے) اور فرانس میں ۶.۱ فیصد (۹۶.۴ ارب روپے) تعلیم کے شعبے میں خرچ کیے جاتے ہیں۔

پاکستان میں ہر دس لاکھ آبادی میں ۴ ہزار، جاپان میں ۶۳۰۹، جرمنی میں ۳۸۴۳ اور فرانس میں ۲۵۸۴ سائنسدان ہیں۔ پاکستان پسماندہ ممالک کے مقابلے میں بھی بہت کم وسائل تعلیم پر صرف کر رہا ہے۔ ایران، ترکی اور ملائیشیا اپنے کل بجٹ کا ۲۰ فیصد، نیپال اور سری لنکا ۱۰ فیصد اور بنگلہ دیش ۱۷ فی صد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ پاکستان کے ۵۵ فیصد لڑکے اور ۷۵ فیصد لڑکیاں اَن پڑھ ہیں۔ بچوں کی کل آبادی کا صرف ۴۰ فیصد سکول جاتا ہے، جبکہ بھارت میں یہ شرح ۹۰ فیصد اور بنگلہ دیش میں ۸۷ فیصد ہے۔ ۱۹۹۸ء میں میاں نواز شریف نے قومی پیداوار کا ۳ فیصد ۱۹۹۹ء سے تعلیم کے لیے مختص کرنے کا اعلان کیا تھا، جس پر تاحال پرویز مشرف حکومت نے عمل نہیں کیا اور تعلیم پر اس وقت ۲ فیصد سالانہ کے قریب ہی خرچ ہو رہا ہے۔

بہرکیف، ایک ترقی پذیر اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندہ ملک ہونے کے باوجود پاکستان کی ایٹمی قوت میں خود کفالت ایک خوش آئند امر ہے۔ یہ اعزاز پوری اسلامی دنیا میں صرف پاکستان ہی کو حاصل ہے۔ ایٹمی شعبے میں بالخصوص اور دیگر سائنسی شعبوں میں بالعموم پاکستان اٹامک انرجی کمیشن (۱۹۵۵ء) پاکستان اکیڈمی آف سائنسز (۱۶ فروری ۱۹۵۳ء) اور پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (جو پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا اسلام آباد کے قریب واقع ایک ذیلی ادارہ ہے) مصروف کار ہیں۔ اگر ہم قومی سلامتی کے جملہ اُمور میں اغیار کی محتاجی چھوڑ کر اپنے بے شمار قدرتی وسائل سے استفادے کی صلاحیت حاصل کر لیں، تو کچھ عجب

نہیں کہ ہم عالم کفر کی درگری کے بجائے ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں۔

موجودہ دور میں اسلامی دنیا کی، جدید علوم میں کماحقہ دسترس اور مہارت کی عدم موجودگی نے مسلمانوں کو تقریباً ہر شعبہ زندگی میں ترقی یافتہ ممالک، جن کی اکثریت کفار پر مشتمل ہے، کا غلام بنا دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کی تہذیب وثقافت اور معیشت ومعاشرت کے رذیل اثرات نے عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم کر لیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی دنیا من حیث المجموع اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے کے لیے عصری علوم میں قرون اولیٰ کی طرح آج بھی پوری دنیا پر اپنی سیادت وبالا دستی قائم کرے اور یونیسکو وغیرہ کی علمی امداد ومعاونت سے مستغنی ہو کر اپنا مضبوط علمی بلاک تشکیل دے، جس میں دینی علوم کے احیا کے ساتھ عصری علوم کی، مسلم ماہرین کے زیر نگرانی از سر نو تدوین کی جائے، تاکہ مغربی ممالک پر کلی یا جزوی انحصار کے بجائے مسلمان خود دنیا کے جملہ شعبوں میں استیلا وغلبہ حاصل کر سکیں۔

آخر میں اس بات کی توضیح لازمی ہے کہ علوم جدیدہ کی تحصیل میں اسلام کے جملہ زریں احکام کی پیروی ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ اسی سے اسلام کے منشائے حقیقی کی صحیح تکمیل ہوگی، وگرنہ دین اسلام سے روگردانی کرتے ہوئے دنیوی علوم کی تحصیل کی نہ تو اسلام اجازت دیتا ہے اور نہ ایسے علوم انسانیت کے لیے حقیقی معنوں میں فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص مروجہ علوم میں تو تمام ڈگریاں لے جائے، مگر دین میں بالکل کورا ہو، ایسے شخص کے حاصل کردہ علم کی نہ اسلام میں کوئی اہمیت ہے اور نہ اس کے حاصل کرنے والے کے لیے کوئی گوشہ ہے، کیونکہ دینی تعلیمات سے دور اور شیطانی افکار سے قریب ہونے کا نتیجہ سوائے الحاد وبے دینی کے کچھ نہیں۔ درحقیقت دین اور دنیا میں توازن اور برابری ہی کا نام اسلام ہے۔ جہاں جابر بن حیان اور ابن الہیثم جیسے عظیم سائنسدان جنم لیں، وہاں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ایسے عظیم ائمہ دین بھی پیدا ہوں، تاکہ دنیوی مقاصد کی تکمیل کے ساتھ دینی روح بھی ضعف کا شکار نہ ہو جس کی تقویت اور مضبوطی ہر چیز سے مقدم ہے!!

مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں؟

عبدالمجید ساجد

ماضی میں مسلمان سائنس دانوں نے بڑی اہم خدمات سرانجام دی ہیں، مگر ہم ان کے کارناموں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ نتیجتاً مسلمان ممالک غیر مسلم ممالک کے دست نگر ہو کر رہ گئے، مسلمان ۱۹اس میدان میں غیر مسلم ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ ''مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں''؟ کے موضوع پر روزنامہ ''جنگ'' نے ایک ٹیلی فونک سروے کا اہتمام کیا جس کی رپورٹ روزنامہ ''جنگ'' کے شکریہ کے ساتھ نذر قارئین ہے۔

حافظ زوہیب طیب (ماڈل ٹاؤن، لاہور) نے کہا کہ مسلمان قرآنی تعلیمات سے ہدایت لے کر ایک اپنی، پاور ٹیکنالوجی بنائیں اور ایٹمی انرجی کے حوالے زیادہ سے زیادہ تعلیم دینے کا اہتمام کریں تا کہ ہم ٹیکنالوجی میں خودمختار ہوسکیں اور جب چاہیں اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں۔

نوید رفاقت احمد (ماڈل ٹاؤن، لاہور) نے بتایا کہ بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ ہر شعبے میں مسلمانوں کی ترقی میں خلل پیدا کرتی ہیں لہٰذا سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ ان چیزوں پر بھرپور توجہ دی جائے تو مسلم ممالک ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ لوگ منشیات کے کاروبار سے ہاتھ رنگ کر کالے دھن کے انبار ایسی مہارت سے جمع کرتے ہیں کہ انجام کار حکومت ہی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ مسلمان ممالک غیر مسلم ممالک پر انحصار کرنا چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بے پناہ صلاحیتوں اور قدرتی وسائل سے نواز رکھا ہے اب یہ مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ بجائے دوسرے ممالک سے مدد

مانگیں خود ان قدرتی وسائل کی جستجو میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اسی طرح مسلمان ممالک یورپین ممالک کے ساتھ تعلقات پر زور مت دیں۔ مسلمان ممالک اپنے ہی تعلقات کو مزید مستحکم بنائیں، اس سے ایک محبت کا جذبہ بڑھے گا دوسرا ان کی مشترکہ پالیسیاں قائم ہوں گی جو ٹیکنالوجی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرسکیں گی۔

مقصود احمد ساجد، بہاول نگر نے کہا کہ جدید سائنس کی رو سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن پاک میں فرمایا اس میں ہی سب راز پوشیدہ ہیں اور اسی سے ساری سائنس اخذ کی گئی ہے تو پھر مسلمان کیوں نہیں اس میدان میں ترقی کرتے؟ کون کہتا ہے کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنا غلط ہے، دراصل یہی تو وہ تعلیم ہے کہ جس کی بدولت آپ پوری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرا سکتے ہیں۔

زاہد ملک (فورٹ عباس) نے کہا کہ ہمیں دو باتیں اپنے سامنے رکھنی چاہئیں، ایسے افراد جو سائنس دان اور انجینئر ہوں اور ان کی تعلیم کے لیے حکومت یا کوئی ایسا نظام مواقع فراہم کرے۔ تجربات کے لیے پیسہ، سہولیات اور وسائل مہیا کرے۔ دور خلافت میں مسلمان پوری دنیا میں غالب تھے۔ نظام خلافت میں حکمران خود موقع فراہم کرتے تھے۔ آج ہم اسی صورت میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ سکتے ہیں کہ ملک میں نظام خلافت قائم ہو۔

زہرہ احمد صدیقی (ماڈل ٹاؤن، لاہور) نے کہا کہ ہم گروہوں اور فرقہ بندی کا شکار ہیں۔ مذہب کو صحیح طرح سے جانتے نہیں ہیں۔ اسلام تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں جب ہم اللہ کی ان نعمتوں کی قدر کریں گے، ہر میدان میں آگے بڑھیں گے۔

محمد ادریس کھوکھر (سیکرٹری فارمر ایسوسی ایشن پاکستان) نے کہا کہ دنیا میں اس وقت جو ممالک سائنس و ٹیکنالوجی میں آگے ہیں، ان میں ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، پی ایچ ڈی کریں، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے مسلمان ممالک میں آئیں اور اپنے اپنے ملک میں کام کریں۔ ہر شعبے میں تحقیقاتی ادارے قائم کیے جائیں۔ حکومت انفراسٹرکچر کا دائرہ وسیع کرے۔ علم کسی کی میراث نہیں ہے جو آگے بڑھ کر اسے حاصل کرے گا وہی دراصل کامیاب و کامران ہوگا۔

سعدیہ اسلم ملک (کیولری گراؤنڈ، کینٹ) نے کہا کہ یہ رجحان سکولوں کی سطح سے شروع کیا جائے، بچے کا خود سے رجحان سیٹ کیا جائے۔ بچہ کھلونا توڑے، کھولے اور جوڑے اس طرح بچے میں سائنس اور تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے میں عام طور پر زندگی گزارنے کا طریقہ سادہ ہو۔ فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے کے

بجائے اپنے خاص کام اور تحقیق کے لیے وقت صرف کیا جائے۔ اگر ہم آج والی نسل کو ہی سنواریں تو یہی ہماری کامیابی ہوگی۔ ہمیں بیٹھ کر کھانے کی عادت ہوگئی ہے اس لیے دیگر ممالک کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی سوئی اور گھڑی بھی خود نہیں بنا سکتے، ہم اسلام کی طرف راغب ہو جائیں، فرائض کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو عام کریں۔ خود ماڈل بنیں، حقیقتوں کو اجاگر کیا جائے، سادگی اختیار کی جائے۔ قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق بتا دیا تھا کہ یہ کیا ہے؟ دجال کیا ہے؟ سائنس آج بتا رہی ہے۔ ہمیں قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، تب ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

منیر احمد وقار (مغل پورہ، لاہور) نے کہا کہ مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ سکتے ہیں اگر وہ ٹیکنالوجی کی تھیوری اپنی زبان میں پیش کریں۔ تمام تر نصاب، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصہ شامل ہو۔ اساتذہ مشنری جذبے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے جذبے کے تحت پڑھائیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے کے بارے میں غیر زبانوں میں جو مواد موجود ہے اس کو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے۔ اس طرح ہم پاکستانی مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں اور ہماری مصنوعات صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ اقوام عالم کے ایک امتیاز کی حیثیت رکھیں۔

عماد احمد (گڑھی شاہو، لاہور) نے کہا کہ اگر ہم ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہماری حکومت مشترکہ فنڈ قائم کرے ایسے طلبہ جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، حکومت انہیں مواقع فراہم کرے، ان کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی ہر طریقے سے مدد کرے اس صورت میں مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر سکتے ہیں۔

دلبر حسین (والٹن لاہور) نے کہا اس کے لیے حکومت سائنس اور ٹیکنالوجی کے ادارے قائم کرے لوگوں کے اندر اس بارے میں شعور پیدا کیا جائے خصوصا دیہی علاقوں میں سائنس کی تعلیم مہنگی ہے اگر حکومت مفت تعلیم نہیں دے سکتی تو سستی ضرور کرے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں ضرور ترقی کریں مگر خدا پر بھروسہ اور توکل بھی ہونا چاہیے سب کچھ سائنس، ایٹم اور ٹیکنالوجی نہیں ہے۔ خدا پر ایمان بھی ضروری ہے۔

اعجاز احمد حفیظ (کینٹ) نے بتایا کہ مسلمان ممالک میں تحقیق کا کام شروع کیا جائے۔ مسلم ممالک میں تمام یونیورسٹیز کو انٹرلنک کر دیا جائے اور ان کے اندر ہونے والی ریسرچ کو ایک دوسرے تک پہنچایا جائے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں تعلیم والے استاد کی کوئی عزت نہیں ہے،

تعلیمی شعبے کو عزت کیسے حاصل ہو گی۔؟

راحیل رحمٰن (اقبال ٹاؤن، لاہور) نے کہا کہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ جب کوئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو مسلمان قیامت کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ قیامت اٹل ہے مگر ٹیکنالوجی اپنی جگہ ضروری ہے۔ مسلمان تبدیلی کو قبول کریں۔

ثاقب علی صدیقی (ٹاؤن شپ، لاہور) نے کہا کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے اسی لیے زوال کا شکار ہیں۔ قرآن پاک میں ہر قسم کا علم موجود ہے آج کے دور میں کفار نے قرآن مجید کی تحقیق کر کے سائنس کی ترقی کی جبکہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو سمجھنا چھوڑ دیا ہے اگر ماضی میں زدیکھا جائے تو مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے ترقی کی۔

ہماری چند بہترین کُتب
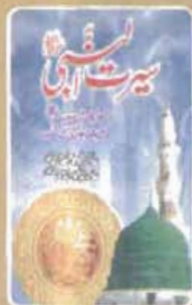
علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com